حجاب

کراچی

رمضان مبارک

فہرست

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

دفتر کا پتا: 81 چیمبر ہاؤس، ہاکی کلب آف پاکستان، اسٹیڈیم نزد آنچل پریس کراچی 75510
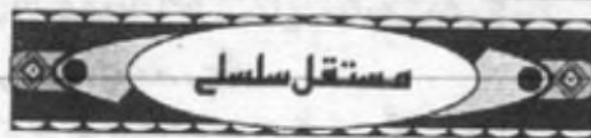
سرورق: ہادیہ

عکاسی: موسیٰ رضا

مستقل سلسلے

خط و کتابت کا پتہ: "آنچل" پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
03008264242 یکے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز۔ ای میل Info@naeyufaq.com

editorhijab@naeyufaq.com
www.facebook.com/EDITORAANCHAL

بات چیت

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اپریل 2021ء کا شمارہ آپ کے ذوق مطالعہ کی نذر ہے۔

عزیز قارئین زندگی کو بھرپور انداز سے وہی جیتے ہیں جن کے تعلقات رشتے داروں، دوستوں، پڑوسیوں کے ساتھ خوشگوار ہوتے ہیں۔ شاندار زندگی گزارنے کے لیے رشتوں کو سمجھنا اور ان کو نبھانا آنا چاہیے۔ سائنسی تحقیقات سے بھی یہ بات مکمل طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ رشتوں کی پائیداری کا دارومدار صرف ایک بات پر ہے اور وہ ہے "شکر گزاری" جن میں شکر گزاری کا عنصر موجود ہو، ایسے لوگ ہمیشہ دوستی، محبت، اپنائیت، سکون اور قربانی کے جذبات سے مزین ہوتے ہیں اور جس گھر میں محبت ہوتی ہے وہاں عزت، دولت اور کامیابی خوشی خوشی رہنا پسند کرتے ہیں۔ الحمدللہ ماہنامہ حجاب میں شائع ہونے والی کہانیاں ان ہی امور کا احاطہ کرتی ہیں اور معاشرے میں مثبت کردار ادا کرتی ہیں۔

ماہ رمضان کی رحمتیں اور برکتیں ایک بار پھر ہم پر سایہ فگن ہیں۔ اس ایک مہینے کی عبادت گویا ہماری تربیت کے لیے ہیں کہ ہم اپنے دین کی طرف راغب ہوں اور اپنی پوری زندگی سنوار لیں۔ ماہ رمضان نیکیوں کا موسم بہار بھی ہے۔ صرف رمضان میں ہی نہیں ہمیں تاحیات نیک کام کرنے چاہئیں اور سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ دوسروں کا احساس کریں، ان کے کام آئیں۔

۲۱ اپریل شاعر مشرق حکیم الامت علامہ اقبال کا یوم وفات ہے ان کا یہ شعر ہمیں دعوت فکر دیتا ہے۔

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

ماہنامہ حجاب تیاری کے آخری مراحل میں تھا کہ افسوسناک خبروں نے دل کو جکڑ لیا۔ وطن عزیز کی دو نامور خواتین خالق حقیقی سے جا ملیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ o

پاکستان ٹیلی ویژن کی پہلی اناؤنسر، ممتاز براڈ کاسٹر، ڈراما آرٹسٹ اور صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی کا اعزاز پانے والی محترمہ کنول نصیر ہم سے بچھڑ گئیں اور پھر ۹ گھنٹے بعد ہی دوسری خبر نے بھی دل افسردہ کر دیا کہ مقبول ناول نگار، ڈراما نگار حسینہ معین بھی دل کا دورہ پڑنے سے وفات پا گئیں۔ محبت و مسکراہٹ کے قصے سنانے والی اردو کی بلبل ہزار داستان ہم سے رخصت ہو گئیں۔ شہزوری، انکل عرفی، تنہائیاں، ان کہی، زیر زبر پیش، دھوپ کنارے جیسے شاندار ڈرامے اور کردار تخلیق کرنے پر انہیں متعدد ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ جہاں حسینہ معین کی وفات اردو ڈراموں کے ایک روشن ترین عہد کا خاتمہ ہے وہیں پاکستان میں ٹی وی اور ریڈیو کی جب بھی تاریخ لکھی جائے گی کنول نصیر کا نام زندہ رہے گا۔

اپنے اردگرد کے لوگوں کا خیال رکھیں اور کرونا جیسے موذی مرض سے بچیں، احتیاط کا دامن تھام لیں تو زندگی آسان ہو جائے گی۔ دعاؤں میں یاد رکھیں۔

بہنیں نوٹ کر لیں کہ اگلا شمارہ عید نمبر ہوگا، آپ سب جلد از جلد اپنی کہانیاں اور نگارشات ارسال کر دیں تاکہ بروقت ہمیں مل جائیں اور آپ کی شرکت ممکن ہو سکے۔

اس ماہ کے ستارے:۔

نزہت جبین ضیاء، نظیر فاطمہ، صائمہ شیر علی، مدیحہ کنول سرور، اُم خدیجہ، مسکان نور، بینش مجید ملک، انعم توصیف۔

دعا گو

مدیرہ

سعیدہ نثار

حمد

کُن کے معجزے جو روزِ ازل سے رہے ہیں
اس لفظ کُن کے چشمے ہر سو ابل رہے ہیں
ہوتے ہوئے ترے ہم دیکھیں ادھر ادھر کیوں
تیری عنایتوں سے سب کام چل رہے ہیں
رکتا نہیں ہے کوئی اِک کام بھی ہمارا
ہم نام تیرا لے کر گھر سے نکل رہے ہیں
پورے وہ ہو رہے ہیں رحمت سے تیری مالک
جو خلق کے دلوں میں ارماں مچل رہے ہیں
وہ موسمِ خزاں ہو یا موسمِ بہاراں
تیرے کرم سے کیا کیا موسم بدل رہے ہیں
تہذیب تا ابد ہے اللہ کی حکمرانی
وہ آج سب کہاں ہیں جو شاہ کل رہے ہیں

نعت

بس اک عشقِ نبی ﷺ ہے اور میں ہوں
انہیں سے لَو لگی ہے اور میں ہوں
ٹھکانہ ہی نہیں خوشیوں کا کوئی
کلی دل کی کھلی ہے اور میں ہوں
کرم ان کا مسلسل ہو رہا ہے
مزے میں زندگی ہے اور میں ہوں
خطائیں ہیں کہ ڈھلتی جا رہی ہیں
اِک اشکوں کی جھڑی ہے اور میں ہوں
اسے کہتے ہیں معراجِ مقدر
کہ آقا ﷺ کی گلی ہے اور میں ہوں
ترستا ہوں زیارت کے شرف کو
تمنائے دل ہے اور میں ہوں
گدا تہذیب ہوں آقا ﷺ کے در کا
مرا سب کچھ یہی ہے اور میں ہوں

(راؤ تہذیب حسین تہذیب)

انٹرویو

بنفش صالحین

انٹرویو: عمران قاضی

آج میں جس نام ور شخصیت کا انٹرویو کرنے جا رہی ہوں وہ آواز کی دنیا کی ایک مقبول شخصیت ہیں۔

اس فیلڈ سے وہی لوگ وابستہ ہوتے ہیں جن کو بولنے کا سلیقہ ہو اور جن کی آواز بھی خوب صورت ہو۔

آج کی ہماری شخصیت ہیں عمران قاضی۔ ہم انہیں ایف ایم ریڈیو کے مختلف چینلز سے سنتے آ رہے ہیں۔

س۔ سر کیسے ہیں آپ؟

ج۔ جی اللہ کا شکر ہے۔

س۔ کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟

ج۔ میں 1978 میں پیدا ہوا اور میری فیملی میں ایک بھائی اور ایک بہن ہیں میں سب سے چھوٹا ہوں۔ اپنی تعلیم مکمل کر کے ہری پور ٹیلی کام میں جاب شروع کی۔

س۔ ریڈیو آپ کا شوق ہے یا کمانے کا ذریعہ؟

ج۔ ریڈیو میرا پیشن ہے اور میں اپنی مصروفیات میں سے اس کے لیے ٹائم نکال لیتا ہوں۔

س۔ آپ کی تعلیم کیا ہے؟

ج۔ ایڈمنسٹریشن بزنس ان ماسٹر۔

س۔ آپ کا اسٹار کیا ہے؟

ج۔ میرا اسٹار ورگو ہے۔

س۔ اس فیلڈ میں کیسے آئے؟

ج۔ کچھ اچھے اور عمدہ بولنے والے لوگوں سے متاثر ہو کر آیا سرفہرست رابعہ ہیں جن کو سن کر بہت کچھ سیکھا بھی۔

س۔ زندگی کا کوئی حادثہ جو اب تک یاد ہو؟

ج۔ جی بچپن کا واقعہ جب ہماری نئی گاڑی چوری ہوئی۔ آج بھی یاد ہے۔

س۔ فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟

ج۔ مجھے سائیکل چلانے کا بہت شوق ہے اور میں جب بھی فارغ ہوتا ہوں تو سائیکلنگ کرتا ہوں۔

س۔ لائیو پروگرام میں کوئی غلطی ہوئی؟

ج۔ جی بہت بار...... چھوٹی موٹی تو ہو ہی جاتی ہیں۔ اگر بڑی ہو جائے تو معذرت کر لیتا ہوں اور اپنی غلطی کو درست کر لیتا ہوں۔

س۔ آپ کا مزاج کیسا ہے؟

ج۔ نرم مزاج ہوں اور میرا رویہ سب کے ساتھ دوستانہ ہوتا ہے۔ اس فیلڈ میں آنے سے پہلے سخت مزاج تھا لیکن اب کافی نرم طبیعت کا انسان ہوں۔

س۔ شہرت نے شخصیت پر کیا اثر ڈالا؟

ج۔ بہت اچھا لگتا ہے۔ لوگ پہچان لیتے ہیں کہ آپ ریڈیو والے عمران ہیں اور زیادہ خوشی تب ہوتی ہے جب میرے حوالے سے میرے والدین کو لوگ جانتے ہیں۔

س۔ کھانے کے کتنے شوقین ہیں آپ؟

ج۔ بہت زیادہ۔ (ہنستے ہوئے) اکثر وہ چیزیں بھی کھا لیتا ہوں جن سے ڈاکٹر نے منع کیا ہو۔

س۔ اپنے کیریئر کا آغاز کب کیا؟

ج۔ 1999ء میں اس فیلڈ میں آیا پھر ٹیلی کام میں جاب شروع کی اور اس کے ساتھ ساتھ پڑھائی بھی جاری رکھی۔

س۔ رومانٹک مزاج ہیں آپ؟

ج۔ جی...... پر اتنا نہیں...... حقیقت پسند ہوں۔

س۔ کس مزاج کے لوگ پسند ہیں؟

ج۔ نرم دل، سادہ، سچے اور مخلص لوگ اور اچھا بولنے والے بھی۔

س۔ کھیلوں سے کتنی دلچسپی رکھتے ہیں آپ؟

ج۔ نہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ ہماری کرکٹ ٹیم کا کپتان کون ہے۔

س۔ ملک کے حالات کے بارے میں کیا کہیں گے؟

ج۔ حالات بہتر ہوتے جا رہے ہیں اور مزید اچھے ہوں گے، ان شاء اللہ۔

س۔ کیا لوگ آپ کو آپ کی آواز سے پہچان لیتے ہیں؟

ج۔ جی اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پہچان لیتے ہیں۔

س۔ ریڈیو کے کس کس چینلز سے پروگرام کرتے ہیں؟

ج۔ میں مانسہرہ سے 91.4، ہری پور سے 88.6 اور ریڈیو پاکستان ایبٹ آباد 99.3 سے پروگرام کرتا ہوں۔

س۔ اگر کوئی دوست روٹھ جائے تو کیسے مناتے ہیں؟

ج۔ بہت کم ناراض ہوتے ہیں۔

س۔ کوئی بات جو روحانیت سے جوڑتی ہو؟

ج۔ جی اکثر سوچتا ہوں کہ ہم سب کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔

بنفش صالحین...... ہری پور ہزارہ

خواتین کا عالمی دن

سیمارضا

مسائل کا جگر سے سامنا کرنا ضروری ہے
فقط سینے سجا لینے سے حاصل کچھ نہیں ہوتا

خواتین کے عالمی دن کے حوالے سے الخدمت فاؤنڈیشن ویمن ونگ ٹرسٹ پاکستان کے زیراہتمام فورم ”خواتین کے مسائل اوران کا حل خصوصی سیمینار کا انعقاد کیا گیا“ فورم میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی خواتین نے اظہار خیال کیا۔ اس موقع پر عالیہ صارم برنی برنی ٹرسٹ کی ڈائریکٹر اور سوشل ورکر، اینکر پرسن عظمی عبدالکریم، افسانہ نگار، مدیرہ اور ریڈیو براڈ کاسٹر سیما رضا، ڈپٹی سیکرٹری جنرل جماعت اسلامی حلقہ خواتین محترمہ آمنہ عثمان، سوشل میڈیا ایکٹیوسٹ عالیہ منصور، ڈپٹی کنٹرولر شگفتہ آفتاب، ڈاکٹر شہناز، کوثم یونیورسٹی کی پرنسپل سمعیہ عبدالہادی، چیئر پرسن نویدہ الخدمت سائیکلوجسٹ لاریب جنت سعد، زرافشاں فرحین اور شیریں ارشد موجود تھیں۔

جنرل مینیجر الخدمت شعبہ فاؤنڈیشن زرافشاں نے فورم کا آغاز کرتے ہوئے کہا عورت کا تقدس، وقار و مرتبہ محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیوں قبل طے کردیا ہے اور آج بھی خواتین کے مسائل کا حل اسی نظام میں موجود ہے جو آنحضور ﷺ نے دیا۔ ویمن ونگ ٹرسٹ پاکستان کے زیراہتمام یتیم بچے بچیوں اور ان کی باہمت ماؤں کی دینی دنیاوی تعلیم و تربیت کے بہترین مواقع فراہم کیے جاتے ہیں اور ان میں قرآن فہمی کے لیکچرز، تکنیکی مہارت میں نکھار کے لیے ورکشاپس کا انعقاد کیا جاتا ہے ووکیشنل سینٹرز میں سلائی کڑھائی دستکاری آرٹ اینڈ کرافٹ کے کورسز کوکنگ، بیکنگ، خطاطی اور فن خطابت کی عملی مشق کروائی جاتی ہے تاکہ زندگی کے کسی بھی میدان میں یہ خواتین باعزت طریقے سے اپنا موثر کردار ادا کرسکیں۔ امسال تعلیم کے میدان میں الفلاح اسکالر شپ اسکیم کے تحت مستحق طالبات کی اعلیٰ تعلیم کے لیے وضائف کا اجرا بھی کیا گیا ہے تاکہ وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول سے ہرگز محروم نہ رہیں۔ علاوہ ازیں مواخات پراجیکٹ خود کفالت کے نظام کا فقید المثال پراجیکٹ ہے جو

موجودہ حالات میں خصوصاً کرونا کے بعد سے بیروزگاری دور کرنے میں مددگار ثابت ہوا ہے۔

چیئر پرسن الخدمت فاؤنڈیشن ویمن ونگ ٹرسٹ پاکستان نویدہ انیس نے کہا کہ خدمت خلق مقدس جذبہ ہے یہ دل کا سودا ہے جو رضا کارانہ طور پر کیا جاتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں خواتین کی خدمت ہمارا نصب العین ہے۔ اپنے محدود وسائل کے باوجود خواتین کے لیے صحت، تعلیم، سماجی خدمات، صاف پانی کی فراہمی، یتیموں کی کفالت اور ہنگامی آفات میں امداد کے علاوہ نادار خواتین کے لیے روزگار کی فراہمی ممکن بنانے کے لیے سرگرم عمل ہے۔ ملک کے طول و ارض ہی میں نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی اس حوالے سے ان شعبوں کی خدمت کے لیے کوشاں ہے جس کا بین ثبوت بنی گالہ اسلام آباد، دیر، شیخوپورہ اور ترکی میں الخدمت کے تعاون سے آغوش سینٹر ہیں۔

عالیہ صارم برنی نے ایک سوال کے جواب میں عورت مارچ کی مذمت کرتے ہوئے کہا عورت کا تقدس و مرتبہ محسن انسانیت نے صدیوں قبل طے کر دیا تھا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ خواتین و مرد اپنے حقوق و فرائض کی بجا آوری اور خاندان کی مضبوطی کے لئے اپنا کردار ادا کریں۔ عورت ماں ہے نسل نو کی معمار، اپنی اخلاقی و مشرقی اقدار کی پاسداری کرتے ہوئے حکومتی سطح پر بھی ہر شعبے میں خواتین کے بنیادی حقوق کی فراہمی ممکن بنانا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ ہمارے ٹرسٹ میں بے سہارا خواتین کی کثیر تعداد ہے جو بنیادی انسانی حقوق سے بھی محروم ہیں۔

سائیکلوجسٹ لاریب نے کہا ماں کی بہت بڑی ذمہ داری ہے کیونکہ آج کی نوجوان نسل فرسٹریشن کا شکار اور تنہائی سے گھبرا کر باہر دوستیاں تب ہی کرتی ہے جب گھر سے وقت نہ ملے۔

ڈاکٹر شہناز کوثم یونیورسٹی کی پرنسپل سمعیہ عبدالہادی نے کہا کہ تعلیمی اداروں کو نوجوانوں کے لیے خاص طور پر تعمیری سرگرمیاں کرانی چاہیے جوان کی ذہن سازی اور کردار سازی میں کلی کردار ادا کرے۔

شگفتہ آفتاب نے کہا معاشرے کو اعلیٰ مقاصد و بہترین نصب العین کی طرف لانے کے لیے میڈیا کا کردار بہت اہم ہے۔ ڈراموں میں دیے گئے پیغامات، انداز گفتگو، چال ڈھال اطوار سب کچھ عوام کی سوچوں پر قابض ہو کر اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں موجودہ دور میں منتشر خیالی میں مبتلا عوام کو صحیح رخ دکھانے کی ضرورت ہے۔

سیما رضا نے کہا حقائق کا درست تجزیہ کر کے عوام خصوصاً نسل نو کو گم گشتہ ماضی اور عظیم الشان اسلامی اقدار روایات سے جوڑنا ہم سب کا فرض ہے۔ اس ضمن میں والدین، خاندان، تعلیمی ادارے، معاشرتی ماحول کو اپنا خصوصی کردار ادا کرنا ہوگا۔ اس کے برعکس پرنٹ میڈیا میں ڈائجسٹ کے مواد میں اصلاحی کہانیاں اولیت رکھتی ہیں۔

محترمہ آمنہ عثمان ڈپٹی سیکرٹری جنرل جماعت اسلامی حلقہ خواتین نے کہا کہ خاندان ایک نعمت ہے۔ خصوصاً عورت کے لیے ایک حصار ہے جو اس کو زمانے کے سرد و گرم سے محفوظ رکھتا ہے۔ اسلام نے عورت کو خاندان کی صورت میں بہترین پناہ گاہ دی ہے۔ ہمارا فورم خواتین کے لیے سرگرم عمل ہے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں خواتین کے حقوق فلاح و بہبود کے لیے سارا سال مختلف فلاحی کام کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ بعد ازاں وومن فورم میں شرکت کرنے والی خواتین میں شیلڈ اور تحائف پیش کئے گئے۔

مجھے اپنی شناسائی کی وہ منزل ملی رضیہ
جہاں پر آئینہ میرے مقابل کچھ نہیں ہوتا

بشکریہ تحریر: عالیہ شمیم (صدر حریم ادب پاکستان)

تیسرا حصہ

محبت ماہ تمام

صائمہ قریشی

ایان اور فرحان کے لیے اس وقت سب کچھ سنبھالنا بہت مشکل ہو رہا تھا، ایک بار پھر انہیں ارمان کی کمی کا شدت سے احساس ہونے لگا، اگر ارمان ہوتا تو انہیں کبھی بھی ان مشکلات کا سامنا نہ کرنے دیتا، اپنی اولاد کو ایک نئے امتحان میں دھکیل کر سلیمہ بیگم وہاں سے جا چکی تھیں یہ بھی نہ سوچا کہ اس کٹھن وقت میں ان سب کو بھی ایک سہارے کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ ایان کی بوکھلاہٹ اور فرحان کی گھبراہٹ میں اگر کوئی ان کا ساتھ دے رہا تھا تو صرف امینہ تھی، فوزیہ کے بے بنیاد مشوروں اور سپاٹ انداز پر اس کے ساتھ تلخ کلامی سے بچنے کے لیے امینہ نے فوزیہ کو سلیمہ بیگم کو سنبھالنے کا کہہ کر اسے ان کی طرف بھیج دیا تھا۔

مختیار اختر بھی اس پل بے بس نظر آ رہے تھے، ارمان اور امل کی موت نے مہینوں بعد ایک بار پھر اس گھر میں صف ماتم بچھا دی تھی، ریان کی ایک بار پھر غیر ہوتی حالت نے ایان اور فرحان کی ساری ہمت کو چکنا چور کر دیا تھا، ریان کی ذات اس ایکسیڈینٹ میں اپنے نقصان پر ایسے بکھری تھی جیسے اس اندوہناک خبر پر کہ ارمان اور امل سے اب وہ کبھی مل نہیں سکے گا اس کا وجود کرچی کرچی ہو گیا تھا اور پھر رہی سہی کسر سلیمہ بیگم کے الزامات نے پوری کر دی تھی۔ اس کی طبیعت ایک بار پھر بگڑ گئی تھی، ریان کی بگڑتی حالت کے پیش نظر ایان کو فوراً ایمبولینس بلوانی پڑی۔

ریان۔ کے اعصاب ایک بار پھر اس کا ساتھ چھوڑنے لگے تھے، اس میں اتنی سکت بھی نہ تھی کہ وہ ارمان اور امل کی جدائی کی خبر کو جھٹلا کر انہیں کھوجنے لگتا، نہ ہی ریان میں اتنی ہمت باقی رہی تھی کہ سلیمہ بیگم کے الزام کا کوئی جواب دے سکتا۔ ڈاکٹرز نے ایک بار پھر انہیں ہدایت دی تھی کہ ریان

کو کسی قسم کی ذہنی اذیت نہ دی جائے، اسے آرام کا کہہ کر ایمبولینس روانہ ہو چکی تھی، ریان کی آنکھیں بند تھیں لیکن اس کے چہرے پر ایسی اذیت تھی کہ اس کی طرف نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

''ریان ہمیں خود کو سنبھالنا ہوگا۔'' اینہ اور ایان دونوں ریان کے پاس آ کر بیٹھے اور ریان کے ٹھنڈے ہوتے ہاتھوں کو پکڑ کر ایان نے دل سوز لہجے میں کہا۔

''ارمان اور امل کی جدائی نے ہم سب کو توڑ کر رکھ دیا ہے میرے بھائی، اب بھی ایسے ہی لگتا ہے کہ ارمان اور امل مسکراتے ہوئے آئیں گے اور کہیں گے ہم تو چھپن چھپائی کھیل رہے تھے، امل ہمیشہ کی طرح تم سے، مجھ سے اور اینہ سے روٹھنے لگے گی کہ ہم اسے ڈھونڈ نہ سکے۔'' ایان رنجیدہ آواز میں ریان کا ہاتھ پکڑے اس کے پاس بیٹھے بات کر رہا تھا، اینہ اس کے ساتھ کھڑی ایان کے کندھے پر ہاتھ رکھے اس کو حوصلہ تو دے رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ ریان نے آنکھیں کھولیں، باری باری دونوں کو دیکھا۔

''بھائی اور بجو مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ وہ جانتے ہیں میں ان دونوں کے بغیر نہیں رہ سکتا پھر وہ کیسے میرے ساتھ ایسا کر سکتے ہیں، آپ سب جھوٹ بول رہے ہیں، ایان بھائی آپ جھوٹ بول رہے ہیں ناں؟ ارمان بھائی اور بجو کسی ایسی جگہ نہیں گئے ہیں ناں جہاں سے واپس نہ آسکیں؟'' ریان چلانے لگا، ایان کے ہاتھ پکڑ کر ہذیانی انداز میں ان سے پوچھ رہا تھا، ایان نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں جکڑتے ہوئے ان پر پیشانی ٹکائی اور زار و قطار رونے لگا، اینہ بے تحاشا آنسو بہاتی ایان کو تسلیاں دینے لگی۔

''اللہ کی قسم ریان میرا جی چاہتا ہے کہ میں کہیں بہت دور چلا جاؤں ایسی کسی جگہ جہاں اس سچائی کا کوئی نام و نشان تک نہ ہو۔ جہاں میں سب کی باتوں کو جھٹلا کر ان کا گریبان پکڑ کر کہوں کہ خبردار اگر کسی نے ہم چاروں بھائیوں کو جدا کرنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا لیکن میرے بھائی میں کیا کروں، کہاں جاؤں؟ ایسی کوئی جگہ نہیں اور جب جانے والے کو روک لینے کا اختیار ہمارے پاس ہے ہی نہیں تو ہم سوائے آنسو بہا کر صبر کرنے کے سوا اور کر کیا سکتے ہیں؟''

''نہیں...... نہیں...... نہیں...... ارمان بھائی نہیں......'' ریان اس کے دونوں ہاتھ سے اپنے ہاتھ چھڑاتے ہوئے چلانے لگا۔

''سنو میری بات ریان۔'' ایان نے بہت سختی سے اسے روکا۔ ریان اسی طرح روتے ہوئے ایان کے ہاتھ جھٹکنے کی کوشش کرتا رہا۔ آنسو اس کے وجود کو بھگو رہے تھے۔

''ریان......'' ایان زور سے چلایا تو ریان نے بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ایان کو دیکھا۔

''سنو میری بات۔'' اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں ریان کا چہرہ لیتے ہوئے ایان نے بہتے آنسوؤں کے ساتھ اسے مخاطب کیا۔

''ہمارا بھائی بہت دور چلا گیا ہے، تمہیں کیا لگتا ہے تم نہیں تھے تو میں نے، فرحان یا کسی اور نے اسے جانے سے روکا نہیں ہوگا؟ روکا...... بہت روکا لیکن میرے بھائی اللہ کی یہی مرضی تھی اور ہم اللہ کی رضا کے آگے بے بس ہیں، اس کے فیصلوں کے آگے ہمیں سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔'' ایان بہتے آنسوؤں کے ساتھ ریان کی بھیگی آنکھوں کو اپنی طرف دیکھتا پا کر بولا۔ اینہ ان دونوں کے پاس بیٹھی خاموشی سے رو رہی تھی۔

''تم جانتے ہو ریان میں تمہارا انتظار کر رہا تھا، تمہارے سوا کوئی اس دکھ کی شدت کو سمجھ ہی نہیں سکے گا۔ ارمان، ہمارا بھائی نہیں وہ چھاؤں تھا جس نے کبھی ہمیں کسی کڑی دھوپ کا سامنا ہی نہیں کرنے دیا تھا۔ میں ارمان کے جانے کے آنسو تمہارے ساتھ، تمہارے گلے لگ کر بہانا چاہتا تھا۔'' ایان کی باتوں پر اینہ بے اختیار اونچی آواز میں رونے لگی۔ دونوں نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور ارمان کے جانے کے مہینوں بعد آج ایان بھی پہلی بار

پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔

۲۲ اگست ۲۰۱۳
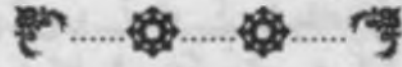
پیارے دوست

میں جانتی ہوں کہ جب کوئی ہمارے خلوص کو ہماری خودغرضی سمجھے تو کتنا دکھ ہوتا ہے، میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم خودغرض نہیں ہو، تم ایسے نہیں ہو جیسے تمہیں تمہارے اپنے سمجھتے ہیں، تمہارا ہونا بے معنی نہیں ہے۔ دیکھو دوست کوئی ماں اپنی اولاد کا برا نہیں چاہ سکتی ہے، کوئی باپ اپنی اولاد کو پریشان نہیں کرسکتا، اگر امی تمہیں کوئی بات کہتی ہیں تو وہ تمہاری بھلائی کے لیے ہوتی ہے، اگر ابو تمہیں کچھ کہتے ہیں تو اسی میں تمہاری بہتری ہوتی ہے، تم اب اپنے پیروں پر کھڑے ہو تم امی سے دوستی کرو ان کا سہارا بنو، چھوٹے چھوٹے کاموں میں امی کا ہاتھ بٹایا کرو، اپنی چھوٹی چھوٹی پریشانیاں امی سے کہا کرو، ایسے تو نہیں کرتے نا یوں اداس ہوگے، منفی سوچیں ہی سوچتے رہو گے تو کبھی اپنے اندر وہ اعتماد نہیں پیدا کرسکو گے جو تمہیں معاشرے میں ایک مقام دے گا اور جو بات مجھے پریشان کرتی ہے کہ تم زیادہ سوچتے رہو گے تو چہرے کے اعصاب تنے ہوئے لگیں گے پھر جب ہنسو گے تو جھریاں پڑ جائیں گی اور جھریاں پڑ گئیں تو جوانی میں بڑھاپے کی دہلیز پار کر جاؤ گے اور جوانی میں ہی بوڑھے ہوگے تو میرا کیا ہوگا کالیا؟ تو اپنے آپ پر نہ سہی اپنی اس دوست جان پر ہی کچھ رحم کرو۔ وقتاً فوقتاً مسکراتے رہا کرو کہ جلدی بوڑھے نہ ہو۔

پتا کیا کرنا؟ ان دنوں خزاں کا موسم ہے تو ایک انتہائی خزاں رسیدہ درخت دیکھنا، کوئی ایک درخت جسے تم روز دیکھ سکتے ہو، جس پر ایک پتا بھی نہ ہو، جب تم اسے دیکھو گے تو تمہیں لگے گا اس پر نہ تو کبھی بہار آئی نہ آئے گی، اچانک ایک سوچ ذہن میں آئے گی کیا کبھی اس خزاں رسیدہ درخت پر بھی کوئی کونپل پھوٹے گی؟ تمہارا ذہن، تمہارا دل، موسم اور تمہارے ادر گرد پھیلی مایوسی تمہیں بہکائے گی کہ نہیں، ایسی سوکھی ٹہنیوں پر کیسے کوئی پھول کھل سکتا ہے؟ پھر چند ماہ بعد جب موسم بدلے گا، بہار آئے گی تو اسی درخت کی ان سوکھی ٹہنیوں پر کونپلیں پھوٹنے لگیں گی، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ خزاں کے بعد بہار نہ آئے، ہمارے اللہ جی نے ہر ایک چیز کی ایک مدت مقرر کر رکھی ہے، تم دیکھنا بہار آئے گی تو کیسے وہی سوکھا ہوا درخت ہرا بھرا ہو جائے گا، تب تم سوچو گے کہ کیا یہ وہی درخت ہے جس پر کبھی خزاں تھی، کوئی امید نہیں تھی کہ اس پر کوئی بہار آئے گی، تم جانتے ہو ناں دوست کہ جیسے ہر زوال کو عروج آتا ہے اسی طرح زوال بھی اپنی مدت پوری کر کے عروج کی دہلیز تک پہنچ جاتا ہے۔ بس ہمت اور مثبت سوچوں کی حدوں سے کبھی پیچھے مت ہٹنا۔

میں جانتی ہوں تمہاری بہت ساری ای میل میرے ان باکس میں میرا رستہ دیکھ رہی ہیں، لیکن یہ ای میل اس میسج کا جواب ہے جس میں تم نے اپنی اداسیوں کی داستان کو محض ۱۶۵ حروف میں بتانے کی کوشش کی اور مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ تم موبائل بیلنس کے معاملے میں اتنے غریب ہو چکے ہو کہ ۱۶۵ حروف کی حد کو پار نہیں کر سکتے (ہنسی) تو اسی لیے میں نے سوچا ای میل میں تمہیں ساری باتیں کہہ دوں جو تمہیں مسکرانے پر مجبور کریں اور یقین دلا سکیں کہ تم کسی اور کے لیے ہونا ہوا اپنی دوست جان کے لیے ہمیشہ خاص ہو اور رہو گے۔ اس وقت میں کچھ مصروف ہوں تو باقی ای میلز کا جواب بعد میں دیتی ہوں۔

تم اپنا خیال رکھنا۔

اللہ حافظ۔

تمہاری دوست جان سوما۔

۲۷ اگست ۲۰۱۳
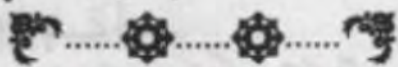
سوما میری دوست جان

کیسی ہو تم، کہاں غائب ہو؟ میں نے کتنی ہی ای میل بھیجی لیکن میڈم ہیں کہ پوری طرح موبائل کی ہو کر رہ گئی ہیں۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ اب بندہ اتنے محدود الفاظ کی حد سے نکل چکا ہے (ہلکی سی شریر مسکان) اور طویل ترین

نتظار کے بعد جب ای میل کا جواب ملا تو وہ بھی وہی وعظ
سا۔ کبھی تو دل کی بات بھی کیا کرو، کبھی تو جذبوں کو بھی سمجھا
کرو، کبھی تو میرے بارے میں بھی سوچا کرو۔ ہر وقت کی
صیحتیں اور لیکچر مجھے اب بور کرنے لگے ہیں۔ اس سب
کے لیے میرے گھر والے کافی ہیں۔ اب تم بھی کیا گھر
الوں کے جیسا کردار ادا کرو گی؟ میں جانتا ہوں اب تم
کمپیوٹر کی اسکرین پر آنکھیں پھاڑے میرے ان الفاظ پر
حیران ہو رہی ہوگی، کوئی شک نہیں کہ اس وقت میری ذہنی
حالت کو بھی تم نے شکوک وشبہات میں مبتلا کر کے ’پاگل‘ کا
سرٹیفکیٹ بھی جاری کر دیا ہوگا لیکن جو سچ ہے وہی کہوں
گا۔ میں تو عادی ہوں ان سب رویوں کا لیکن خدارا مجھے
ان لیکچرز کا عادی مت کرنا۔

خیر تم نے جو کہا میں نے تمہارے پلو سے باندھ کر پلو
کا کونا پکڑ لیا ہے، اب نا تم کہیں جا سکتی ہو نا پلو چھڑا سکتی
ہو۔ جب تم کہیں جاؤ گی کہیں تو مجھے کسی خزاں رسیدہ
درخت کو دیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟

ایک بات کہوں؟ دعا کرنا میرے حالات کچھ ٹھیک ہو
جائیں پھر میں گھر میں تمہارا ذکر کروں گا۔ مجھے لگتا ہے کہ
اب وہ وقت آ گیا ہے کہ تم اب میرے پاس بھی ہو تا کہ
میں وقت بے وقت کی پریشانیوں کا مقابلہ مسکرا کر کر سکوں
اور ہاں تم نے ٹھیک سمجھا وہ دراصل موبائل بیلنس ہی ختم
ہو گیا تھا، بس اتنا ہی بیلنس تھا کہ ایک میسج کیا جا سکتا تھا اسی
لیے تو میں نے ہر ایک لفظ کو جتنا مختصر کر سکتا تھا کیا (ہنسی)
مجھے اسی لیے ای میل میں بات کرنا زیادہ اچھا لگتا ہے، دل
کی ہر ایک بات جتنی مرضی تفصیل سے کہوں یہ ڈر نہیں ہوتا
کہ جگہ کم پڑ جائے گی۔

خیر...... میں ایک بار پھر کہوں گا کہ تم نا ہوتی تو میں امی
اور ابو کی باتوں پر ان سے بہت نفرت کر چکا ہوتا۔ تم نے
مجھے ان باتوں کا ایک دوسرا رخ دکھایا۔ اسی لیے میری
خواہش ہے کہ تم میرے ساتھ رہو۔ میں نے تم سے نہیں
پوچھا خود ہی فیصلہ کر لیا لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا
ساتھ ضرور دوں گا۔ تم میرا ساتھ دو گی ناں؟

خیر کوئی بات نہیں تم اپنے کام ختم کر لو۔ ویسے بھی میری
ای میل میں رونے دھونے کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اب
کوئی نئی ای میل شروع کرنا جس میں کوئی اداسی یا مایوسی
نہیں بس محبت اور خوشی ہو۔

خیال رکھنا اپنا۔ پھر بات ہوتی ہے۔

اللہ حافظ۔

۳۰ اگست ۲۰۱۳

پیارے دوست۔

کیا حال ہیں؟ ہاہاہا تم نے صحیح جانا کہ میں نے تمہیں
پاگل قرار دیتے ہوئے تمہارے نام کا سرٹیفکیٹ جاری
کر دیا ہے۔ اب یہ کیا کہ میری ساری محنت کو رد کرتے
ہوئے میری باتوں کو لیکچر اور وعظ کہہ دیا، تمہیں بتاؤں یہ
ساری باتیں میں اپنے پاس سے نہیں کرتی، یہ ساری وہ
باتیں ہیں جو مجھے میرے ڈیڈ نے سکھائی ہیں، مما نے بتائی
ہیں، میں نے اپنے اردگرد ہمیشہ بہت خوشیاں دیکھی ہیں،
کچھ مسائل رہے لیکن ان مسائل نے کبھی ایسی گمبھیر
صورت اختیار نہیں کی جو ہمارے گھر اداسی بھر دے۔ بس
وہی ساری باتیں جو مجھے میرے مما اور ڈیڈ نے بتائی ہیں
میں دہرا دیتی ہوں۔ تم زیادہ متاثر نہ ہو۔ (ہنسی)

کون سا فیصلہ تم نے اکیلے کر لیا؟ میرے پاگل
دوست کیا میں تمہارا ساتھ نہ دوں گی؟ کیا تمہیں لگتا ہے
میں تم پر یوں ہی محنت کر رہی ہوں؟ نہیں جی میں اب اتنی
بھی اچھی نہیں ہوں۔ تمہارا مجھ پر اعتبار کرنا تمہیں میرے
لیے خاص بنا گیا اور پھر بناتا ہی چلا گیا۔ میں جان ہی نہیں
سکی کہ کب تمہارے اس فیصلے کا انتظار کرنے لگی۔ ان شاء
اللہ وہ وقت جلدی آئے گا۔ ہماری دوستی کی پاکیزگی اس
بات کی گواہ ہے کہ ہماری محبت سچی ہے۔ بس تم پریشان نا
ہو، جب وقت آئے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا اور تم بے
فکر رہو میں تمہیں اپنا پلو چھوڑنے نہیں دوں گی۔

اپنا خیال رکھا کرو اور ہر وقت ایسی شکل نہ بنا کر رکھا
کرو کہ ترس آنے لگے (ہنسی) خوش، خوش رہو گے تو سب

اچھا، اچھا ہوگا۔

پھر بات ہوگی۔

اللہ حافظ۔

تمہاری دوست جان سوما۔

بہت سارا پیار، رشتے ناتے، اپنوں کا ساتھ، روپیہ پیسہ، ایک مکمل گھر کا سکون اور خوشحالی، منتہا سمیع اللہ کی زندگی میں کوئی کمی نہ تھی، ہر دم ہنسنے ہنسانے والی، دوسروں کی مدد کرنے والی منتہا کو نہ جانے کیوں اپنی مکمل زندگی میں کسی کمی کا احساس ہونے لگا تھا اور وہ کمی کیا تھی وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی، دن بدن بے چینی اور بے کلی بڑھ رہی تھی، کچھ دنوں سے اس کا دل اکتاہٹ سے لبریز اور پیشانی پر سوچوں کی لکیروں میں اضافہ ہو رہا تھا، بظاہر زندگی ویسے ہی گزر رہی تھی بہت سی ہلچل اور گہما گہمی میں، ہنستی مسکراتی، خوش باش لیکن کچھ ایسا تھا جو اسے بے چین کرنے لگا تھا۔

یوں تو اسے اتنا وقت میسر نہ تھا کہ ادھر ادھر کے بے معنی اندیشوں کی نذر کر دیتی لیکن پھر بھی ان دنوں اس پر ایک غیر معمولی سنجیدگی اور یاسیت طاری تھی، کام میں اس کا دل نہ لگنا، بات بے بات غصے کا اظہار اور اگلے پل سنبھل جانا اس کی ذات کی ایسی تبدیلیاں تھیں جو اس کے ارد گرد رہنے والے با آسانی محسوس کر سکتے تھے، سب سے پہلے سلمٰی نے یہ تبدیلی محسوس کی۔ کافی دیر سے اپنے ڈیسک پر بیٹھی منتہا سامنے رکھے پیپرز پر اسکیچ بنا بنا کر مٹا رہی تھی، کبھی کچھ سوچنے لگتی، کبھی پیپر کو چڑ مڑ کر کے پھینک دیتی پھر جھنجلانے لگتی پھر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر دبانے لگتی۔

بوتیک کے وارڈ روب کی سیٹنگ کرتی سلمٰی بہت دیر سے اس کی جھنجلاہٹ اور بیزاریت کو خاصی جانچتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ سلمٰی کی کھوجتی نگاہوں کو اپنے آپ پر مرکوز پاتے ہی وہ کھسیانی ہنسی کے ساتھ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سلمٰی اسے گھورتی ہوئی اس کے پاس آئی۔

"اب کیا مجھے پوچھنا پڑے گا؟" سلمٰی نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"پوچھیں گی نہیں تو مجھے پتا کیسے چلے گا کہ کیا پوچھنا چاہتی ہیں۔" منتہا نے ہنستے ہوئے کہا اور سلمٰی سے اشارے سے کافی پینے کا پوچھا۔

"مجھے اس وقت کافی کی طلب نہیں بس یہ جاننا ہے کہ تمہیں کون سی الجھن ستا رہی ہے کہ کام میں دل نہیں لگ رہا؟" سلمٰی نے بڑی گہری نگاہوں سے اس کے چہرے پر پھیلی الجھن کا جائزہ لیا تھا۔

"نہیں سلمٰی باجی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" منتہا نے اسے ٹالنا چاہا۔

"اچھا ایسی نہ ہوگی لیکن ویسی بات تو لازمی ہے، جلدی سے بتاؤ اب۔" سلمٰی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"ویسی بھی کوئی بات نہیں ہے سلمٰی باجی۔" منتہا کافی میکر کی طرف بڑھی اور دو کپ نکال کر رکھے اور قدرے بشاش لہجے میں کہا۔

"تم اب کیا مجھ سے بھی چھپاؤ گی؟" سلمٰی بضد لہجے میں گویا ہوئی۔

"نہیں باجی سچ کہہ رہی ہوں، کوئی بات ہوتی تو آپ جانتی ہیں کہ میں سب سے پہلے آپ کو ہی بتاتی ہوں۔" منتہا نے سلمٰی سے زیادہ اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ اسے کوئی ایسی پریشانی نہیں ہے، جو اسے ہر چیز سے بیزار کر دے۔

"پھر کیا بات ہے؟ کتنے دنوں سے دیکھ رہی ہوں تم کھوئی کھوئی ہو، اندر ہی اندر کسی بات پر الجھ رہی ہو اور پھر خود ہی اپنے آپ کو تسلی دے رہی ہو، تم جانتی ہو میں بھی ایک اچھی سامع ہوں، تم اپنی پریشانی مجھ سے کہہ سکتی ہو۔" سلمٰی نہ جانے کتنے دن سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ سلمٰی کے انکشاف پر منتہا نے متعجب نظروں سے اسے دیکھا اور اگلے پل وہ اپنے آپ کو سرزنش کرنے لگی۔

"ویسے تو کوئی ایسی بات نہیں کچھ آپ کا وہم ہے اور کچھ محبت کہ مجھے ذرا سا بھی پریشان نہیں دیکھ سکتی۔" منتہا نے محبت بھری نظروں سے ان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں جانتی ہوں اب آپ میرا یقین نہیں کریں گی اگر میں کہوں گی کہ کام کا کچھ دباؤ زیادہ ہوگیا ہے۔" منتہا ہنستے ہوئے بولی تو سلمیٰ نے ابرو اچکا کر اسے گھورا۔

"اس لیے میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ مجھے لندن کے بولی وڈ برائیڈل میگزین سے برائیڈل شوٹ کی آفر آئی ہے۔ میں چونکہ ابھی اتنے بڑے پروجیکٹ کے لیے تیار نہیں ہوں اس لیے سمجھ میں نہیں آرہا کہ آفر کو قبول کروں یا مسترد۔" منتہا نے کافی بناتے ہوئے بہت لاپرواہ انداز میں سلمیٰ کو اتنے دنوں کی اپنی الجھن بتائی تو وہ چیخ پڑی۔

"کیا......!" سلمیٰ کی بے ساختہ چیخ پر منتہا ہنسنے لگی۔

"تمہارا دماغ ٹھکانے پر ہے کہ نہیں؟ بھلا اتنی بڑی کمپنی سے ایسی آفر کو کون پاگل مسترد کرتا ہے؟" سلمیٰ نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے حیرانی سے کہا تو منتہا نے اپنی طرف اشارا کیا۔

"تمہارا تو باپ بھی یہ آفر مسترد نہیں کرسکتا۔" سلمیٰ نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا تو منتہا ہنسنے لگی۔

"سلمیٰ باجی جذبات پر قابو رکھیں۔" منتہا نے ہنستے ہوئے کافی کا مگ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"انتہائی بددماغ لڑکی ہو تم منتہا۔ بھلا اتنی اچھی آفر پر کون ایسے بیزار ہو جاتا ہے؟" سلمیٰ نے ترش لہجے میں اسے ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔

"باجی آپ سمجھ نہیں رہی ہیں کہ کتنا مشکل کام ہے اور پھر اتنے کم وقت میں اتنا زیادہ کام کرنا ہے اور سب سے بڑی وجہ...... سلمیٰ باجی میں ابھی اتنی بڑی ذمہ داری کے لیے تیار بھی نہیں ہوں۔" منتہا نے سنجیدگی سے سلمیٰ کو بتایا۔

"ارے میں تو سمجھ رہی تھی تم ایسے ہی مذاق میں کہہ رہی ہو لیکن یار تم تو سنجیدگی سے اس موقع پر لات مارنے پر تلی ہو۔"

"باجی آپ......"

"چپ......" سلمیٰ نے اسے جھڑکا۔ "تم اس آفر کے لیے منع نہیں کررہی ہو، جانتی ہو لوگ سالوں لگا دیتے ہیں اس مقام تک پہنچنے میں اور اللہ نے اتنی جلدی تمہیں یہ موقع دیا ہے اور تم اسے گنوانے لگی ہو۔ پھر نا جانے کب یہ موقع ملے، ملے بھی یا نہیں۔" منتہا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی سلمیٰ نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں ابھی تیار نہیں ہوں، بہت کام کرنا ہوگا باجی۔" منتہا کے لہجے کی اکتاہٹ پر سلمیٰ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"کام ہی تو کرنا ہے ناں؟ دن رات کی محنت سے منتہا گھبرا رہی ہے؟" سلمیٰ نے متغیر نظروں سے اس سے دریافت کیا۔

"نہیں باجی محنت سے نہیں گھبرا رہی ہوں۔ بس مجھے لگتا ہے کہ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے اور ابھی میں اس مقام تک نہیں پہنچی کہ......"

"کوئی بھی کام بڑا یا چھوٹا ہو اس کو ذمہ داری سے ہی نبھانا پڑتا ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں آنٹی ہیں اور تم خود بھی محنتی لڑکی ہو تو اس ذمہ داری سے نہ گھبراؤ۔ ہم مل جل کر کام کریں گے۔" سلمیٰ اس پروجیکٹ کو ہاتھ سے نہ جانے دینے کے لیے منتہا کو ہر طرح سے قائل کرنے کی کوشش کررہی تھی۔

"تم کرلوگی۔ کام وہ مشکل ہوتا ہے جس کی سمجھ نہ ہو اور یہی تو تمہارا مشن ہے۔" منتہا کو سوچ میں ڈوبا دیکھ کر سلمیٰ پھر بولی۔

"واقعی آپ کو لگتا ہے میں بولی وڈ کے میگزین میں کام کرسکوں گی؟" منتہا سلمیٰ سے تصدیق چاہی۔

"بالکل...... کیوں نہیں کرسکو گی؟ کوئی ایک ایسی وجہ تو بتاؤ مجھے؟" سلمیٰ نے پرجوش انداز میں کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے میں سارے پیپرز پڑھ کر انہیں ہاں کردیتی ہوں۔ لیکن پھر آپ کو ساتھ ہونا ہے۔ قدم قدم پہ یہ نہ ہو میں ادھر ہاں کردوں اور ادھر آپ مصروف ہو جائیں۔" منتہا مسکراتے ہوئے بولی تو سلمیٰ نے 'یاہو' کا

نعرہ لگایا۔
"میں تمہارے ساتھ ہوں۔ بس تم بسم اللہ کرو۔" سلمٰی نے اسے راضی کرلیا اور منتہا نے گہرا سانس خارج کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ سلمٰی کے ساتھ مل کر وہ سارے معاملات طے کرنے لگی، آفر لیٹر پر سائن کر کے کمپنی کو بھیج دیے لیکن نہ جانے کیوں اس سب کے باوجود اس کے دل پر چھائی یاسیت میں کمی نہ آئی۔ سلمٰی جا چکی تھی اور منتہا بیٹھی سوچتی رہ گئی کہ آخر اس کی اداسی کی اصل وجہ کیا ہے۔

❁......❁......❁

امل دوپٹا کا گولا بنا کر دانت سے اٹھتی درد کی ٹیسوں کو دبانے کی کوشش میں مشغول تھی، اس کی درد سے کراہتی آواز اور بسورتی شکل دیکھتے ہوئے ارمان نے سامنے رکھی مٹھائی کی پلیٹ شرارت سے مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھائی، جس پر امل نے کڑی نظروں سے اسے دیکھا اور ہاتھ سے پلیٹ کو پیچھے دھکیلا۔ اسی وقت ریان کمرے میں داخل ہوا، دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو پکڑے زرد پڑتی رنگت اور پسینہ پسینہ ہوئی پیشانی اور کچھ اکھڑی سانسوں نے امل اور ارمان کو فکر مندی میں مبتلا کیا۔ امل اور ارمان نے حیرانی سے اس کی غیر ہوتی حالت کو دیکھا تھا۔
"تمہیں کیا ہوا؟" دانت کے درد سے کراہتی امل نے ریان سے پوچھا تھا۔
"کچھ نہیں......" ریان نے صوفہ پر بیٹھتے ہوئے اگلے ہی لمحے اپنے آپ کو نارمل ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا۔ ارمان نے ہنستے ہوئے ریان اور امل کو دیکھا اور برفی کا چھوٹا سا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھ لیا تھا۔
"واہ بھئی مزہ آ گیا۔ کیا مزیدار برفی ہے۔" ارمان نے امل کو چڑاتے ہوئے کہا تو ارمان کے برفی کے چسکوں کو امل نے قہر آلود نظروں سے دیکھا تھا۔
"تمہارے دانتوں میں اگر کیڑا نہ لگا ہوتا
ہم تیرے لیے جلیبیوں کے ٹرک منگواتے"
ارمان اسے زچ کرتے ہوئے شاعرانہ انداز میں لہک لہک کر شعر پڑھنے لگا تو ریان ایک دم پر جوش انداز میں بولا۔
"واہ واہ...... بھائی...... واہ واہ...... مکرر...... ارشاد۔"
ریان کی شریر انداز کی واہ واہ پر امل نے غصیلی نظروں سے اسے گھورا۔
"عرض کیا ہے۔" ارمان آداب بجالاتے ہوئے گویا ہوا۔
"ارشاد ارشاد......" ریان نے امل کی گھورتی نگاہوں کو نظر انداز کرتے ہوئے باقاعدہ مشاعرے کا آغاز کیا۔
"تمہاری داڑھ میں اگر درد نہ ہو رہا ہوتا
ہم تیرے لیے برفی کی بارش برساتے"
ارمان نے ہاتھ اٹھا کر داد لیتے ہوئے پھر شعر پڑھا اور برفی کا ایک اور ٹکڑا منہ میں رکھ لیا تھا۔
"واہ واہ...... خواتین و حضرات یہ تھے ہمارے نئے ابھرتے ہوئے شاعر جانی...... اوہو میرا مطلب ہے جناب ارمان اختر عرف 'مانی' صاحب جنہوں نے اپنی زوجہ محترمہ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے اپنے جذبات کو گھسے پٹے شاعرانہ انداز میں پیش کیا، اب ان کی زوجہ محترمہ اپنے "شاعر جانی" کو داد دینے کے لیے اپنے دانتوں میں بھرتی کیڑوں کی فوج کو اپنی داڑھ میں دباتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہیں کہ وہاں کوئی ایسی جان لیوا فوج نہیں ہے، عین ممکن ہے امل صاحبہ اپنی دانت کی تکلیف کو بھول کر ہمارے ابھرتے ہوئے شاعر...... جو کہ امل صاحبہ کی تیکھی نگاہوں سے واضح کر رہے ہیں کہ شاعر صرف شاعر نہیں بلکہ 'شاعر جانی' کے عہدے پر فائز ہو چکے ہیں کی بے تکی شاعری کے چیتھڑے اڑانے کی کوشش میں ہیں۔" ریان نے ارمان کو خوب داد دیتے ہوئے امل کو زچ کرتے ہوئے باقاعدہ کمنٹری کی کوشش کی تھی۔ امل مسلسل اپنے دوپٹے سے منہ کو لپیٹے قہر آلود نظروں سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔
"ریان کے بچے یہ تم میری شاعری کی تعریف کر رہے ہو کہ عزت خاک میں ملا رہے ہو؟" ارمان نے

ں کی خشمگین نگاہوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ریان کی
رف کشن پھینکتے ہوئے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔
”کمال کرتے ہیں بھائی جان۔ میں...... یعنی کہ میں
یا آپ کو ایسا لگتا ہوں؟“ ریان نے منہ بسور کر بے
اری سی شکل بنا کر اہل کی طرف تائیدی نگاہوں سے
کھا تھا۔
”ایسا ہی لگتا ہے۔“ اہل کو شدید دانت کے درد کی وجہ
سے دونوں کی شرارتیں اس وقت زہر لگ رہی تھیں۔ اس
کے بولنے سے پہلے ہی ارمان بولا تھا۔
”نہیں ارمان بھائی ایسا نہیں ہے۔“ ریان نے اہل کی
رف دیکھا جس کے دانت میں درد سے اب ٹیسیں اٹھ
ہی تھیں۔
”اففف...... تم دونوں کو مذاق سوجھ رہا ہے میرا درد کے
رے برا حال ہو رہا ہے، عجیب بے ڈھنگا ملک ہے ارے
رداب ہے اور ڈینٹسٹ کی اپائنٹمنٹ ملی ہے تین دن بعد
ی۔ اس سے اچھا تو ہمارا پاکستان ہے، کبھی بھی کہیں بھی
یا کر ٹیسٹ کرا لو۔ اففف پلیز کچھ کرووو......“ اہل کو صبح
سے شدید دانت کا درد تھا کافی سارے گھریلو ٹوٹکے بھی
آزما لیے لیکن دانت سے اٹھتی ٹیسوں نے اس کا جینا دوبھر
کر دیا تھا۔
”ہاں تو اور کھاؤ جلیبیاں۔ دو کلو گلاب جامن اور لا
وں کیا؟ ایسا کرتے ہیں برفی کھانے کا مقابلہ پھر رکھ
لیتے ہیں اور اب جو جیتے گا اسے انعام بھی دیں گے۔“
رمان کب سے جلا بھنا بیٹھا اہل اور ریان کی طرف باری
اری دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ اہل جو پہلے ہی درد کے مارے
تڑپ رہی تھی ارمان کی خوامخواہ کی ڈانٹ سے اسے رونا
آنے لگا۔ پچھلی شام ارمان اور اہل باہر گھومنے کے لیے
گئے واپسی پر اہل کو پاکستانی مٹھائیوں کی دکان کیا مل گئی
س کا بس چلتا تو سب کچھ خرید لیتی۔ کافی دنوں بعد مٹھائی
دیکھتے ہی ایسے ندیدے پن کا مظاہرہ کیا کہ ارمان کو اس کی
ضد ماننی ہی پڑی، جلیبیاں، برفی، گلاب جامن، رس گلے
دکان میں شوکیس میں سجی ساری مٹھائی کے ڈبے خرید لائی
اور گھر آتے ہی حسب معمول ایک ہنگامہ برپا کر دیا جیسے
کہ ان سب کا مشغلہ تھا، جب سلیمہ بیگم اور مختیار سونے
چلے گئے تو ان سب کی شرارتیں شروع۔ ریان اور اہل کے
درمیان مٹھائی کھانے کے مقابلے میں اہل جیت تو گئی
لیکن دوسری صبح کا سورج بے تحاشا دانت کے درد کے
ساتھ طلوع ہوا۔ ریان نے اہل کی آنکھوں میں آنسو دیکھے
تو اسے ترس آنے لگا تھا۔
”تمہیں کیوں نہیں ہوا دانت کا درد مجھے ہی کیوں
ہوا؟“ اہل کو آج اندازہ ہونے لگا تھا کہ جوش میں اس نے
اپنا ہی نقصان کر لیا تھا۔
”کیوں کہ اہل بجو میرا پیٹ خراب ہو گیا ہے۔“ ریان
ایک دم اٹھ کر باہر بھاگا اور جاتے ہوئے تیزی سے بولا
تھا۔
”اوہو اچھا اچھا تو اس لیے اس کے رنگ اڑے ہوئے
ہیں۔“ ارمان کے قہقہے نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔
”مٹھائی کھانے سے پیٹ خراب ہوتا ہے کیا؟“ اہل
جو زیادہ میٹھا کھانے کی وجہ سے اب دانت درد سے تڑپ
رہی تھی ارمان کی طرف دیکھتے ہوئے تعجب سے پوچھنے لگی
تھی۔
”مٹھائی انسانوں کی طرح کھاؤ تو کچھ نہیں ہوتا بیگم
صاحبہ لیکن اگر شرطیں لگا کر کھاؤ تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“
ارمان نے اسے گھورتے ہوئے کہا تھا۔
”تم ایسا کرو گلاب جامن تھوڑے اور کھا لو۔ پیٹ
ٹھیک ہو جائے گا۔“ کچھ دیر بعد ریان واپس کمرے میں
داخل ہوا اس کی اڑی رنگت دیکھتے ہوئے ارمان نے اس کا
مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا۔
”ویسے اہل بجو نوکری سے غیر حاضر، گھر بیٹھا نکما شوہر
بھی کسی تنک چڑھی ساس سے کم نہیں ہوتا اور ابھی شکر
کریں ابی آج گھر پہ نہیں ہیں ورنہ دانت درد کے ساتھ
آپ دو دو ساسوں کا مقابلہ کیسے کرتی۔“ ریان نے صوفہ کی
پشت سے سر ٹکاتے ہوئے پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے
ارمان کی جاب سے چھٹیوں پر طنز کیا تو ارمان نے قہقہہ

لگا یا جبکہ اہل دانت درد سے ایسی نڈھال تھی کہ مسکرا بھی نہ سکی تھی۔

"ارمان بھائی آپ ڈینٹسٹ کو کال کریں کہ ایمرجنسی ہے وہ آج ہی چیک کرلیں گے۔" ریان نے کہا تو ارمان اہل کی درد سے بری ہوتی حالت کو دیکھتے ہوئے ڈینٹسٹ کا نمبر ملانے لگا تھا۔

"اہل بجو فکر نہ کریں، ڈینٹسٹ آج ہی چیک کرلیں گے نہ کرسکے تو ہمارے گھر سارے ٹولز موجود ہیں ہم خود ہی یہ کام بھی کرلیں گے۔" ریان اپنی حالت بہتر ہوتے ہی اہل کو پھر سے تنگ کرنے لگا تھا۔

"ریان......مار کھاؤ گے۔"

"ہاں اب مار ہی کھانی باقی ہے مٹھائی کی تو گنجائش نہیں رہی۔" ریان نے ہنستے ہوئے کہا اور ایک بار پھر باہر کی طرف دوڑ لگادی تھی۔

"ریان......" اہل کی پکار کو ان سنی کرتے واش روم کی طرف بھاگا تھا۔

"ریان...... ریان......" آوازوں پر ریان نے آنکھیں کھولیں۔ سامنے امینہ کو کھڑے پایا جو ہاتھ میں سوپ کا پیالہ پکڑے کھڑی تھی۔ ریان نے بے یقین نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا، نہ اہل نہ ارمان نہ ریان کی چہکتی ہنسی۔ امینہ اس کی بدلتی رنگت کو دیکھتے ہوئے اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"تم ٹھیک ہو ریان؟" امینہ کی بھرائی آواز پر ریان ایک دم حال میں لوٹ آیا۔

"میں ٹھیک ہوں امینہ بجو۔" وہ بہ مشکل بول پایا۔

"ہمارا گروپ بکھر گیا ریان۔ ہم سب ہی کہیں کھو گئے ہیں۔" امینہ نے ہاتھ میں پکڑا سوپ کا باول میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اہل بجو اور ارمان بھائی نے اچھا نہیں کیا۔ انہوں نے دھوکا دیا ہے مجھے۔ مجھے بھی ساتھ لے جاتے تو آج سب بھول چکے ہوتے۔" ریان نے بھرائی آواز میں کہا۔

"نہیں کون بھولا ہے جو تمہیں بھی بھول جاتے؟ اب ہمیں اپنے آپ کو سنبھالنا ہے۔ نا اہل میرے ساتھ مجھے ہر چھوٹی بڑی بات بتانے کے لیے ہے نا ارمان بھائی تمہارے ساتھ تمہیں کچھ کہنے کے لیے ہیں۔ میں جانتی ہوں ریان بہت مشکل ہوگا لیکن تمہیں اب ہمت کرنی ہوگی۔" امینہ چاہنے کے باوجود ریان کو سلیمہ کے رویے کے حوالے سے کچھ نہ کہہ پائی۔

"میں سمجھتا ہوں امینہ بجو لیکن امی سے مجھے بات کرنی ہے۔ میں ان کو یقین دلاؤں گا کہ میں نے...... امینہ بجو...... سامنے سے آتی گاڑی نے اپنا کنٹرول کھویا تھا میں تو سب کو بچانا چاہتا تھا۔" ریان کے لہجے میں بے چینی تھی ایک دکھ اور بہت کچھ کھو دینے کا احساس۔

"ہم سب جانتے ہیں ریان کہ تم نے کچھ بھی جان بوجھ کر نہیں کیا۔ تم ضرور خالہ جان سے بات کرنا لیکن فی الحال تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ تم یہ سوپ لو اور آرام کرو۔" امینہ نہیں چاہتی تھی کہ ابھی ریان سلیمہ کے سامنے جائے اس لیے وہ کچھ گھبرانے لگی۔ ریان کو سوپ کا کہہ کر کمرے سے باہر نکل آئی کہ ایان کو کہہ سکے کہ ریان کو ابھی سلیمہ کے کمرے میں جانے نہ دے۔ امینہ تو چلی گئی اور ریان ایک بار پھر ماضی کی بھول بھلیوں میں الجھنے لگا تھا۔

وہی بے تحاشا روشنیاں، ہارن اور ٹائروں کے چرچرانے کی آوازیں۔ اہل کی چیخیں، ارمان کی گاڑی کو کنٹرول کرنے کی کوشش میں اسٹیئرنگ کو گھمانے میں اس کی مدد کرنا، اہل کی مدد کے لیے پکار۔ کیا کچھ نہ تھا جس نے اسے ایک بار پھر بے چین کردیا تھا۔ ان آوازوں اور چیخوں کو دبانے کی خاطر اس نے ایک بار پھر کانوں پر ہاتھ رکھے۔

حسرت سے دیکھتے رہے ماضی کو اس طرح
جیسے کہ لوٹ آئیں گے وہ دن جو گزر گئے

❀......❀......❀

۲۹ اکتوبر ۲۰۱۳

"اگر تم دومنٹ اور آن لائن نہ ہوتی تو میں آف لائن ہونے والا تھا۔"

"تمہارا میسج جیسے ہی دیکھا میں آگئی۔"

"تمہیں الہام کیوں نہیں ہوا کہ میں تمہارا انتظار کررہا ہوں۔"

"میں تمہیں کوئی پیرنی فقیرنی لگتی ہوں کیا کہ مجھے الہام ہوا کریں؟"

"نہیں تم مجھے صرف پیاری لگتی ہو۔"

"ہاں تو صرف پیاری لگنے سے الہام تھوڑی ناں ہوتے ہیں۔"

"میں سمجھا کیا پتا...... شاید کوئی چانس بن جائے۔"

"جی جناب ایسے چانس نہیں بنا کرتے۔"

"ہاں اب پتا چل گیا اور تم کیسی ہو؟"

"میں ویسی ہی ہوں جیسی تمہیں لگتی ہوں۔"

"مطلب چڑیل؟"

"جی نہیں پیاری۔"

"اوہ...... ہاں اچھا اچھا۔"

"میں اگر ابھی نہ آن لائن آتی تو تم چلے جاتے؟"

"ہاں میں نے عادل کے ساتھ جانا تھا، تمہیں ای میل لکھ دی ہے پڑھ لینا۔"

"وہ تو پڑھ لوں گی لیکن تم تو جارہے ہو۔"

"تم نے دیر کردی ناں۔"

"اچھا کوئی بات نہیں تمہیں جانا ہے تو ہم پھر دن میں بات کرلیں گے۔"

"او کے۔ خیال رکھنا اپنا۔"

"تم بھی خیال رکھنا اور دھیان سے جانا۔"

"او کے جی، جو حکم۔"

"حکم نہیں التجا ہے۔ اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ۔"

❁ ❁ ❁

۲۹ اکتوبر ۲۰۱۳

پیاری دوست جان سوما

دل کے جز دان میں اک نام سجا ہے ناصر
ہم کسی حال میں ہوں، اس کی خبر رکھتے ہیں

کیسی ہو تم اور کہاں ہو؟ ابھی اگر تم بھی آن لائن آجاؤ تو مجھے بھی یقین آجائے کہ میری بھی دعائیں قبول ہوجاتی ہیں (مدہم ہنسی) لیکن شاید تم اتنی مصروف ہو کہ اس وقت تمہارے نام کی سبز بتی روشن ہونے کے کوئی امکان نہیں ہیں۔ خیر اب کیا ہوسکتا ہے؟ مجھے اکیلے ہی دیوار...... میرا مطلب ہے تم سے باتیں کرنی ہوں گی، میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں بھی محبت کرسکوں گا لیکن شاید سب ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ محبت کی نہیں جاتی ہوجاتی ہے، بس کوئی اچانک اچھا لگنے لگتا ہے، بہت اچانک یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ جو بہت عام سا تھا وہ کتنا خاص ہوگیا ہے، اچانک ہی دن رات اس کے بنا ادھورے لگنے لگتے ہیں اور زندگی اس کے بغیر نامکمل۔

تم جانتی ہو اب پہلے کی طرح مجھ سے ای میل نہیں لکھی جاتی، اب میرا دل کرتا ہے کوئی بھی بات کروں تو اس کا اسی وقت جواب مل جایا کرے۔ ہائے کاش......

تمہیں بتایا تھا ناں کہ عادل میرا اکلوتا دوست ہے جس سے میں کبھی کبھار کوئی بات شیئر کرلیا کرتا ہوں، پتا کیا ہوتا ہے کہ میں اپنی ذاتی الجھنیں عادل سے نہیں کہہ سکتا، اس لیے کہ میں نہیں چاہتا کہ میری فیملی کے حوالے سے کوئی بات عادل کو معلوم ہو اور پھر عادل کسی اور کو بتائے، مجھے حلقہ احباب میں اپنی فیملی کے حوالے سے اپنا آپ معتبر رکھنا پسند ہے، کچھ دن پہلے تمہیں بتایا تھا کہ میں نے عادل کو تمہارے بارے میں بتایا ہے؟ اپنی اور تمہاری دوستی اور پھر دوستی سے محبت کی ساری تو نہیں لیکن کچھ باتیں عادل کو بتائی ہیں، جانتی ہو اس نے مجھے ڈانٹا ہے کہ کسی انجان پر ایسے نہیں اعتبار کیا جاتا کہ اس کو اپنی پوری زندگی ہی سونپ دی جائے، عادل کہتا ہے کہ کسی انجان کے ساتھ اپنی ساری دنیا بانٹ لینا کوئی عقل مندی نہیں ہے، وہ جانتا نہیں سوما کہ تم تو کبھی میرے لیے انجان رہی ہی نہیں تم تو نا جانے کب سے میرے آس پاس موجود ہو بس تم سے ملنا اس مقام پر ہوا ہے۔ وہ یقین کرے یا نہ کرے، کسی اور کو اعتبار آئے یا نا آئے میرا اور تمہارا تعلق

ہمیشہ سے موجود تھا، جانتی ہو عادل کہتا ہے کہ تم میری کوئی اپنی تخلیق کی ہوئی محبت ہو۔ (قہقہہ) بھلا اپنے پاس سے بنائی ہوئی محبت کا جواب محبت سے مل سکتا ہے؟ اب جب تم میرے ساتھ ہوگی ناں تب اسے یقین آئے گا کہ تم ہو۔ میرے خیالوں میں، دل میں ہی نہیں میری زندگی میں بھی تم ہو۔

مجھے لگتا ہے تم بہت مصروف ہو کہ میسج کرنے پر بھی تمہارے نام کی بتی روشن نہیں ہوئی اور میں نے اب ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد جانا ہے۔ اگر اب تم آن لائن...... دیکھو تم آن لائن آگئی ہو۔ ایسے وقت پر آئی کہ اب میں...... تمہیں چھوڑ کر کیسے جاسکوں گا اور جانا بھی ہے کہ عادل انتظار کررہا ہے۔

تم سے آن لائن بات کرتا ہوں اس لیے یہاں سے اجازت چاہوں گا۔

اپنا خیال رکھنا۔

اللہ حافظ۔
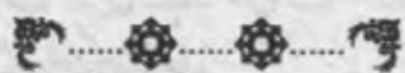
۲۹ اکتوبر ۲۰۱۳ء

اب یہ پوری پوری ناانصافی ہے۔ مجھے بلا کر خود چلے گئے۔

تم بہت پاگل ہو، بہت سر پھرے لیکن پتا ہے کبھی کبھی میں بھی سوچتی ہوں کہ تم اور میں کہیں...... کہیں تم میرے ہی خیالوں کے کوئی کردار تو نہیں؟ ایسے کیسے کوئی اتنا ہم مزاج ہوسکتا ہے؟ پھر میں اپنی ہی سوچ پر ہنستی ہوں اور میں بھی یہی سوچتی ہوں کہ بھلا اپنے خیالوں میں تراشے گئے کردار میں روح پھونکی جاسکتی ہے؟ تم ہو میرے آس پاس۔ میرے دل میں ہمیشہ سے۔ ہاں تم میری زندگی میں اب آئے ہو اور جب ہم ساتھ ہوں گے تو سب کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی اس بات کا یقین آجائے گا کہ ہم دونوں ایک الگ، الگ وجود رکھتے ہیں اور ہم موجود ہیں۔ (ہنسی)

پتا ہے میری فرینڈز اکثر مجھے کہتی ہیں کہ میں بہت افسانوی لڑکی ہوں لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ تم تو مجھ سے بھی چار قدم آگے ہو۔ ہم پاس نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی زندگی کو ایک دوسرے کے ساتھ بہت پرلطف انداز میں بانٹ رہے ہیں، دلکش انداز میں جی رہے ہیں، لگتا ہے جیسے بس یہی زندگی ہے اور یہ صرف میرا نہیں تمہارا بھی کمال ہے۔ چاند اور چوڑیوں کی اس محبت کو تم نے مضبوط کیا ہے۔ تم نے مجھے یہ احساس دلایا ہے کہ چوڑیوں کی کھنک میں محبت رقص کرتی ہے، تم نے مجھے محسوس کرایا ہے کہ چاند کی چاندنی میں جو چمک ہے وہ محبت ہے اور میں اس محبت کی پاکیزگی پر ایمان لے آئی، بس تم کبھی اداس نہ ہوا کرو مجھے اپنا آپ اندھیروں میں ڈوبتا محسوس ہوتا ہے۔ ویسے سچ میں یہ زیادتی ہے میری بتی روشن ہوئی تو تمہاری بجھ گئی۔ (اداسی) اچھا کوئی بات نہیں تم عادل کے ساتھ انجوائے کرو۔ ان شاء اللہ ہم پھر بات کرلیں گے۔ اپنا خیال رکھنا۔

اللہ حافظ

تمہاری دوست جان سوما۔

"امی آپ یہ کیا کررہی ہیں؟" ایان کچھ دیر بعد سلیمہ بیگم کے پاس آ کر بیٹھا، فرحان پہلے سے وہاں موجود تھا، ایک طرف مختیار بھی حسب معمول خاموشی سے بیٹھے تھے، اسے دیکھتے ہی سلیمہ نے رخ موڑ لیا۔ ایان نے خاموش بیٹھے باپ کو دیکھا، فرحان کی بیزاری کو دیکھتے ہوئے دلبرداشتہ انداز میں سلیمہ بیگم سے پوچھنے لگا۔

"نا ایسا کیا کردیا میں نے؟ جو تم دونوں بھائی میرے سر ہو رہے ہو؟" ایان کا سوال سنتے ہی سلیمہ ہتھے سے اکھڑ گئیں، ایان نے فرحان کی طرف دیکھا اور سمجھ گیا کہ سلیمہ اس کے آنے سے پہلے فرحان کو بھی لتاڑ چکی ہیں۔

"امی آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔" ایان نے ان کی ناراضی کی پروا نہ کرتے ہوئے ترش لہجے میں کہا۔

"اب تم مجھے بتاؤ گے کہ مجھے کیا کرنا ہے؟" سلیمہ بیگم

سے گھورتے ہوئے بولیں۔
"امی ایک بھائی مر گیا اب کیا دوسرے کو زندہ مار دیں گی؟" ایان ماں کے لب و لہجے سے زچ ہوتے ہوئے اکتاہٹ سے بولا۔
"کیا کہنا چاہتے ہو میں زندہ مار دوں گی؟ دیکھ رہے ہیں اپنی اولاد کے الزامات؟ یہ صلہ ملا مجھے اس احسان کا کہ آج میری ہی اولاد میرے خلاف ہو کر اس کے لیے لڑنے لگی ہے۔" سلیمہ بیگم بے حد غصے میں مختیار کو مخاطب کرتے ہوئے بولیں۔
"امی میں الزام نہیں لگا رہا ہوں سمجھیں میری بات کو۔" ایان نے فرحان کی طرف دیکھا جو فق چہرے کے ساتھ سلیمہ بیگم کے ردعمل کو دیکھ رہا تھا۔
"میرا دماغ کہاں کام کرتا ہے جو میں سمجھوں؟ میں تو ہوں ہی ناسمجھ اور جاہل۔"
"امی آپ کو کیا ہو گیا ہے؟" ایان انتہائی پریشانی سے گویا ہوا۔
"پاگل ہو گئی ہوں میں پاگل...... سمجھے؟" وہ با آواز بلند چلائی۔ مختیار صاحب نے چونک کر سلیمہ کو دیکھا، کچن میں کام کرتی امینہ اور فوزیہ بھی ان کے چلانے کی آواز سن کر کمرے کے دروازے میں آ کھڑی ہوئیں۔
"خالہ جان کو کیا ہوا؟" امینہ نے ایان کے جھکے سر کو دیکھتے ہوئے اندر قدم بڑھائے تو فوزیہ بھی ایک دم آگے بڑھی۔
"ممانی جان کیا ہوا؟" اس سے پہلے کہ امینہ آگے بڑھتی فوزیہ پھرتی سے امینہ کو پیچھے کرتی سلیمہ بیگم کے پاس آ کر کھڑی ہوئی اور ان کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی، امینہ وہیں کھڑی حیرت سے اس کو دیکھتی رہ گئی۔
"مت بھولنا امینہ کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دوسروں کو پیچھے دھکیل کر آگے بڑھتے ہیں، انہیں لگتا ہے کامیاب ہونے کا یہی ایک طریقہ ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ کسی دوسرے کے کندھے پر پاؤں رکھ کر آسمان سے تارے توڑنے والے کس قدر خطرے میں ہوتے ہیں، نیچے کھڑے انسان کے کندھے پر جب بوجھ بڑھ جائے تو کندھے پر چڑھا انسان منہ کے بل گرتا ہے اور سیدھا پاتال میں جا پہنچتا ہے۔" سینک کے سامنے کھڑی برتن دھوتی اہل نے ہنستے ہوئے ایسی گہری بات کی تھی کہ کچن کی باقی صفائی کرتی امینہ ایک لمحے کو رک گئی تھی۔
"کیا مطلب ہے؟" امینہ واقعی نہیں سمجھی تھی کہ اہل نے بنا کسی جواز کے ایسی بات کیوں کی تھی۔
"ارے پاگل، میری بھولی دیورانی صاحبہ میں تمہاری دیورانی کی بات کر رہی ہوں۔" اہل نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔
"میری نہیں ہماری دیورانی۔ ویسے اب اس نے ایسا کیا کر دیا ہے؟" امینہ نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔
"وہ کیا کرتی ہے یہ جاننے کے لیے تمہیں بھی اپنی آنکھیں کھلی رکھنی ہوں گی۔ ویسے ایک بات بتا دیتی ہوں کہ مہارانی صاحبہ غیر محسوس طریقے سے خالہ جان کو ہمارے خلاف کر دیتی ہے۔" اہل نے مسکراتے ہوئے لاپروا انداز میں امینہ کو بتایا تھا۔
"اچھا وہ کیسے؟" امینہ واقعی لاعلم تھی یا شاید اس کے لیے وہ کچھ جانتی نہیں تھی کہ اسے پروا نہیں تھی۔ اس کے لیے اپنی نیک نیتی ہی سب سے بڑی طاقت تھی۔
"تمہیں خود پتا چل جائے گا اور ایک بات یاد رکھنا، تمہاری نیک نیتی تمہارا سب سے بڑا ہتھیار بے شک ہو لیکن کبھی کبھی اپنے حق کے لیے لڑنا بھی پڑتا ہے، سب کچھ صرف نیک نیتی کے سہارے نہیں چھوڑا جاتا۔ ورنہ یہ دنیا بہت شاطر ہے، قدموں تلے روندنے میں دیر نہیں لگائے گی۔" کچھ ہی وقت میں اہل فوزیہ کو بہت اچھی طرح سمجھ چکی تھی اور اب جب اہل نہیں رہی تھی تو امینہ کو اہل کی باتیں سمجھ آنے لگی تھیں۔ امینہ بھی اب آہستہ آہستہ فوزیہ کی چالاکیوں کو سمجھنے لگی تھی، فوزیہ کرتی نہیں تھی بس امینہ کی ہر ایک حرکت پر نظر ضرور رکھتی تھی جیسے ہی امینہ کچھ کرنے لگتی فوزیہ ایک دم چھلانگ لگا کر اس سے آگے آ کھڑی ہوتی تھی۔ امینہ ایان کے پاس آ کر کھڑی ہوئی

اوراس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے متوجہ کیا۔
"اگر خالہ جان غصے میں ہیں تو آپ ہی سمجھ جائیں۔" اینہ، ایان کے پاس بیٹھتے ہوئے مدھم آواز میں بولی۔
"کچھ نہیں ہوا۔ بس میری ہی قسمت خراب ہے۔" سلیمہ نے فوزیہ کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے غصے سے کہا، فوزیہ نے ایک دم ادھر ادھر دیکھا لیکن کوئی بھی اس وقت ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔
"سلیمہ بیگم تم کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہی ہو۔" مختیار صاحب بھی شاید اب سلیمہ کی اس ضد سے عاجز آ چکے تھے۔
"جب اولاد ماں کو جھٹلانے لگے تو ماں جذباتی ہی ہو جاتی ہے۔" مختیار کی بات سنتے ہی سلیمہ کے تن بدن میں جیسے چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔
"امی اب آپ زیادتی کر رہی ہیں۔" پہلی بار فرحان بولا۔
"بات کو سمجھتی میں نہیں، جذباتی میں ہوں، زیادتی بھی میں ہی کر رہی ہوں، بیٹا مجھے بتاؤ ذرا تمہاری ماں کا کوئی کام ایسا بھی ہے جو قابل تحسین ہو؟" سلیمہ کی تو دکھتی رگوں کو بری طرح کچلا جا رہا تھا۔
"امی پلیز...... اللہ کا واسطہ ہے۔ یہ دیکھیں۔" ایان نے دونوں ہاتھ جوڑے اور بے حد اکتائے انداز میں مخاطب ہوا۔
"میرے جڑے ہاتھوں کی طرف دیکھیں اور سمجھ جائیں کہ وہ ایک ایکسیڈنٹ تھا جو کسی سے بھی ہو سکتا تھا، ارمان اور امل کی موت ایسے ہی لکھی تھی، اس میں ریان کا قصور نہیں نہ اس کی ارمان اور امل سے کوئی دشمنی تھی کہ ان کی جان لے لیتا۔ ایک بے بنیاد بات کو عذر بنا کر آپ خوامخواہ اپنے لیے اور ہم سب کے لیے مشکل پیدا کر رہی ہیں۔ بس کریں اب بہت ہو گیا۔" ایان انتہائی غصے میں بولا، اس کے چپ ہوتے ہی سلیمہ بیگم نے جو رونا شروع کیا تو ان کی طبیعت خراب ہونے لگی، فوزیہ نمبر بڑھانے کے چکر میں سلیمہ بیگم کی فکر میں گھلنے لگی، یک دم ہی سلیمہ بیگم کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔ اب ایان سر تھامے بیٹھا مختیار صاحب کی کڑی نظروں کی زد میں تھا۔ سلیمہ بیگم کی بگڑی حالت پر فرحان نے ایمبولینس بلائی۔ ایان کے ساتھ ساتھ اینہ بھی سر جھکائے بیٹھی اس لمحے کو کوس رہی تھی جب ایان نے بولنا شروع کیا تھا۔

....

اور پھر منتہا نے سلمیٰ اور خدیجہ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے برائیڈل میگزین کی پیشکش کو ہاں کہہ دیا، وعدے کے مطابق سلمیٰ نے اس کا پورا ساتھ بھی دیا تھا۔ وقت بہت کم تھا، منتہا نے فقط چودہ دنوں میں اپنا آئیڈیا اور کام کی بریفنگ وہاں جمع کرنی تھی، دو ہفتے کی دن رات کی مسلسل محنت کے بعد آج شام منتہا کا کام ختم ہو گیا تھا، تھک ہار کر منتہا اب کل کی میٹنگ کی تیاری کرنے لگی تھی، ایک بوجھل پن اور الجھن نے شدید مصروفیت میں بھی اپنا حصار نہ توڑا تھا، ہاتھ میں کافی کا مگ پکڑے منتہا اپنی اسکیچ پر نظریں جمائے بیٹھی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں ایک ہلکی سی نمی نہ جانے کیوں جھلملانے لگی تھی، پیشانی پر فکر مندی کی سلوٹوں میں جب اضافہ اسے خود بھی محسوس ہونے لگا تو اس نے ایک دم اسکیچ بک کا صفحہ پلٹا، اس کے پاس رکھے موبائل پر ایک انجان نمبر اس کی دھڑکن کو تیز کر گیا۔ کچھ سوچتے ہوئے اس سے پہلے کہ فون بند ہو جاتا اس نے کال ریسیو کر لی۔
"ہیلو منتہا؟" دوسری طرف سے تصدیق چاہی گئی۔
"آ...... آپ کون؟" بااعتماد منتہا کی آواز لمحہ بھر کو لڑکھڑائی۔
"آپ پہچان نہیں سکیں گی، مانیں گی بھی نہیں لیکن میں آپ کا طلب گار ہوں۔" مدھم آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو اک پل میں منتہا کے چہرے کے تاثرات بدلے۔
"کیوں کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔" ایک لمحے میں اس کے لہجے کا پھیکا پن لوٹا، دوسری طرف لگائے گئے قہقہے نے اسے بدمزہ کر دیا تھا۔

"تو اس کا مطلب ہے آپ پہچان گئیں؟" سوال سنتے ہی منتہا کا جی چاہا خوب کھری کھری سنائے لیکن ایسا کچھ کہنا کے مزاج میں شامل نہیں تھا۔

"آپ نے مجھے کیوں کال کی؟" منتہا نے بیزاری سے پوچھا۔

"آپ کے سوال کا ایک ہی جواب ہے میرے پاس مس منتہا......"

"بلال صاحب میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ میں آپ سے دوستی نہیں کر سکتی۔" منتہا کے لہجے میں اکتاہٹ واضح تھی۔

"تو نہ کریں دوستی۔ مجھے اس بات کی تسلی دے دیں کہ میرے والدین آپ کے گھر جائیں تو انہیں انکار نہیں کیا جائے۔" بلال نے اس سے ایک بار پھر زچ کیا۔

"دیکھیں بلال صاحب میں پہلے ہی آپ کو بتا چکی ہوں کہ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی، میرے پاس فی الحال کسی معاہدہ کی گنجائش نہیں۔" منتہا تلخ کلامی سے اجتناب برتتے ہوئے بہت نپے تلے الفاظ میں اسے منع کر رہی تھی۔

"میں کوئی معاہدہ نہیں کرنا چاہتا مس منتہا، دل سے چاہتا ہوں کہ آپ میری زندگی میں شامل ہوں۔" بلال نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا تو منتہا نے لب بھینچ لیے۔

"مس منتہا...... میں کوئی آوارہ لڑکا نہیں ہوں، میرا تعلق اچھے خاندان سے ہے، نہ میں آپ کے ساتھ کوئی فلرٹ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، آپ مجھے اچھی لگتی ہیں مس منتہا، میرے دل نے گواہی دی کہ آپ میری زندگی میں آگئیں تو میری زندگی سنور جائے گی۔" منتہا کی خاموشی پر بلال نے بنا تمہید کھلے الفاظ میں اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"میں جانتی ہوں کہ آپ اچھے خاندان سے ہیں، مجھے آپ کی اچھائی پر بھی کوئی شبہ نہیں بلال صاحب لیکن مجھے ابھی تک ایسا نہیں لگا کہ آپ میری زندگی میں آگئے تو میری زندگی سنور جائے گی۔" بلال کسی اوچھے انداز میں بات نہیں کر رہا تھا اس لیے منتہا نے اپنی جھنجلاہٹ کو حتیٰ الامکان چھپانے کی کوشش کی۔

"مس منتہا...... ایسا اس لیے کہ آپ مجھے جاننے کی کوشش نہیں کر رہیں، جب دو لوگ ایک دوسرے کو جاننے لگتے ہیں تو ان کے درمیان......"

"بلال اگر آپ دل کی باتیں سمجھتے ہیں تو یقیناً یہ بھی سمجھتے ہوں گے کہ کسی کے ساتھ کی خوشی کا تعلق دل سے ہوتا ہے اگر دل میں کسی کے ساتھ کی خواہش نہ ہو تو ہم خوش نہیں رہ پاتے۔" بلال کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی منتہا نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"کیا آپ مجھے ایک موقع بھی نہیں دیں گی کہ میں آپ کے دل میں اپنے ساتھ کی خوشی پیدا کر سکوں؟" بلال ہر قیمت پر منتہا کا ساتھ چاہتا تھا۔

"میں اپنے آپ کو جانتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ کا یہ زعم ٹوٹے۔"

"میں آپ کو کھونا نہیں چاہتا منتہا۔" بلال نے بے حد سنجیدگی سے کہا تو منتہا کانپ کر رہ گئی۔ وہ کچھ اور بھی کہہ رہا تھا لیکن منتہا اب سن کہاں رہی تھی؟ ایک دم اس کے اندر بہت زیادہ تھکن نے ڈیرا جما لیا تھا۔ بلال کی محبت کی تکرار اور سنجیدگی منتہا کو الجھانے لگی تھی۔

"ہیلو...... ہیلو...... منتہا آپ سن رہی ہیں؟ میری آواز آ رہی ہے ناں؟"

"مجھے آپ کی آواز نہیں آ رہی۔" وہ بار بار اسے پکار رہا تھا اور منتہا جیسے پتھر کی بنی بیٹھی تھی۔ کچھ دیر بعد بلال نے کال بند کر کے دوبارہ نمبر ڈائل کیا لیکن اب منتہا نے اس کی کال ریسیو نہیں کی۔ بار بار کی کال سے بچنے کے لیے منتہا نے زندگی میں پہلی بار اپنا موبائل آف کر دیا تھا۔

***

عالیہ کی خود غرضی اور زبان درازی اکثر بہروز کو اپنے فیصلے پر پچھتانے پر مجبور کر دیتی تھی، بہروز بذات خود بہت حلیم طبیعت کے مالک تھے، ہمیشہ خاموش ہو جانے میں

مصلحتیں تلاش کیا کرتے تھے، عالیہ کے ساتھ نکاح کے فیصلے پر بھی وہ ضرورت سے زیادہ مصلحت سے کام لے رہے تھے، جوں جوں وقت گزرتا گیا بہروز کا پچھتاوا بھی بڑھتا گیا لیکن اب مزید کسی فیصلے کی گنجائش نہ رہی تھی، یوں بھی مومنہ کی پیدائش کے بعد بہروز نے اپنا آپ مٹا کر عالیہ کے ساتھ سمجھوتے کے لیے خود کو راضی کرلیا تھا، مختیار کے ساتھ بہروز کے تعلقات دن بدن عالیہ کو کھٹکنے لگے تھے، یوں بھی اس کی خواہش تھی کے جائیداد میں حسنین کو بھی حصے ملے کیونکہ کہ بہروز نے اسے بیٹے کے روپ میں ہی قبول کیا تھا لیکن مختیار نے جائیداد کے معاملات میں ہمیشہ اپنے بچوں اور مومنہ کے علاوہ کسی اور کا ذکر نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے عالیہ کی تلخی بڑھ رہی تھی اور وہ وقت بے وقت بہروز کو جائیداد کی دیکھ بھال سے منع کرتی رہتی تھی۔ مومنہ کی باپ کے ساتھ بہت دوستی تھی، اکثر دونوں کو اکٹھے دیکھتے ہوئے عالیہ کا پارہ چڑھ جاتا تھا۔ مومنہ کی زیادہ عادتیں بہروز پر گئی تھیں اکثر اوقات ماں کی تلخ کلامی پر مومنہ عالیہ کو منع کیا کرتی تھی، مومنہ دیکھ رہی تھی کہ پچھلے بہت سارے دنوں سے، بہروز کی طبیعت میں ایک غیر معمولی خاموشی اور بیزاری نے جنم لے لیا ہے، وہ یہ بھی جانتی تھی کہ عالیہ کے رویے اور تلخ کلامی نے ہمیشہ بہروز کو شرمندگی سے دوچار کیا ہے لیکن محسوس کررہی تھی کہ بہروز کی پریشانی کی وجہ عالیہ کا چڑچڑاپن نہیں تھا۔

"کیا بات ہے ابو، آپ کسی بات پر پریشان ہیں؟" بہروز کے پاس بیٹھتے ہوئے مومنہ نے ان کی بند آنکھوں کو دیکھا۔

"کچھ نہیں بیٹا۔" بہروز نے آنکھیں کھول کر مدھم مسکراہٹ سے مومنہ کو مطمئن کرنا چاہا۔

"نہیں ابو...... میں جانتی ہوں کوئی بات آپ کو پریشان کررہی ہے۔ آپ مجھے بتائیں، کیا آپ امی کی وجہ سے پریشان ہیں؟" مومنہ کی بات پر بہروز نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"نہیں بیٹا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" بہروز اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"پھر کیا ہے؟ میں دیکھ رہی ہوں جب سے ارمان بھائی کا انتقال ہوا ہے، آپ بہت زیادہ پریشان رہنے لگے ہیں۔" مومنہ نے کہا تو بہروز نے ایک نظر اسے دیکھ کر سرد آہ بھری۔

"بیٹا خاندان کا کوئی گھر اجڑ جائے تو پریشانی تو ہوتی ہی ہے ناں۔" بہروز نے آہستگی سے کہا۔

"ہاں ابو صحیح کہہ رہے ہیں آپ لیکن آپ کی فکر اور پریشانی مجھے بہت اداس کرنے لگی ہے، مجھے ایسا لگتا ہے جیسے آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن کہہ نہیں پا رہے۔" مومنہ کی زیرک نظروں پر بہروز نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر ایک گہری سوچ میں گم ہوگئے۔

"ابو...... بتائیں ناں کیا بات ہے؟ امی مختیار چچا کے خلاف کیوں ہیں، مختیار چچا نے ایسا کون سا احسان کیا آپ پر کہ آپ بنا کسی انکار کے یہاں کے سارے معاملات سنبھال رہے ہیں۔" مومنہ بضد ہوئی تو بہروز نے دل ہی دل میں طے کیا کہ وہ اسے سب بتادیں گے ویسے بھی اب مومنہ کے لیے سب کچھ جاننا بے حد ضروری ہوگیا تھا۔

"بیٹا...... مختیار نے میرے برے وقت میں میرا بہت ساتھ دیا تھا، مجھے مشکل وقت سے نکالا تھا اور میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا میں نے مختیار کے سہارے سب کردیا۔" بہروز نے کچھ کہنے کے لیے تمہید باندھی تو مومنہ الجھی۔

"آپ نے ایسا کیا کردیا تھا ابو؟"

"میں نے تمہیں کہا تھا کہ کپڑے ایسے ہی نہ رکھ دینا استری کرکے رکھنا تم پھر سب وہیں چھوڑ کر یہاں باپ کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گئی ہو۔" بہروز کے کچھ کہنے سے پہلے ہی عالیہ کی گرجدار آواز پر مومنہ کانپ کر رہ گئی۔ بہروز بھی محتاط ہوگئے تھے۔

"وہ...... امی میں کرنے ہی لگی تھی، سوچا پہلے ابو سے پوچھ لوں انہیں چائے وغیرہ تو نہیں چاہیے۔" مومنہ سر

جھکائے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

"کام چوری کے بہانے تو خوب ہیں تمہارے پاس۔" عالیہ نے غصہ سے کہا۔

"کیوں خوامخواہ چلا رہی ہو؟" بہروز نے مومنہ کے شرمندہ اور جھکے سر کی طرف دیکھتے ہوئے اکتاتے ہوئے انداز میں کہا۔

"دیکھیں بہروز جب میں اسے کوئی کام کہوں تو اسے کرنے دیا کریں اپنے پاس نہ بٹھالیا کریں۔" مومنہ بنا کچھ کہے کمرے سے چلی گئی، حسب عادت عالیہ نے تیکھے انداز میں بہروز کو گھورا۔

"لڑکی ذات ہے کل کو اگلے گھر جائے گی، ایسے کام چوری کرے گی تو لوگ تو ماں کو ہی برا بھلا کہیں گے ناں کہ کوئی کام سکھا کر نہیں بھیجا۔" عالیہ بولی تو بہروز نے اب خاموشی اختیار کرلی تھی۔

"کتنا کہا تھا میں نے کہ مختیار بھائی سے بات کریں کہ فرحان اور مومنہ کی شادی ہوجائے، میری بچی انگلینڈ پہنچ جاتی اور کچھ نہ سہی یہ گھر کے کاموں سے تو چھٹکارا ملے گا اسے لیکن نہیں...... آپ کہاں میری کوئی بات سنتے ہیں۔" کمرے کی ادھر ادھر بکھری چیزوں کو اٹھاتے ہوئے عالیہ ترش لہجے میں بول رہی تھیں۔

"یہ نصیبوں کی باتیں ہیں عالیہ۔ میں نے اپنے منہ سے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا اور میری بچی جس گھر میں جائے گی وہاں اسے مہارانیوں کی طرح رکھا جائے گا۔" بہروز نے کہا۔

"ہاں جب بات میری بیٹی کی آئی تو آپ کو مناسب نہیں لگا لیکن جب بات آپ کی......"

"عالیہ بیگم بس...... تم کچھ زیادہ ہی بولنے لگی ہو۔ جاؤ یہاں سے میری طبیعت خراب ہے۔ مجھے اب آرام کرنا ہے۔" ان کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ بہروز نے غصے میں انہیں مزید کوئی بات کہنے سے روکا۔ عالیہ نے منہ بگاڑ کر بہروز کو دیکھا۔

"ہاں اب طبیعت خراب ہی ہوگی ناں۔"

"عالیہ تم جاؤ اب۔" بہروز نے غصے سے کہا اور عالیہ پیر پٹختی کمرے سے باہر نکل گئی۔

"بے وقوف عورت۔" بہروز نے خود کلامی کی اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔ کچھ دیر بعد بے چینی دل میں بڑھنے لگی تو بہروز اٹھ بیٹھے۔ پاس رکھا پانی کا گلاس اٹھا کر خشک حلق تر کیا اور مختیار کا نمبر ملانے لگے۔

***

ایان اسے بستر میں لٹا کر امینہ کے ہاتھ سوپ بھجوا کر آرام کی تاکید کرکے چلا گیا تھا، یہ لمحات اس کی زندگی کے مشکل ترین تھے، اس کے لیے یہ سب برداشت کرنا انتہائی کٹھن تھا، سلیمہ کی معمولی ڈانٹ یا کسی بات پر سرزنش کا یہ انداز اس کے لیے انتہائی جان لیوا تھا۔

"تمہیں اب تک سمجھ جانا چاہیے کہ خالہ جان کی عادتیں کس طرح کی ہیں۔" اہل کی دلاسا دیتی آواز پر ریان جو بازو آنکھوں پر رکھے لیٹا تھا ایک دم بازو ہٹا کر اہل کو دیکھنے لگا۔

"اہل بجو...... امی اپنی ساری عادتیں مجھ پر ہی کیوں آزماتی ہیں؟" ریان منہ بسور کر پوچھنے لگا تھا۔

"اس لیے کہ تم سب سے چھوٹے ہو۔" اہل نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"چھوٹے ہونے کا مجھے تو اچھا خاصہ نقصان ہو رہا ہے۔" ریان کی شکائتیں کم نہ ہو رہی تھیں۔

"اسی لیے کہتی ہوں کہ رانی کو لے آؤ تاکہ تم بھی بڑوں میں آجاؤ اور خالہ جان کی ڈانٹ سے بچ سکو۔" اہل نے شرارتی انداز میں کہا تھا۔

"اہل بجو اب ایسی بھی کوئی مجبوری نہیں کہ وقت سے پہلے ہی رانی کو لے آؤں۔" ریان نے اپنا موڈ ٹھیک کرتے ہوئے کہا تھا۔

"خالہ جان کی باتوں کا برا نہ منایا کرو۔ وہ دل کی بری نہیں ہیں بس ان کی مرضی کے خلاف کچھ ہوجائے تو ان سے برداشت نہیں ہوتا۔"

"اہل بجو ہر تلخ بات کرنے والا دل کا اچھا ہی ہوتا

ہے۔ کاش وہ دل کا تھوڑا برا ہو لیا کرے لیکن زبان پر قابو رکھا کرے تاکہ ان کے دل کی اچھائی کسی انسان کو بھی نظر آسکے۔“ ریان نے تاسف بھرے لہجے میں کہا تھا۔

”تم ایسے ہی خالہ جان کی باتوں کو دل پر لے لیتے ہو۔ حالانکہ......“

”امل بجو اپنی ساس کی طرف داری ذرا کم کیا کریں، بیٹھے بیٹھائے اسٹار پلس کی بہو لگنے لگتی ہیں۔“ ریان نے امل کو تنگ کیا تو امل نے خشمگین نظروں سے اسے گھورا۔ امل کے منہ بسورنے پر ریان نے قہقہہ لگایا تھا لیکن اب کہیں کچھ بھی نا تھا۔ نہ امل کے شرارتی دلاسے نا ریان کے قہقہے۔

ارمان اور امل کی جدائی ایک ایسا ڈراونا خواب لگ رہا تھا جو اس کے وجود کی ہر سانس کو تنگ کر گیا تھا۔ آناً فاناً اس کی دنیا تہس نہس ہو گئی تھی، کتنے دن گزر گئے اس کے پاس کوئی حساب کتاب نہیں تھا، کتنی راتیں بیت چکی تھیں ریان انگلیوں پر کوئی گنتی نہیں کر پا رہا تھا۔ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اسے اپنا ذہن ماؤف ہوتا محسوس ہو رہا تھا، ایک انجانی سی بے چینی پورے بدن میں سرایت کر کے اس کی بے کلی میں اضافہ کر گئی تھی۔ اسے کچھ یاد نہ آرہا تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اپنا آپ بے معنی اور فالتو محسوس ہوا تو ایک لمحے میں اس نے اتنی سختی سے آنکھوں کو بند کیا کہ اس کی کنپٹیوں کی رگیں ابھرنے لگی تھیں۔ صحیح معنوں میں اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اگلے پل وہ اٹھ بیٹھا لیکن پھر لیٹ گیا، کھلی آنکھوں سے چھت کو گھورتے ہوئے اس کی سوچیں سلیمہ بیگم کے رویے کے گرد ہی گھوم رہی تھیں۔

”امی میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ ارمان بھائی اور امل بجو کے اس طرح چلے جانے سے اگر کسی کے حصے میں خسارے آئے ہیں تو وہ صرف میں ہوں، ارمان بھائی کے جانے سے اگر کسی کو نقصان ہوا ہے تو وہ بھی میں ہی ہوں، آپ نے تو صرف بیٹا کھویا ہے لیکن امی آپ کے ریان کی تو دنیا ہی اجڑ گئی، وہی تو تھے جنہوں نے مجھے اپنی محبت کی ڈور سے باندھ رکھا تھا، امل بجو اور ارمان بھائی ہی تو تھے جنہوں نے مجھے سنبھالا ہوا تھا۔“ چھت کو گھورتے ہوئے ریان مسلسل خود کلامی میں مصروف تھا۔ کافی دیر وہ یوں ہی لیٹے لیٹے تھکنے لگا تھا۔ اسے ایسے سہارے (جنہیں لوگ بیساکھیاں کہتے ہیں) کے ساتھ چلنے کی عادت نہیں تھی اور کسی سہارے کے لیے کسی کو آواز دینا اسے منظور نہیں تھا، ریان نے خود ہی ہمت کر کے اپنے سہارے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور آہستہ آہستہ چلتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

ڈرائنگ روم کے دروازے کے باہر کھڑا ریان اندر جانے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا۔ اس کو چلنے کے لیے سہاروں کی محتاجی ایک انجانی سی شرمندگی اور اداسی میں گھیرے ہوئے تھی۔ وہ جانتا تھا کمرے میں سب موجود ہیں۔

”امی آپ کیوں ایسے کر رہی ہیں؟“ ایان کی آواز پر ریان رک گیا تھا۔ اسے اندازہ ہونے لگا کہ اندر کوئی بحث جاری ہے۔

”ایان بھائی ممانی جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، بہتر ہوگا ابھی آپ کوئی بات نہ کریں۔“ فوزیہ کی آواز میں کچھ تلخی اور کچھ مکاری کی جھلک باہر کھڑے ریان نے بھی محسوس کر لی تھی۔

”امی آپ ایسا کر کے اپنے لیے اور ہم سب کے لیے مشکل پیدا کر رہی ہیں۔“ ایان نے فوزیہ کی تنبیہ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ باہر سہاروں کے بل پر اپنے بوجھ کو تھامے کھڑا ریان سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔

”ایان بیٹا جانتے ہو کہ امی کی طبیعت خراب ہے تو کیوں اس وقت بحث میں پڑے ہو۔“ مختیار صاحب بار بار کسی کی کال کو کاٹتے ہوئے بولے۔

”ابو امی کی طبیعت ان کی اپنی ضد کی وجہ سے خراب ہے۔“ ایان نے سلیمہ کی طبیعت کی طرف سے لاپروائی برتتے ہوئے کہا۔ تو سلیمہ بیگم نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہاں میں تو ہوں ہی ضدی، بددماغ، ناسمجھ۔" سلیمہ کی غصیلی طنز میں ڈوبی آواز نے ریان کو دلی صدمہ پہنچایا تھا۔

"اللہ کے واسطے امی کیوں ایسی باتیں کررہی ہیں؟ میں نے ایسا کب کہا؟"

"تم نے کہا نہیں لیکن مطلب تو یہی ہے ناں۔" سلیمہ تنک مزاجی سے گویا ہوئیں۔

"خالہ جان ایان کا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"ایک تو مجھے سمجھ میں نہیں آتی آج کل کی بیویوں کو شوہروں کی باتوں کے مطلب کیسے سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ وہ بھی ان باتوں کے جو وہ ماں سے کررہے ہوتے ہیں۔" سلیمہ بیگم نے بے حد تلخ انداز میں تمام لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے امینہ کو گھورتے ہوئے کہا تو فوزیہ کی دبی دبی ہنسی پر امینہ نے لب بھینچ لیے۔

"مختیار صاحب یہ آپ کس کا فون بار بار کاٹ رہے ہیں؟" سلیمہ نے مختیار کو مخاطب کیا تو لہجے میں وہی تلخی اور غصہ تھا۔

"وہ بہروز کال کررہا ہے لیکن میں بعد میں بات کرلوں گا۔" مختیار صاحب نے کہا تو اسی وقت دروازہ کھول کر ریان کمرے میں داخل ہوا۔

"امی......" ریان نے سلیمہ بیگم کو پکارا۔ سب نے پلٹ کر دروازے کی جانب دیکھا۔ فرحان ایک دم اٹھ کر ریان کی طرف بڑھا اور اسے سہارا دے کر اندر لایا۔

"امی۔" ریان فرحان کا ہاتھ پکڑے سلیمہ کی طرف بڑھا۔ اپنی حالت کی پروا نہ کرتے ہوئے انتہائی مشکل سے سلیمہ کے ساتھ والے صوفہ پر بیٹھ گیا۔

"ریان تم یہاں کیوں آئے ہو؟ تمہیں ڈاکٹر نے آرام کا کہا تھا ناں۔" سلیمہ کے غصے اور ریان کی ذہنی حالت کے پیش نظر ایان نے متفکرانہ لہجے میں اسے کہا، ایان کی فکر مندی پر سلیمہ نے کڑی نظروں سے ایان کو دیکھا۔

"امی آپ مجھ سے کیوں اتنی ناراض ہوگئی ہیں؟ کیوں مجھ سے آپ کو اتنی شکایت ہوگئی ہے کہ آپ میرا حال تک پوچھنے کی بھی روادار نہیں رہیں؟" ریان نے ایان کی تاکید کو نظرانداز کرتے ہوئے سلیمہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ سلیمہ اسی طرح منہ بسورے غصے میں بیٹھی پہلو بدل گئیں لیکن اسے کوئی جواب نہ دیا۔

"امی۔" ریان نے سلیمہ کا ہاتھ پکڑنا چاہا جسے سلیمہ نے جھٹک دیا۔

"امی میں نے بھی تو بہت کچھ کھو دیا ہے۔ میرا یقین کریں امی اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا، ایکسیڈینٹ میری غلطی سے نہیں ہوا تھا امی۔ میں نے تو سب کچھ بچانے کی کوشش کی تھی۔" ریان آنسوؤں کے ساتھ سلیمہ کے سامنے بیٹھا اپنی بے گناہی کی صفائی پیش کررہا تھا لیکن نہ جانے کیوں سلیمہ بیگم کا دل پتھر کا ہوگیا تھا۔

"امی ریان کو جواب تو دیں۔ ایسے کیوں کررہی ہیں آپ؟" ایان اب ارمان کی طرح ریان کی ڈھال بنا ہوا تھا۔ سلیمہ کے کرخت رویے کے ساتھ وہ چاہتا تھا کہ ریان اس وقت ارمان کی کمی نہ محسوس کرے۔ ایان کے بولنے پر سلیمہ نے غصے سے اسے دیکھتے ہوئے ریان کے غمزدہ چہرے کی طرف دیکھا۔

"امی بات کریں ناں مجھ سے، کیوں اتنی بدگمان ہوگئی ہیں آپ مجھ سے؟" ریان کی آواز بھیگنے لگی، اس کی حالت اور گھگھیائی آواز پر امینہ کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے، ایان اٹھ کر اس کے پاس آیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اسے تسلی دینے لگا لیکن سلیمہ بیگم مسلسل خاموش بیٹھی رہی تھیں۔

"امی بولیں ناں...... کیا صرف ارمان بھائی کے جانے کا دکھ ہے آپ کو۔" ریان باقاعدہ آنسو بہانے لگا تھا۔

"جاؤ تم اپنے کمرے میں اور آرام کرو۔" سلیمہ نے اس کے ہاتھ ایک بار پھر جھٹکتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا۔

"لیکن کیوں امی...... کیا میری تکلیف آپ کو نظر نہیں

آرہی؟ کیا میں......''

''ہاں نہیں نظر آرہی، تم سے میں نے کہا تھا تم ابھی گاڑی نا لو نا چلاؤ لیکن تم نے میری بات نہیں مانی، اپنی مرضی کی اور تمہاری اس من مانی نے میرے ارمان کا گھر ہی ختم کردیا۔'' سلیمہ بیگم آگ بگولہ ہوئیں وہاں موجود سب کو حیرت ہوئی تھی۔

''امی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' ریان شاکڈ رہ گیا تو ایان بولا۔

''وہی کہہ رہی ہوں جو سچ ہے، اسی نے اپنی ضد اور من مانی کی وجہ سے اس کے گھر کا شیرازہ بکھیر دیا ہے۔'' سلیمہ بیگم کب سے بھری بیٹھی تھیں، ریان کے دھواں دھواں چہرے پر پھیلے دکھ کو نظر انداز کرتے ہوئے انتہائی سفاکی سے گویا تھیں۔

''امی یہ سچ نہیں ہے، اللہ کا واسطہ ہے ایسی باتیں نہ کریں۔'' ریان گنگ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا، ایان نے تیزی سے انہیں چپ رہنے کا کہا جبکہ ریان کی زبان اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔

''یہی سچ ہے اور یہی حقیقت، اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے......''

''امی ارمان بھائی کی طرح میں بھی تو آپ کا بیٹا ہوں۔ میں بھی تو......''

''نہیں ہو تم میرے بیٹے۔'' سلیمہ بیگم کے الفاظ تھے گویا کوئی دھماکہ ہوا تھا۔ کمرے میں موجود ہر شخص کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مختیار صاحب ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔

''سلیمہ بیگم نہیں......'' مختیار نے سلیمہ کو مزید کچھ بھی کہنے سے روکا جبکہ ریان کے ساتھ ساتھ ایان، فرحان، اینہ اور فوزیہ متعجب نظروں سے سلیمہ بیگم کے اس روپ کو دیکھ رہی تھیں جس کو آج سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

''کیا نہیں؟ میرا جوان جہان بیٹا مارا گیا اور آپ...... ابھی کے ابھی کریں فون بہروز کو اور اس کے ساتھ حساب کتاب برابر کریں اور کہیں اس سے کہ اپنا بیٹا واپس لے لے۔'' سلیمہ بیگم نے وہ کہہ دیا جو کبھی کسی کے وہم و گماں میں بھی نہ تھا۔ ریان یک ٹک انہیں دیکھتا رہا، ایان اور فرحان کی حیرت بھی سوا نیزے پر تھی۔

''ا......ا......امی...... یہ کیا کہہ رہی ہیں؟'' ایان نے ریان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اسے اپنے ساتھ کا یقین دلاتے ہوئے سلیمہ بیگم سے پوچھا۔

''وہی جو سچ ہے۔ یہ بدلہ دیا ہمارے احسان کا۔'' سلیمہ نے سفاکی اور بے دردی کی ساری حدیں پار کردی تھیں۔

''لیکن امی......'' ریان کے پاس اب کہنے کو ایک لفظ نہ تھا، ایان نے اس کی جگہ سلیمہ سے پوچھا۔

''سلیمہ بیگم...... ساری محنت مٹی میں ملا دی۔'' مختیار صاحب افسوس ناک لہجے میں بولے۔ ریان نے آبدیدہ نظروں سے مختیار کو دیکھا انہوں نے نظریں جھکا دیں۔

''ارمان کے سارے رشتے اور بھرم ختم ہو گئے، وہ تھا تو اس نے سب کچھ سمیٹا ہوا تھا، اپنے ساتھ وہ اس گھر کی خوشیوں کو بھی لے گیا۔'' مختیار مدھم آواز میں انتہائی دکھ سے بولے تو سب نے ان کی طرف دیکھا۔ سلیمہ بیگم غصے سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔ مختیار نے صوفہ کی پشت سے سر ٹیک دیا۔ ایان اور فرحان ریان کے دائیں بائیں بیٹھے اسے یقین دلانے لگے کہ کوئی کچھ بھی کہے وہ ایک ہیں لیکن الفاظ کسی کے پاس نہیں تھے۔ ایک مکمل اور جان لیوا خاموشی نے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

❁......❁......❁......❁
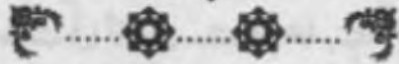
۵ دسمبر ۲۰۱۳

میری دوست جان

دیکھو اب پھر موسم بدلنے لگا ہے، پھر خزاں آرہی ہے اور پھر وہی سرد شامیں اور دھند میں لپٹی شامیں آن پہنچی ہیں، وہی دھڑکنوں کو منجمد کردینے والی یخ بستہ ہوائیں اور پھر وہی تم سے دوری۔ کیسی بے بسی ہے سوما کہ میں ابھی تک اس مقام تک نہیں پہنچ سکا جہاں میں اس قابل ہو جاؤں کہ تم سے تمہیں مانگ سکوں۔ ابھی تک میں اپنے

آپ کو اس قابل نہیں بنا سکا کہ گھر والوں سے اپنی کوئی بات منوا سکوں، انہیں یہ بتا سکوں کہ میری زندگی میں کوئی ہے، کوئی ایسا جو مجھے زندگی کا احساس دلاتا ہے، کیوں ہے ایسا سوما؟ کیوں مجھے ہمیشہ غلط سمجھا جاتا ہے؟

۵ دسمبر ۲۰۱۳

تم بہت پاگل ہو، خوامخواہ اپنے آپ کو کیوں اذیت دیتے ہو؟ کوئی بے بسی نہیں ہے اور تمہیں کس نے کہا میں تم سے دور ہوں؟

تمہاری دوست جان سوما

۵ دسمبر ۲۰۱۳

تم دور ہو سوما۔ ایسے پاس ہونا نہیں ہوتا۔ میں تمہیں دیکھ نہیں سکتا، میں تمہارا ہاتھ پکڑ کر اپنے دل پر نہیں رکھ سکتا، میں تمہیں یہ نہیں بتا سکتا کہ دیکھو میرے دل میں تمہارے لیے کتنی محبت ہے، میں تمہیں یہ نہیں دکھا سکتا کہ اپنوں کے درمیان کیسی تکلیف محسوس کرتا ہوں، کتنے اجنبی ہیں یہ در و دیوار میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔ مجھے تمہارے پاس ہونے کے مطلب کو بدلنا ہے سوما۔

۵ دسمبر ۲۰۱۳

ایسی مایوسی اور اذیت بھری باتوں سے تم نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ مجھے بھی تکلیف پہنچا رہے ہو۔ دیکھو میں یا ہمارا رشتہ احساسات کی ڈوری سے بندھا ہے، تمہارے دل میں جھانکنے کے لیے مجھے تمہارے دل پر ہاتھ رکھنے کی ضرورت ہے نہ تمہارے قریب آنے کی۔ میں سب جانتی ہوں اور تمہاری محبت محسوس کر سکتی ہوں۔ تم اپنی مایوسی سے اپنے لیے تو مشکلیں پیدا کر رہی ہو مجھے بھی بے اعتبار ٹھہرا رہے ہو۔

اب آج کے بعد اگر تم نے ایسی کوئی مایوسی والی باتیں کیں تو..... پھر تم مجھے بھی کھو دو گے۔ بار بار میں تمہیں کہہ چکی ہوں کہ اپنے آپ کو سنبھالو، اس قدر مایوسی اور اداسی تمہیں ذہنی مریض بنا دے گی اور ساتھ مجھے بھی کہیں کا نہیں چھوڑے گی۔ بس اب سمجھو میری بات کو اپنا خیال رکھو۔ پھر بات ہوگی۔

تمہاری دوست جان سوما

اچھی بھلی اس کی زندگی گزر رہی تھی کہ بلال کی ایک کال اور چند جذباتی باتوں کی وجہ سے الجھ کر رہ گئی تھی، وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے، وہ بلال کو کوئی آس نہیں دلانا چاہتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ بلال ایک اچھے خاندان کا چشم و چراغ ہے لیکن وہ اپنے دل کو آمادہ نہیں کر پا رہی تھی کہ بلال کو ایک موقع دینا چاہیے۔ اس کے منع کرنے کے باوجود بلال بار بار اس کے راستے میں آرہا تھا اور منتہا اس کی ہٹ دھرمی پر الجھنے لگی تھی۔ نہ جانے کیوں بلال کی شخصیت میں اس کے لیے کوئی کشش نہیں تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بلال کی پسندیدگی فیملی تک پہنچ کر منتہا پر اس کے بارے میں سوچنے کے لیے دباؤ ڈالا جائے، منتہا کے پاس انکار کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی سوائے اس کے کہ بلال اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود اس کے دل میں یہ خواہش نہ جگا سکا تھا کہ منتہا کو اس کا ساتھ درکار ہو۔

بظاہر وہ بوتیک کے کام میں مگن تھی لیکن اس کی سوچیں بھٹک رہی تھیں، نظریں سامنے کھلے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر تھیں لیکن صاف نظر آرہا تھا کہ وہ دیکھ کہیں اور رہی ہے۔

''کیا میں آپ کی پریشانی کی وجہ جان سکتی ہوں مس منتہا صاحبہ۔'' آواز پر منتہا نے چونک کر دیکھا تو سامنے سلمٰی بیٹھی اسے گھور رہی تھی۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' منتہا نے گہرا سانس خارج کیا اور اسکرین کو اسکرول کرنے لگی۔

''اچھا تو پھر میری بات کا جواب دو۔'' سلمٰی نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

''کون سی بات کا جواب دوں؟'' منتہا نے حیرت سے پوچھا۔

"اسی بات کا جو میں تھوڑی دیر پہلے کر رہی تھی۔" سلمٰی نے اس کے چہرے پر نظریں جما کر کہا۔
"لیکن مجھے تو کوئی آواز نہیں آئی۔" منتہا نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔
"ہاں کیوں کہ آپ جناب کا دماغ کسی اور کے بارے میں سوچ رہا تھا۔" سلمٰی نے کہا تو منتہا نے ٹپٹا کر اسے دیکھا۔
"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں سلمٰی باجی۔" منتہا نے لیپ ٹاپ کو پیچھے سرکاتے ہوئے قدرے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔
"تم جانتی ہو، تم پچھلے کچھ عرصے میں بہت بدل گئی ہو۔" سلمٰی نے بڑی زیرک نظری کا مظاہرہ کیا تو منتہا نے ایک دم اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔
"کیا مطلب سلمٰی باجی کیا میں بدصورت ہوگئی ہوں؟" منتہا نے منہ بسور کر مسخرے پن سے پوچھا۔
"تم جانتی ہو منتہا میں کس بدلاؤ کی بات کر رہی ہوں۔" سلمٰی نے اسی سنجیدگی سے کہا۔
"سلمٰی باجی اب کیا میں ہر وقت اوٹ پٹانگ حرکتیں ہی کرتی رہوں؟" منتہا نے اپنے آپ کو نارمل رکھتے ہوئے پوچھا۔
"اوٹ پٹانگ حرکتیں تو تم نے کبھی بھی نہیں کی تھیں، میں تو اس سنجیدگی اور اکتاہٹ کی بات کر رہی ہوں جو کچھ مہینوں سے تمہاری ذات پر چھائی ہوئی ہے۔" سلمٰی نے یقیناً بہت باریک بینی سے اس کے تاثرات کا جائزہ لیا تھا۔
"نہیں سلمٰی باجی ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" منتہا کو اپنے لہجے کی کھنک کے کھوکھلے پن کا خود بھی احساس ہوا تھا۔
"تم جانتی ہو منتہا لہٰذا تم مجھ سے شیئر کرسکتی ہو۔" منتہا نے اثبات میں سر ہلایا۔
"تو بتاؤ کیا مسئلہ ہے، کوئی پریشانی ہے کیا؟" سلمٰی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بہت ملائمت سے پوچھا۔ منتہا نے

نفی میں سر ہلایا۔
"تو پھر اس اچانک تبدیلی کی کیا وجہ ہے؟ تم ایسی نہ تھی، ہر دم ہنسنے ہنسانے والی منتہا تو تم لگتی ہی نہیں ہو۔" سلمٰی کے انداز میں اس کے لیے فکر کے ساتھ ساتھ تجسس بھی تھا۔
"آپ کچھ زیادہ ہی حساس ہو رہی ہیں سلمٰی باجی۔ میں نے تو کام کی وجہ سے باقی ایکٹیویٹیز کو روکا ہوا ہے اور آپ کیا سے کیا سمجھ رہی ہیں۔" منتہا نے سلمٰی سے زیادہ اپنے آپ کو تسلی دی۔ سلمٰی کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔
"تم بلال کی وجہ سے پریشان ہو ناں؟" سلمٰی نے پوچھنے سے زیادہ اسے بتایا۔
"ہاں بھی اور نہیں بھی۔" منتہا نے جھوٹ بولنا مناسب نہ سمجھا۔ "میں اپنے آپ کو اس کی طرف مائل نہیں کر پا رہی اور وہ مسلسل اسی کوشش میں ہے کہ میں اس سے متاثر ہو جاؤں۔" منتہا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سچائی بیان کی۔
"کیوں...... کیا تمہارا معیار بہت بلند ہے؟" سلمٰی اسی سنجیدگی سے استفسار کیا۔
"نہیں سلمٰی باجی ایسی بات نہیں ہے۔ میں تو بہت عام سی سوچ رکھنے والی بہت عام سی لڑکی ہوں۔ تو میرا معیار کیسے بلند ہو سکتا ہے۔"
"پھر انکار کی کیا وجہ ہے؟"
"میں نہیں جانتی۔" منتہا نے سر جھکا کر کہا۔
"کیا تم کہیں اور...... میرا مطلب ہے کیا کسی کو پسند کرتی ہو؟"
"میں نہیں جانتی۔"
"اب یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تم کسی کو پسند کرتی ہو تو تمہیں تو معلوم ہوگا ناں؟" سلمٰی نے حیرانی سے پوچھا۔
"میں نہیں جانتی سلمٰی باجی۔" منتہا نے بہ مشکل اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پایا۔
"کسی کا انتظار کر رہی ہو؟"
"سلمٰی باجی اب میں نے ایسا کب کہا؟" نا چاہتے ہوئے بھی منتہا کا لہجہ اونچا ہو گیا۔
"ایسا بھی نہیں، ویسا بھی نہیں، ایسا نہیں کہا، ایسا ہے بھی نہیں تو پھر بلال میں کیا خرابی ہے؟" سلمٰی نے غصے سے پوچھا۔
"یار تسلمٰی باجی ایک تو مجھے سمجھ میں نہیں آتی کسی کو پسند نہ کرنے کا یہ مطلب کب ہوتا ہے کہ اس میں کوئی خرابی ہی ہوگی؟ ہم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ کبھی کبھی اچھے لوگ بھی اتنے اچھے نہیں لگتے کہ ان سے شادی کر لی جائے۔" منتہا نے تیکھے لہجے میں کہا۔
"دیکھو منتہا پہلی بات تو یہ کہ تم اتنی سنجیدگی کے ساتھ جھنجلائی ہوئی بالکل بھی اپنی منتہا نہیں لگتی۔" سلمٰی نے رسان سے کہنا شروع کیا۔
"دوسری بات اگر تم کہیں اور انوالو نہیں ہو تو بلال کو جاننے میں کیا حرج ہے؟ وہ ایک شریف اور اچھا لڑکا ہے۔ تم نے اگلے دو تین سال میں کسی نہ کسی سے شادی تو کرنی ہی ہے ناں؟ بلال کو جاننے اور سمجھنے کا موقع بھی مل رہا ہے تو......"
"سلمٰی باجی......" منتہا نے ایک دم اس کی بات کاٹی۔
"بلال کو جاننے اور کوئی بھی موقع دینا میرے بس میں نہیں ہے۔ پہلی بات یہ کہ میرے اور بلال کے ذہن نہیں ملتے، میں اس سے کوئی بات نہیں کر پاتی ہوں، اس کی موجودگی مجھے کوئی خوشی نہیں دیتی، میں اگر کہوں کہ اس کے آس پاس ہونے سے میں اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتی تو غلط نہ ہوگا۔"
"وہ ایک انتہائی شریف بندہ ہے۔" سلمٰی چلا اٹھی۔
"میں نے اس کی شرافت پر کوئی انگلی نہیں اٹھائی، میں اپنے دل کی بات کر رہی ہوں۔" منتہا نے صاف گوئی سے کام لیا۔
"اور دوسری بات میں اگر آج اسے بات کرنے کا موقع دیتی ہوں، ایک منٹ کے لیے آپ کی بات مان کر اسے کوئی بھی اختیار دے دیتی ہوں اور اگر اس کے باوجود وہ مجھے اس انداز سے نہیں پسند آتا ہے کہ میں اس سے

شادی کرلوں تو آپ کو نہیں لگتا یہ زیادتی ہوگی؟ کہ ایک انسان کو میں نے یہ آس دلائی اور آخر میں کہہ دیا کہ نہیں تم سے میری کوئی ذہنی مطابقت نہیں ہے، میں تو صرف تمہیں چیک کررہی تھی، میں تم سے شادی نہیں کرسکتی؟'' منتہا بولنے پر آئی تو بولتی ہی چلی گئی۔

''اُف خدایا...... منتہا تم بہت زیادہ سوچ رہی ہو، اگر تم اپنے دل ودماغ کی یہ گرہ کھول کر بلال کو سمجھنے کی کوشش کروگی تو مجھے پورا یقین ہے کہ وہ تمہیں پسند آئے گا۔''

''اور اگر نہ آیا تو...... اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟'' منتہا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ایسا نہیں ہوگا۔ میں تمہیں بھی جانتی ہوں اور بلال کو بھی۔'' سلمٰی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم اسے ایک موقع تو دو۔ اگر وہ بار بار تم سے بات کرنے کی کوشش کررہا ہے تو ایک بار اس سے تفصیلی بات کرلو۔'' سلمٰی نے خاموش بیٹھی منتہا سے پھر کہا۔

''لیکن میں کسی کا دل نہیں توڑنا چاہتی۔'' منتہا نے مدھم آواز میں کہا۔

''ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔'' سلمٰی کے اصرار پر منتہا نے اسے دیکھا اور لب بھینچ لیے۔

سلمٰی کافی دیر اسے قائل کرتی رہی، منتہا کے پاس کوئی ایسا جواز نہ تھا جس کی بنا پر وہ سلمٰی کے سامنے مزید انکار کر سکتی، وہ جانتی تھی کہ سمیع اللہ اور خدیجہ بھی اب اسی کوشش میں ہیں کہ کسی اچھے گھرانے میں منتہا کی بات طے ہو جائے۔ منتہا یہ بھی جانتی تھی کہ سلمٰی، بلال کی وکیل بن کر آئی ہے۔ منتہا کو فی الحال خاموش ہی ہونا پڑا اور سلمٰی اس کی خاموشی کو اس کا اقرار سمجھ کر خوش ہوگئی لیکن یہ صرف منتہا جانتی تھی کہ اس کی خاموشی کا مطلب انکار ہی ہے۔

......
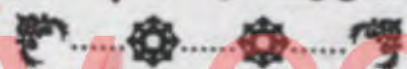
شب کے سناٹوں سے ڈر کے سوئے
خواب، خواب سے لپٹ کے روئے
ہزار دکھ سہے جاں پر لیکن
دل نے کبھی اپنے حوصلے نہ کھوئے

تیرے ہجر نے ہم کو مار دیا
تیرے وصل کو ہم بہت روئے
شام سے رستہ تکتے رہے تیرا
آنکھ کے جگنو رات بھر نہیں سوئے

نیند سے بوجھل اداس آنکھیں، سوچوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا انتظار اور انتظار میں پتھرائی آنکھیں راہ تکتے تکتے اب مایوسیوں میں گھرنے لگی تھیں۔ راستوں پر بچھی پلکوں پر آنسوؤں کے موتی چمک رہے تھے۔ پلکوں کو میچے اذیتوں کو سہتے لب کپکپانے لگے تھے۔ دکھ کی اذیت کو سمجھنے کے لیے دکھ کی دلدل میں اترنا پڑتا ہے، جب آزاد ہونے کے باوجود دل ودماغ چیخ چیخ کر رہائی مانگ رہے ہوں، روح یادوں کے انبار تلے دب کر سسک رہی ہو اور تم بے بسی کے آہنی شکنجے میں جکڑے جاچکے ہو، جب آنسو نا آنکھ سے نکل سکیں نا حلق سے اتر سکیں، تم کچھ کہہ نا پاؤ، نا تم میں کچھ سہنے کی سکت ہو، تم ضبط کے آخری مرحلے پر ہو، تم سمجھ نا پاؤ کہ اس لمحے موت مانگی جائے یا زندگی۔ تم اس دکھ کے عذاب کو سمجھ ہی نہیں پاؤ گے، تم جان ہی نہیں پاؤ گے۔ تم دل سے اٹھتی ٹیسوں سے بے خبر ہو تم دکھ کی اذیت کو کیسے سمجھو گے؟ کوئی جان سے پیارا بچھڑ گیا، شاید ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا ہے، تم تکلیف سے تڑپ رہے ہو، تمہارے اپنے تمہارے سامنے ہیں لیکن تم مدد کے لیے ہاتھ نہیں بڑھا سکتے ہو، تم ایک تماشا ہو اور ساری دنیا تماشائی بنادی جائے۔ تم کیسے اندازہ کرسکو گے؟ کیسے سمجھ سکو گے اس دکھ کی گہرائی کو؟ سب سہہ کر کھوکھلے باطن کے ساتھ زندہ رہنے کی تکلیف سے تم انجان ہو۔ کاش تم جان سکتے۔ کاش تمہیں معلوم ہوتا...... اس اذیت، اس بے بسی کا اندازہ ہوتا۔

ان آنکھوں سے بہتے آنسو کہاں گر رہے تھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ خبر تھی تو بس یہ کہ رات اندھیری تھی اور روشنی کی کوئی کرن کہیں پھوٹتی دکھائی نہ دے رہی تھی۔

......

''ابو کیا ہوا ہے؟'' بہروز کے چہرے پر پریشانی کی

لکیروں میں اضافہ ہوگیا تھا۔ مومنہ اپنا کام نپٹا کر کمرے میں داخل ہوئی تو بہروز کی زرد رنگت اور پریشان حال چہرے کو دیکھتے ہی ان کی طرف لپکی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ابو؟" مومنہ ایک دم گھبرائی۔

"ہاں بیٹا ٹھیک ہوں۔" بہروز نے ہاتھ میں پکڑا موبائل ایک طرف رکھا اور زبردستی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے اسے تسلی دی۔

"آپ ٹھیک لگ تو نہیں رہے ہیں ابو۔ کس کو کال کررہے تھے؟" مومنہ کو اندازہ ہوگیا تھا کہ کسی کو کال کررہے تھے۔

"مختیار کو۔" وہ مختصراً بولے۔

"اچھا تو کیا کہا مختیار چچا نے، ریان بھائی کیسے ہیں؟" مومنہ نے پوچھا۔

"میری بات نہیں ہوسکی۔ شاید وہ مصروف ہوں بار بار کال کاٹ رہا تھا۔" بہروز کے لہجے کی بیزاری سے صاف ظاہر تھا کہ کچھ ایسا ضرور ہوا ہے جو نا قابل برداشت تھا۔

"تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ جب وہ فارغ ہوں گے تو خود کال کرلیں گے۔" مومنہ نے انہیں تسلی دی۔ بہروز نے بنا کچھ کہے اثبات میں سر ہلایا۔

"اسے کہیں اپنا بیٹا واپس لے لے۔" آواز تھی کہ کوئی پگھلا ہوا سیسہ کانوں میں انڈیل دیا گیا تھا۔ نہ جانے کیسے بار بار کال کاٹنے کے بعد فون آن ہوا تھا، غیر ارادی طور پر یا جان بوجھ کر فون کو آن کیا تھا بہروز جان نہ سکے لیکن دوسری طرف سے آتی آوازوں نے بہروز کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے؟ وہ جان نہ سکے کہ ریان کی اس لمحے کیا حالت ہوئی ہوگی۔ بے چینی، پریشانی اور ایک انہونی کا احساس غالب آنے لگا تھا۔

⁂ ⁂ ⁂

گہری نیند میں اس کی آنکھ مسلسل بجتے موبائل سے کھلی تھی لیکن اس نے فون بند کر کے کروٹ بدل لی تھی۔ بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی کے بعد تھکاوٹ سے نڈھال تھا اور نیند کا ایسا غلبہ طاری تھا کہ وہ جو کبھی کال کرنے والوں کو انتظار نہیں کرواتا تھا اس وقت بے سدھ پڑا تھا۔ کال کرنے والا بھی شاید اس ضد میں تھا کہ آج اس کو جگا کر ہی دم لینا ہے اس لیے کال کیے ہی جارہا تھا۔ جیسے ہی اس کا ذہن جاگا اس پر جھنجلاہٹ سوار ہوئی۔

"یار کوئی وقت ہوتا ہے کال کرنے کا ایسی کیا مصیبت آگئی ہے؟" بند آنکھوں سے اس نے موبائل کان سے لگاتے ہوئے بے بسی سے کہا۔

"بلال صاحب؟" نسوانی آواز پر اس نے ایک دم آنکھیں کھول دیں اور موبائل اسکرین کو دیکھا اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

"منتہا آپ......! خیریت اس وقت کال کررہی ہیں؟" جھنجھلاہٹ کی جگہ ایک انجانی خوشی نے لے لی تھی۔

"جی الحمدللہ سب خیریت ہے، آئی ایم سوری آپ کو ڈسٹرب کیا۔ آپ آرام کریں پھر بات ہوتی ہے۔" منتہا کی سنجیدہ آواز پر وہ حیران ہوا۔

"لیکن میں تو...... میں تو...... جاگ...... مس منتہا...... ہیلو......" وہ کال بند کرچکی تھی اور بلال جو گہری نیند سے جاگا تھا ایک بار پھر سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن ایک بار جو نیند کا سلسلہ ٹوٹا تو دوبارہ نہ جڑ سکا تھا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

درجۂ ایمان

صائمہ شبیر علی

"ہانی...... بنی نہیں ابھی تک چائے؟" امی کی پکار دوبارہ آئی تو اس نے جوش سے انہیں جواب دیا۔

"ابھی لائی امی جی، بس دو منٹ۔"

رمضان کا مہینہ تھا اور ہانیہ عرف ہانی روزے کی حالت میں کچن میں تقریباً دس منٹ سے بکھیڑا اسمیٹ رہی تھی، چولہا نہایت گندا ہو رہا تھا، جس پر سالن اور چائے کے جابجا داغ تھے۔ آئی تو وہ کچن میں چائے بنانے تھی لیکن اس کی نفاست پسند طبیعت کچن کا حال دیکھ کر چکرا گئی تھی۔ پہلے اس نے چولہا صاف کیا اور چائے کا پانی چولہے پر چڑھا کر کچن کی بقیہ صفائی میں مصروف ہو گئی تھی۔

"اف اللہ...... اس موٹی مریم کو صرف کھانے پکانے کا پتا ہے اور صرف کھانے کا ہی ہوش ہے اب بھی ناشتہ بنایا اور گھس گئی کمرے میں، باورچی خانے کو کباڑ خانہ بنا رکھا ہے۔" وہ کپوں میں چائے انڈیلتے ہوئے مریم کو دل ہی دل میں برا بھلا کہہ رہی تھی۔ مریم ہانیہ سے چھوٹی تھی اور اسے ہر وقت کھانے کی فکر ستائے رہتی تھی۔ اس لیے وہ روزے بھی نہیں رکھتی تھی، ایک روزے میں ہی اس کی جان لبوں پر آ جاتی تھی۔

....

اکمل صاحب کا سارا گھرانہ بہت مذہبی تھا، چھوٹے بڑے سب صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے، ہانیہ اور مریم دو ہی بیٹیاں تھیں۔ آج پانچواں روزہ تھا اور اکمل صاحب دوسرے روزے کو ہی کپڑا خریدنے کے لیے ملتان چلے گئے تھے اس لیے مریم نے باپ کے ڈر سے تو ایک روزہ رکھ لیا تھا لیکن اس کے بعد اس سے رکھا نہ گیا اور دوسرا اس نے باپ کی غیر موجودگی کا بھی بھرپور فائدہ اٹھایا جبکہ امی اور دادی کی ڈانٹ کو وہ خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ وہ ہانیہ

سے بالکل مختلف تھی۔
امی سے ملنے دو خواتین آئی تھیں جنہیں وہ آنٹی کہتی تھی، مریم اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب پتا چلا کہ وہ بغیر روزے کے تھیں۔ امی نے ہانیہ کو ان کے لیے چائے بنانے کا کہا تھا وہ چائے بنا کر لائی تو چاروں خواتین (امی، دادی اور دو ہمسائی آنٹیاں) شاید کسی کی غیبت کررہی تھیں۔
''اف...... خواتین کا پسندیدہ مشغلہ۔'' ہانیہ نے لمبی سانس لی اور چائے سرو کرنے کے بعد خالی ٹرے کچن میں واپس رکھ کر وضو کیا اور کمرے میں آکر قرآن پاک کی تلاوت کرنے لگی، تقریباً ایک گھنٹے بعد اس نے قرآن پاک بند کرکے رکھا اور کمرے سے باہر آئی تو وہ دونوں خواتین جا چکی تھیں اور اب امی اور دادی دونوں جانے والی خواتین کی برائیاں کررہی تھیں۔
''دیکھا اماں، کیسی ہٹی کٹی ہیں دونوں نند بھاوج لیکن روزہ ایک بھی نہیں رکھتیں اور......'' امی اور نہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھیں وہ چپ چاپ واپس اپنے کمرے میں آگئی۔ تھوڑی دیر پہلے جن خواتین کی ہاں میں ہاں ملائی جارہی تھی اب ان کے ساتھ مل کر گلی محلے کی دوسری عورتوں کی غیبت کی جارہی تھی۔
یوں تو رمضان المبارک کے بابرکت مہینے میں شیاطین قید کردیئے جاتے ہیں لیکن اس ماہ مبارک میں انسانوں کی اصلیت کھل کر سامنے آجاتی ہے اور وہ اصلیت شیطان سے بھی زیادہ بھیانک ہوتی ہے۔ وہ سوچتی رہی اور دماغ پھٹتا رہا تھا۔
''جتنے گھنٹے امی اور دادی نے دوسروں کی غیبت کرکے ان کے گناہ جھڑوانے میں صرف کیے ہیں اتنی دیر میں اگر وہ اللہ کی عبادت ہی کرلیتیں تو روزے کا فرض بھی ادا ہوجاتا، کیا فائدہ ایسے روزے کا جس میں برائی سے نہ بچا جائے، اب پتا نہیں ان کے یہ روزے اللہ کی بارگاہ میں قبول ہوئے بھی ہوں گے یا نہیں؟'' وہ نا جانے کیا کچھ سوچنے لگی پھر خود کو سمجھایا۔
''اف اللہ...... مجھے کیا پتا، وہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ بس اللہ ان کی عبادات قبول فرمائے اور برائیوں سے محفوظ رکھے آمین۔'' وہ دل ہی دل میں افسوس بھی کررہی تھی اور اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے دعا بھی کررہی تھی کہ انہیں راہ ہدایت عطا فرمائے۔

***

آج دادی کا پارہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا اور وہ صبح سے بلی کے تعاقب میں تھیں کیونکہ رات بلی نے کچن میں گھس کر دو لیٹر دودھ کا ستیاناس کردیا تھا۔ دادی جان تسبیح کے دانے گراتی جارہی تھیں اور ساتھ میں بڑبڑاتی بھی جارہی تھیں۔ آخرکار دادی کو چھت پر سے دیوار پر چھلانگ لگاتی بلی نظر آ ہی گئی، وہ جلدی سے اپنا ڈنڈا اٹھا کر چارپائی سے اتریں لیکن پھر کچھ خیال آنے پر ڈنڈا وہیں رکھا اور آواز پیدا کیے بغیر آہستہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی دیوار کے ساتھ جا کھڑی ہوئیں اور جھپٹا مار کر بلی کی دم پکڑ لی، بلی جو گھبرا کر دیوار کی دوسری طرف چھلانگ لگانے ہی والی تھی لیکن ناکام رہی کیونکہ اس کی نازک دم اب دادی کے ہاتھوں میں تھی۔ ہانیہ جو کچن میں افطاری کی تیاری کررہی تھی شور کی آواز پر باہر آئی۔
''اب بتا کہاں جائے گی مجھ سے بچ کر ہاں؟ آج تو میں تیرا قیمہ بنا کر ہی دم لوں گی۔'' دادی غصہ میں لال پیلی ہورہی تھیں۔ وہ بھاگتی ہوئی دادی کے پاس آئی۔
''اف دادی بس کریں، اس بیچاری کا کیا قصور بھلا؟ غلطی تو میری تھی رات میں دودھ فریج میں رکھنا اور کچن کا دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی کچھ کہنا ہے تو مجھے کہیں اس بے زبان کو کیوں مار رہی ہیں آپ، اتنی بے دردی سے؟'' بلی اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی اور میاؤں میاؤں کررہی تھی۔ اسے بلی پر بڑا ترس آرہا تھا۔
''ہاں اتنی ہی تو بے چاری ہے یہ، آئندہ جیسے اسے نصیحت ہوجائے گی ناں اب دوبارہ یہ کچن کا رخ بھی نہیں کرے گی۔'' دادی اب اسے باقاعدہ ڈنڈے سے پیٹ رہی تھیں۔

"دادی جی کیا آپ کو پتا ہے کہ یہ وہی بلی ہے جس نے رات دودھ خراب کیا تھا، آپ نے اسے دیکھا تھوڑی تھا یہ کوئی اور بلی بھی تو ہو سکتی ہے اور اگر یہ وہی والی ہوتی بھی تو اسے کیا معلوم کہ آپ اسے کیوں مار رہی ہیں؟"

ہانیہ نے دادی کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا تو دادی اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے اب پنجرے کی طرف لے جا رہی تھیں۔ اب انہیں سمجھانا فضول تھا اس لیے ہانیہ چپ چاپ دوبارہ چمن میں آ گئی جبکہ دادی نے میاؤں میاؤں کرتی بلی کو پنجرے میں بند کر دیا اور ساتھ میں پنجرے کو تالا بھی لگا دیا تھا گویا انہیں ہانیہ کے ارادوں کی پہلے ہی خبر ہو گئی تھی کہ کہیں وہ پنجرہ کھول کر بلی کو آزاد نا کر دے۔

"دادی پلیز کھول دیں، پنجرہ اور بلی کو جانے دیں اسے بھوک لگی ہوگی۔"

کل عصر کے وقت سے لے کر آج ظہر کا وقت ہونے کو آیا تھا لیکن دادی نے بلی کی سزا کم نہیں کی تھی وہ بیچاری دھوپ میں بھوکی پیاسی تڑپ رہی تھی لیکن دادی کو بالکل بھی رحم نہیں آ رہا تھا جبکہ ہانیہ کی جان پر بنی ہوئی تھی ویسے تو ہانیہ نے دادی سے نظر بچا کر روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے پنجرے کی جالی میں سے بلی کو کھلا دیے تھے اس کے باوجود اسے بلی کی بہت فکر لاحق تھی۔

"جاؤ کھول دو اسے۔" دادی نے ہانیہ کو چابی پکڑاتے ہوئے کہا تو ہانیہ خوشی سے دادی سے لپٹ گئی اور جلدی سے جا کر پنجرے کا تالا کھولا اور روٹی کا آدھا ٹکڑا جو اس نے دوپٹے میں چھپا رکھا تھا بلی کے آگے ڈال دیا جبکہ بلی روٹی کو نظر انداز کرتی ہوئی جان بچی سو لاکھوں پائے کے مصداق بھاگ گئی اور ہانیہ نے سکھ کا سانس لیا۔

❁ ❁ ❁

ایک ایک کر کے سارے روزے گزرتے رہے، وہ بہت خشوع و خضوع کے ساتھ عبادت کرتی اور اللہ سے دعا مانگتی رہتی۔ آج پچیسواں روزہ تھا اور گرمی اپنے جوبن پر تھی، امی کی آج پھر کبریٰ آنٹی سے جھڑپ ہو گئی تھی۔ کبریٰ آنٹی چار یتیم بچوں کی ماں، ایک بیوہ عورت تھیں، امی کو ان سے ناجانے کیوں اللہ واسطے کا بیر تھا، وجہ کچھ خاص نا ہوتی تھی بس جنت بیگم کو بہانا چاہیے ہوتا تھا اور وہ ایسا موقع ہاتھ سے نکلنے ہی نا دیتی تھیں، جبکہ ہانیہ کو اس بیوہ عورت پر ترس آتا تھا جو کبھی کبھی تو امی کی جلی کٹی برداشت کر جاتی اور بعض اوقات اپنی برداشت کا گلا گھونٹ کر دوبدو جواب دیتی تھیں۔

آج بھی وجہ کچھ خاص نہ تھی بات صرف اتنی سی تھی کہ کبریٰ آنٹی کی بکری کھونٹے سے رسی تڑوا کر سیدھی امل کے گھر گھس گئی تھی۔ نقصان تو اس نے کچھ نہیں کیا تھا کیونکہ جنت بیگم کی فوراً اس پر نظر پڑ چکی تھی انہوں نے فوراً اسے بھگایا اور دوبارہ سے اپنے کام میں لگ گئیں کہ اتنے میں پھر سے بکری کی آمد ہوئی۔ جنت بیگم نے غصہ سے بکری کو کان سے پکڑا اور سیدھی کبریٰ آنٹی کے گھر پہنچ گئیں اور انہیں ان کی لاپروائی پہ اتنا زوردار لیکچر دیا کہ اللہ کی پناہ جبکہ کبریٰ آنٹی بردباری سے کام لیتے ہوئے اس وقت بھی نرمی برت رہی تھیں انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے جنت کو یقین بھی دلایا کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا، اس کے باوجود جنت بیگم معاف کرنے کو بالکل تیار نہ تھیں نتیجتاً کبریٰ آنٹی کو بھی غصہ آ گیا اور وہ بھی جواباً اپنے دفاع میں بولنے لگیں مگر جنت بیگم کو کسی پل قرار نہ آیا۔ وہ ہار نہیں مان رہی تھیں تب ہانیہ نے زبردستی جنت بیگم کو خاموش کروایا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر گھر لے آئی، گھر آ کر بھی ان کی بڑبڑاہٹ جاری رہی اور ہانیہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی آخر کرے تو کیا کرے؟

❁ ❁ ❁

ہانیہ نے موبائل پر ایف ایم ریڈیو آن کیا اور موبائل میز پر رکھ کر خود کمرے کی صفائی کرنے لگی...... صبح کے وقت کسی کی آر جے کا پروگرام نہیں ہوتا تھا اس وقت نعتیں، قوالیاں اور مذہبی اور اصلاحی تقاریر سننے کو ملتی تھیں، وہ اپنے پسندیدہ مذہبی رہنما کے بیانات بہت شوق اور توجہ سے سنتی تھی اور اس وقت بھی ان کا کوئی بیان ریڈیو سے نشر ہو رہا

تھا۔ ان کی پراثر آواز گونج رہی تھی۔
"مومن تو وہ ہے کہ جب کسی شخص کو برائی کرتے دیکھے اسے ہاتھ سے روکے اگر ہاتھ سے روکنے کی ہمت نہ رکھتا ہو تو زبان سے منع کرے اور اگر اتنا بھی نہ ہو سکے تو اسے دل سے برا سمجھے لیکن یہ ایمان کا سب سے چھوٹا درجہ ہے۔" ہانیہ ٹھٹکی وہ آگے بھی اور کچھ کہہ رہے تھے لیکن ہانیہ تو بس اس ایک فرمان میں ہی کھو گئی تھی، ایسا نہیں تھا کہ اس نے یہ حدیث مبارکہ پہلی مرتبہ سنی تھی لیکن اس لمحے اسے لگا کہ شاید وہ پہلی مرتبہ سن رہی ہے۔

"تو کیا میں ایمان کے کم تر درجے پر فائز ہوں؟ میں نے کبھی ان کی اصلاح کرنے کی کوشش بھی تو نہیں کی نا ہاتھ سے روکا اور نا ہی زبان سے منع کیا، بس دل ہی دل میں انہیں برا بھلا کہتی رہی آخر کیوں؟" یک دم اس کا دل کام سے اوب گیا۔ اس نے بے دلی سے کمرے کی صفائی کی اور ریڈیو آف کر کے دادی کے کمرے میں آ گئی، دادی اشراق کی نماز ادا کر رہی تھیں ہانیہ کتنی دیر کھڑی انہیں دیکھتی رہی پھر اس نے امی کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو وہ قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں۔ وہ واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔

ہانیہ نے جب سے ہوش سنبھالا تھا امی، ابو اور دادی کو عبادات میں مشغول پایا تھا اور یہی عبادات انہوں نے اپنی اولاد میں منتقل کی تھیں، ہانیہ بہت حساس دل کی مالک اور ہر بات کو بہت گہرائی سے سوچنے والی لڑکی تھی، وہ بہت خوش ہوتی تھی اپنے گھر والوں کو اللہ کی عبادت کرتا دیکھ کر لیکن اس وقت افسردہ ہو جاتی تھی جب دادی اور امی کا سلوک دیکھتی جو وہ جانوروں اور انسانوں سے روا رکھے ہوئے تھیں، ہانیہ چاہتی تھی کہ وہ دونوں حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد بھی ادا کریں، دادی اور امی میں وہ تمام خامیاں تھیں جو کہ آج کل کی خواتین میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ غیبت کرنا، دوسروں کے عیبوں کی پردہ پوشی کرنے کے بجائے مبالغہ آرائی کر کے بیان کرنا، جانوروں پر بے رحمی اور سب سے بڑی بات بداخلاقی برتنا، ہانیہ سوچ سوچ کر پریشان تھی کہ وہ ان کی اصلاح کرے تو کیسے کرے؟ لیکن آج مولانا صاحب کی سنائی گئی حدیث مبارکہ نے اس کی یہ ٹینشن دور کر دی تھی اور اس نے امی اور دادی کو سمجھانے کا پکا ارادہ کر لیا تھا اب وہ بس موقع کی تلاش میں تھی۔

"ہانیہ رکھو اس منحوس رسالے کو کتنی بار میں نے منع کیا ہے تمہیں کہ یہ نہ پڑھا کرو سمجھ میں نہیں آتی میری بات؟" جنت بیگم نے کپڑے سلائی کرتے ہوئے ہانیہ کو گھرکا۔

"میری پیاری سی امی جان منحوس تو نہ کہیں اتنے اچھے ڈائجسٹ کو، میری کوئی دوست نہیں ہے ایک یہ حجاب ہی تو ہے۔" ہانیہ کو امی کی بات پر بڑا دکھ ہوا۔

"اچھا تو پھر کیا کہوں، میں اسے؟ ہر وقت لے کر بیٹھی رہتی ہو کیا سیکھا ہے اس سے تم نے؟"

"امی کیا سیکھا ہے میں نے اس سے؟" ہانیہ سیدھی ہو کر بیٹھی اور آنچل پر انگلی رکھ کر استفسار کیا، آج اچھا موقع تھا امی اور دادی کو سمجھانے کا۔

"امی میں بتاتی ہوں میں نے اس سے کیا سیکھا ہے۔ امی اور دادی جان آپ دونوں پلیز میری بات غور سے سنیے گا، کیا آپ کو نہیں پتا کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کے ساتھ ساتھ انسانوں کے حقوق ادا کرنا بھی ہم پر فرض ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا لڑکی؟ ہم نے کس کے حقوق ضبط کر لیے ہیں جو تم ہمیں حقوق کے سبق پڑھانے چلی ہو۔" دادی بھڑک اٹھیں۔

"نہیں دادی جان میں حقوق کے سبق پڑھانے نہیں چلی آپ کو۔" وہ اٹھ کر دادی کے پاس آئی اور ان کے ہاتھ تھام کر بولی۔

"دادی اور امی جی مجھے بہت اچھا لگتا ہے جب آپ دونوں نماز باقاعدگی سے ادا کرتی ہیں، قرآن پاک کی تلاوت بھی دن میں پانچ مرتبہ کرتی ہیں، سارے روزے رکھتی ہیں اس کے علاوہ نفلی عبادات بھی کرتی ہیں، یعنی

حقوق اللہ کا آپ پورا پورا اہتمام کرتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اللہ پاک یہ بھی فرماتا ہے کہ حقوق العباد بھی ادا کرو، جانوروں اور مظلوموں پر بے جا ظلم مت کرو، یاد ہے ناں ابھی کچھ روز پہلے آپ نے بلی کو کتنا مارا تھا اور اسی طرح سے آپ دونوں اور جانوروں پر بھی ظلم کرتی ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ جانوروں پر رحم کرنے کی تاکید فرماتا ہے کیا آپ لوگوں کو جانوروں پر رحم کرنے کے حوالے سے احادیث یاد نہیں۔ ایک بلی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نقصان کر جاتی تھی، میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کبھی تکلیف نہیں پہنچائی جب حد سے زیادہ اس بلی نے تنگ کیا تو بس ایک مرتبہ آپ ﷺ نے اس کو روٹی پھینک کر ماری تھی اور امی آپ......" وہ امی کی طرف متوجہ ہوئی۔

"آپ کبریٰ آنٹی سے فضول میں بیر باندھے رکھتی ہیں حالانکہ وہ بیوہ عورت ہیں، مسکین ہیں آپ کو ان کے حقوق کا خیال رکھنا چاہیے، پڑوسی اور بیوہ کی حیثیت سے بھی اور ان کے بچوں کا یتیموں کی حیثیت سے بھی لیکن آپ کیا کرتی ہیں؟ اپنا کچھ دن پہلے والا جھگڑا ابھی یاد کر لیجیے جو آپ نے کبریٰ آنٹی سے کیا تھا اور غیبت کا پتا ہے آپ کو یہ کتنا بڑا گناہ ہے؟ معراج کے موقع پر آپ ﷺ نے جہنمیوں کے ایک گروہ کو دیکھا جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ اپنے ناخنوں سے اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے، آپ ﷺ نے ان کے متعلق جبرائیل علیہ السلام سے دریافت کیا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کی عزت وآبرو بگاڑتے ہیں یعنی غیبت کرتے ہیں۔" ہانیہ نے اتنا کہہ کر چپ سادھ لی تو جنت بیگم اور نور بی بی کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ انہیں تو پتا ہی نہ تھا کہ وہ دونوں ساس بہو کتنی بڑی گمراہی کا شکار تھیں وہ تو بس نماز روزہ ادا کر کے سمجھتی تھیں کہ ان کا ایمان مکمل ہے۔ اب جو ہانیہ کو ان کے دلوں پر جمی گرد ہٹانے کا موقع ملا تو وہ ان کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو دیکھ کر ایک دم شرمندہ ہوئی اور وضاحت دیتے ہوئے بولی۔

”پلیز امی، دادی آپ روئیں مت، میرا مقصد آپ دونوں کو شرمندہ کرنا ہرگز نہ تھا، میں تو بس آپ کی اصلاح کرنا چاہ رہی تھی اور آپ کو پتا ہے آپ کی آنکھوں میں یہ جو ندامت کے آنسو ہیں ناں ان کے طفیل اللہ آپ کی توبہ بھی بہت جلد قبول فرمالے گا، ابھی بھی وقت ہے اپنی غلطیوں کا ازالہ کرنے اور توبہ کرنے کا۔“ وہ اپنی بات کہہ کر خاموش ہوئی۔

”ہاں بیٹی تم صحیح کہتی ہو۔“ دادی نے آنسو پونچھتے ہوئے بوجھل آواز میں کہا۔ ”میری بیٹی بہت سمجھدار ہے، ہانی تم نے بہت اچھا کیا بیٹا، ہماری عقل پر پڑے پردے ہٹا کر، ورنہ ہم تو گمراہی میں ہی پڑے رہتے اور آج تو مجھے اپنی وہ ساری غلطیاں اور زیادتیاں یاد آرہی ہیں جو میں نے اپنے ہی رشتہ داروں سے کیں۔“ وہ افسردگی سے بولیں۔ ”لیکن میں آج ہی جاتی ہوں اور اپنی بہن سے معافی مانگتی ہوں جس سے میں نے برسوں سے قطع تعلق کیا ہوا ہے، حالانکہ میری بہن کتنا تڑپتی رہی مجھ سے ملنے کے لیے اور میں کتنی کٹھور ہوں کہ اس کی ایک چھوٹے سی غلطی کو بنیاد بنا کر اس سے سارے تعلق ہی ختم کر بیٹھی جبکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم تو فرماتے ہیں کہ جو تم سے تعلق توڑے ان سے جوڑو اور میں نے کیا کیا؟“ کہتے ہی جنت بیگم پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

گیارہ سال پہلے جنت کی چھوٹی بہن نے ماں باپ کی مخالفت لے کر اپنی پسند کی شادی کرلی تھی جس کی جنت بیگم نے تو شدید مخالفت کی تھی لیکن ان کے ماں باپ دیر سے ہی سہی لیکن مان گئے تھے اور انہوں نے اپنی چھوٹی بیٹی اس کی پسند کے لڑکے سے بیاہ دی تھی، اس وقت سے جنت بیگم نے اپنی بہن سے ہر قسم کا تعلق ختم کرکے کبھی اس کی شکل نہ دیکھنے کا عہد کیا تھا اور ماں باپ سے بھی وہ کم ہی ملتی تھی، آج گیارہ سال بعد جب انہیں احساس دلایا گیا تو انہیں اپنی تمام غلطیاں ایک ایک کرکے یاد آنے لگیں۔

”جی امی آپ جائیے گا آنٹی نجمہ کے پاس بھی اور آنٹی کبریٰ کے پاس بھی کیونکہ جب تک وہ معاف نہیں کریں گی اللہ کیسے معاف کرے گا۔“ وہ مسلسل رو رہی تھیں، انہیں واقعی احساس ہوگیا تھا۔

”اچھا اب جلدی سے چپ کرجائیں پلیز اور مسکرا کر دکھا دیں۔“ ہانیہ نے اپنی امی اور دادی کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا تو وہ دونوں مسکرا دیں۔

”اور ہاں..... آئندہ آپ میرے ڈائجسٹ کو برا نہیں کہیں گی ناں؟ کیونکہ جو روزانہ نئے نئے پکوان آپ کو کھانے کو ملتے ہیں وہ اس کی ہی بدولت ہے اور آپ کہتی ہیں کہ میں نے کیا سیکھا ہے اس سے، ان میں تو زندگی جینے کے گر سکھائے جاتے ہیں۔ رشتوں کی اہمیت کے ساتھ ساتھ گھر میں رہنے کے آداب، دلوں کو جیتنے کا فن اور سب سے بڑی بات یہ کہ خود بھی خوش رہو اور دوسروں کو بھی خوش رکھو۔“ ہانیہ نے منہ پھلا کر ماحول کی کشیدگی کم کرنے کی خاطر کہا تو دونوں مسکرا دیں۔

”نہیں میری بچی اب ہم اسے برا نہیں کہیں گی کیونکہ یہ تو ہماری بیٹی کی سہیلی ہے۔“

دونوں نے مسکرا کر ہانیہ کو گلے لگایا تو اس کے اندر تک سکون اتر گیا اور اس نے دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس مالک کائنات نے اسے ایمان کا کم تر درجہ عطا نہیں کیا، بعض اوقات چھوٹوں کو بھی بڑوں کی اصلاح کرنی پڑ جاتی ہے اور اس کام میں دیر مت کریں کبھی بھی۔

قسط نمبر نو

مرگ تمنا

ماورا طلحہ

گزشتہ قسط کا خلاصہ

ہسپتال کی تاریک اور سرد راہ داری میں عورت کی چیخیں گونج رہی ہیں جو تخلیق کے مراحل سے گزر رہی تھیں۔ اس کا شوہر بچی کو لے کر فرار ہو جاتا ہے۔

لامیہ سڈنی یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہوتی ہے۔ اذلان اس کا پھوپوزاد ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین دوست بھی ہوتا ہے۔ دوسری طرف طیبہ حیدر شاہ کو ان دونوں کی دوستی ناپسند ہوتی ہے اور وہ انہیں دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہیں۔

سفید حویلی میں احمد علی چٹھہ کا حکم چلتا ہے۔ نور بی بی مزاج کی نرم ہونے کے باعث علاقے کی عورتوں کے مسائل حل کرنے میں مصروف رہتی ہیں اور نور العین اکثر ان کے ساتھ رہتی ہے۔

عبدالودود علی چٹھہ سفید حویلی کا بگڑا ہوا سپوت ہوتا ہے جو اپنی من مانی کرنے کا قائل ہوتا ہے جب کہ دوسری طرف تاشفین علی چٹھہ وکالت کے شعبے میں نام پیدا کر چکے ہوتے ہیں۔

مجتبی شہر سے سفید حویلی آتا ہے اور راستے میں عزت نامی لڑکی سے گاڑی ٹکرا جاتی ہے۔ عزت لاہور کی اندرونی گلیوں میں اپنی ماں رشیدہ بی بی کے ساتھ رہتی ہے اور ان کے تعلقات صرف میمونہ خالہ تک ہی محدود رہتے ہیں۔
حازم شفیق عزت کے لیے نرم جذبات رکھتے ہیں لیکن یہ راز ابھی ان کے سینے میں ہی دفن رہتا ہے۔

اب آگے پڑھئے

رات کے گہرے سائے مدھم ہوتے جارہے تھے اور فلک آہستگی سے رنگ بدلتے بدلتے دن کی نوید سنارہا تھا۔ بادلوں کی راجدھانی قائم تھی لیکن کوئی من چلی کرن زمین کو بوسہ دینے کی کوشش میں کامیاب ہورہی تھی۔ پہاڑ کی اونچائی پہ منظر خوب صورت نہیں رہے تھے، وہاں صورت حال کل کے برعکس تھی۔ پہاڑ کی ڈھلان تلے وہ دونوں نیند میں گم تھے لیکن ان کے چہروں پہ رات کی بے سکونی رقم تھی۔ لامیہ کی ٹانگوں پہ اذلان کی جیکٹ تھی جو شاید اس نے رات کے کسی پہر اس پہ ڈال دی اور اپنے جسم کو حدت دینے کے لیے بیگ کو سینے سے لگائے ہوئے تھا۔ وہ پتھر سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا جب کہ لامیہ کا سراس کے کندھے پہ تھا۔ سر میں اٹھتی ٹیسوں کی وجہ سے وہ اک لمحہ سکون سے سو نہیں پایا لیکن لامیہ کی نیند میں خلل پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ صبح کے پیغام نے سب سے پہلے اسی کی آنکھوں پہ دستک دی تھی۔ اس نے مندی مندی آنکھیں کھول کر اپنے اردگرد دیکھا۔ وہ حالات کا جائزہ لینا چاہ رہا تھا لیکن نگاہیں اپنے پہلو میں سوئی لامیہ پہ ٹکی رہ گئیں۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھول گیا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کن مشکلات کا شکار ہے، ایک پل کے لیے اس کا دل چاہا کہ یہ لمحات یوں ہی تھم جائیں اور وہ اسے دیکھتا رہے۔ اس کے بکھرے بال آدھے چہرے کو ڈھانپے ہوئے تھے لیکن کندھے پہ چہرہ ٹکے ہونے کے باعث وہ بہت قریب سے اس کے نقوش کو محسوس کررہا تھا۔ کتنے ہی پل اس بے خودی میں گزر گئے، اگر وہ آنکھیں کھول کر اس کی آنکھوں میں دیکھ لیتی تو سڈنی کی محبت ماضی کا قصہ بن جاتی۔ اس پہ آج پھر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ وہ لامیہ ابراہیم کی ایک جھلک پہ اپنا سب کچھ ہار سکتا ہے۔
"صبح ہوگئی ہے۔" اس کی نگاہوں کی تپش تھی شاید کہ وہ آنکھیں کھولے اسے دیکھنے لگی۔ اپنی بے خودی چھپانے کا کوئی بہانہ نہیں سوجھا تو نگاہیں چراتے ہوئے صبح ہونے کی اطلاع دی۔
"تمہاری چوٹ کیسی ہے؟" وہ اس کا نگاہیں چرانا اور خود کو غیر محسوس طریقے سے پیچھے کرنا واضح محسوس کرگئی لیکن یہ وقت ایسی باریکیوں پہ غور کرنے کا نہیں تھا۔
"درد ہی درد ہے۔" وہ بتا نہیں پایا کہ درد سر میں زیادہ تھا دل میں۔
"اب ہم کیا کریں...... طوفان رک چکا، ہم نیچے جاسکتے ہیں کیا؟" وہ سوالیہ نگاہوں سے اذلان کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ راستہ کس حد تک خراب ہوچکا ہے لیکن اس طرح ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بھی نہیں بیٹھ سکتے۔ ہمیں یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی ہے۔" وہ اسے جواب دیتے ہوئے وہاں بکھرا اپنا سامان سمیٹنے لگا۔
"لیکن تم ایسی حالت میں نیچے کیسے جاؤ گے؟"
"اس کے سوا چارا بھی کیا ہے؟" وہ خود اپنی بگڑتی حالت سے آگاہ تھا لیکن ہار مان لینا زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوسکتا تھا۔
"تم یہاں رک جاؤ، میں نیچے جاتی ہوں۔ ماما پاپا بھی پریشان ہوں گے اور میرے پہنچنے پہ یقیناً تمہیں نیچے لے جانے کے لیے کوئی بہتر طریقہ استعمال کریں گے۔" وہ اپنے لیے اسے مزید تکلیف دینا نہیں چاہ رہی تھی۔

"بالکل بھی نہیں...... میں تمہیں اکیلے نہیں جانے دوں گا۔" اس نے ایک لمحہ بھی اس کی بات پہ غور نہیں کیا۔

"اذلان...... تم زخمی ہو، پہلے ہی میرے لیے خود کو بہت مشکل میں مبتلا کر چکے ہو پلیز اپنی ضد چھوڑ دو۔" اس کے زرد ہوتے چہرے کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔

وہ اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اذلان یہیں رہے گا اور وہ خود نیچے جا کر اس کے لیے مدد لائے گی مگر اسے معلوم تھا وہ یہاں رکنے کے لیے آسانی سے نہیں مانے گا لیکن وہ اسے مزید مشکل میں نہیں ڈال سکتی تھی۔

"لامیہ بے وقوفی مت کرو، ہم اکٹھے ہوں گے تو ایک دوسرے کی مدد کر سکیں گے، اکیلے رہیں گے تو کچھ خبر نہیں ہو گی کہ دوسرے کے ساتھ کیا ہوا۔" وہ اس کے ارادے بھانپ چکا تھا تب ہی اسے منع کیا۔ لامیہ نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے قدم جلدی سے آگے بڑھائے۔ وہ تیز رفتاری سے نہیں چل سکتا تھا۔ اسے سہارے کی ضرورت تھی اور اسی بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اسے یہاں چھوڑ سکتی تھی۔ اسی سوچ کے تحت وہ جلدی سے غار نما ڈھلان سے نکل کر کھلے آسمان تلے آئی اور اک نظر سامنے دیکھتے ہی اس کے ارادے بھربھری دیوار کے طرح ڈھے گئے۔ اونچائی کا خوف ایک دم اس کی نگاہوں کے سامنے ناچنے لگا تھا۔ اس کے لیے ایک قدم بڑھانا بھی بہت مشکل ثابت ہو رہا تھا۔

"کیا ہوا تم ٹھیک ہو؟" اذلان چند قدموں کا فاصلہ پار کر کے اس تک پہنچا اور اب اس کی اڑی رنگت دیکھ کر سراپا سوال ہوا۔

"ہاں ٹھیک ہوں، تمہیں چھوڑ کر جانا مشکل لگ رہا ہے۔" اس کے سوا اسے کوئی بات نہیں سوجھی۔

"یہ تو میری خوش قسمتی ہے۔" وہ اس کے جواب سے من پسند معانی تلاش کرنے لگا تھا۔

"کیا مطلب......؟" وہ اس کے بدلتے رویے محسوس کر رہی تھی لیکن اسے اس صورت حال میں کیا کرنا چاہیے یہ سمجھ سے بالاتر تھا۔

"لامیہ...... مجھے نہیں معلوم کہ دوبارہ یہ تنہائی میسر ہو گی یا نہیں، مجھے اس حقیقت کا ادراک بھی ہے کہ یہ جگہ ایسی باتوں کے لیے مناسب نہیں لیکن میں آج کہہ دینا چاہتا ہوں، میں ان اونچے نیچے راستوں کو اس اقرار کا گواہ بنانا چاہوں گا کہ اذلان حیدر دل کے ہاتھوں بے بس ہو چکا ہے۔ تم سوچو گی شاید سر پہ لگی چوٹ کا اثر ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں یہ میرا وہ پاگل پن ہے جو سالوں سے تمہارے وجود کی چاہ کا مجھے شکار بنائے ہوئے ہے، میں نہیں جانتا یہاں سے جانے کے بعد کیسے حالات کا سامنا کرنا پڑے لیکن یہ بھی سچ ہے میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا، مجھے تمہارے سنگ قدم سے قدم ملا کر چلنا ہے۔ میں اب تمہارے ناراض ہونے کا، تمہیں کھونے کا رسک نہیں لے سکتا۔" وہ بہت ناپ تول کر بول رہا تھا لیکن لفظ پھر بھی پھسلتے جا رہے تھے۔

لامیہ حیران نگاہوں سے سامنے کھڑے انسان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ زخمی تھا لیکن اپنے جذبوں کی سچائی ثابت کرنے کے لیے لڑکھڑاتے لہجے میں بول رہا تھا۔ اذلان حیدر اس کا دوست تھا شاید دوست سے بڑھ کر لیکن دوستی کی مٹی میں محبت کا گلاب کھلے گا اس کا اندازہ اسے نہیں تھا۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے اپنے اقرار کا جواب جاننا چاہ رہا تھا اور وہ اپنے حواس مختل محسوس کر رہی تھی۔ ایسے کسی ویرانے میں کوئی شخص کبھی اپنی محبت کا اظہار کرے گا یہ اس نے کب سوچا تھا...... محبت کے متعلق اس نے سوچا ہی کب تھا۔

"اذلان میں......" وہ عجیب بے بسی محسوس کر رہی تھی۔

"ہاں لامیہ...... جو کہنا ہے ابھی کہہ دو، اس ویرانے میں کوئی جادو ہے اسی لیے دل کی باتیں اظہار کا تقاضا کرتی ہیں اور

ایک بار کہہ کر دیکھو یہ ویرانہ تمہیں گلشن بنا دکھائی دے گا۔ تم ان اونچے درختوں کو گنگناتا ہوا محسوس کرو گی۔" وہ ایک دم اس کے قریب ہوا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کچھ کہنے کے لیے اکسا رہا تھا۔ وہ خاموش تھا تو کوئی مشکل نہیں تھی، سب کہہ دیا تو مشکل بڑھ گئی تھی۔ وہ اس کا جواب سننے کے لیے انتظار نہیں کر سکتا تھا۔

"اذلان......" اس کے دل میں اس وقت سوائے خدشات کے کچھ اور نہیں تھا۔ وہ اس کے سامنے کھڑا سب سننے کے لیے تیار تھا کہ کسی احساس نے اسے چونکایا۔ اس کی نگاہیں لامیہ کے پیچھے دیکھنے لگی تھیں۔ اسے ہونے والا احساس غلط نہیں تھا کیونکہ اب آوازیں واضح ہونے لگی تھیں۔ آسمان پہ ہیلی کاپٹر کی پرواز اور نیچے لوگوں کا شور اس کا مطلب صرف ایک ہی تھا کہ ان کی مدد پہنچ چکی ہے۔ انہیں اکیلا نہیں چھوڑا گیا تھا۔

"وہ لوگ آگئے۔" اپنے علاوہ دوسروں کی آوازوں نے لامیہ کو اس قدر خوشی بخشی کہ وہ فرط جذبات سے اذلان کے سینے سے لگ گئی۔ اس کی اذلان کے حوالے سے ساری فکر مندی ختم ہوگئی اور اس خوشی میں وہ چند لمحے پہلے کا فسوں ختم کر بیٹھی تھی۔ وہ اس سے الگ ہوئی اور اوپر دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلانے لگی لیکن اس کا گلے لگنا اور پھر ہٹ جانا مقابل کو ساکت کر گیا تھا۔

❀......❀......❀

کالی اندھیری رات میں ایک انجان بنگلے کے سامنے وہ حیران پریشان کھڑی تھی۔ پچھلے تین گھنٹوں سے وہ اپنے ہمسفر کے تاثرات سے صورت حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی جو تا حال کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ بنگلے میں لوگوں کی بھیڑ اور دریاں بچھی دیکھ کر اتنا تو اندازہ ہو گیا کہ کچھ گڑبڑ ہے، یہاں کچھ خوشگوار نہیں تھا لیکن کیا تھا یہ سمجھنے سے وہ قاصر تھی۔

"تاشفین بھائی......ہم کہاں آئے ہیں؟" اس کے لہجے میں ایک انجانا سا خوف تھا۔

"مجھے کبھی امید نہیں تھی کہ اس طرح بھی یہاں آنا پڑے گا اور اس دل دکھا دینے والے سانحے کو تمہارے بچاؤ کے لیے استعمال کرنے کی نوبت آئے گی۔" وہ دکھی تھے اور اس کا اندازہ اسے ایک لمحے میں ہوا۔

ان کی بات نے اسے شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیا تھا۔ وہ کبھی ایسی بے وقوف اور جلد باز نہیں رہی تھی جیسی حرکت آج کے دن اس سے سرزد ہوئی تھی، نہ جانے کون سا بھوت تھا جو اس کے سر سوار ہو گیا تھا، اس نے اپنی بڑی امی کے متعلق ایک لمحہ سوچنا گوارا نہ کیا۔ وہ کیا کر بیٹھی تھی یہ ان چند گھنٹوں میں اسے بخوبی اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ انہی سوچوں میں مگن تھی کہ کوئی شخص ان کے پاس آن کھڑا ہوا۔ وہ تاشفین بھائی سے گلے ملا اور اسی دوران ایک سرسری نظر اس پہ ڈالی لیکن وہ نگاہ پلٹ کر دوبارہ واپس نہیں آئی تھی۔ اس ایک نگاہ میں وہ حیرانی اور دکھ کی ملی جلی کیفیت واضح دیکھ چکی تھی۔

"میں یہاں سارے انتظامات دیکھ رہا ہوں۔" اجنبی شخص کے بھیگے لہجے نے دل میں پنپتی پریشانی کو مزید ہوا دی۔

"تمہیں کس نے بتایا تھا؟"

"یہاں کے ملازموں نے اطلاع دی ہے۔ ان کا کہنا تھا یہاں زیادہ تر ہم دونوں کا آنا جانا تھا تمہارے نمبر پہ رابطہ نہیں ہوا تو مجھے کال ملائی۔"

"ڈیڈ باڈی کب تک آئے گی؟" ان کا جملہ نورالعین کو چونکا گیا۔ کس کے متعلق بات ہو رہی تھی وہ اس بات سے انجان تھی لیکن معاملے کی سنگینی کا احساس ہونے لگا تھا۔

"ابھی شوکت صاحب کے رشتہ داروں سے پتا چلا کہ شاید ڈیڈ باڈی نہ لائی جائے البتہ ان کی بیٹی جلد از جلد پاکستان آجائے گی۔" نبیل کو جتنا معلوم ہو سکا اس نے بتا دیا۔

"مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ اتنا نرم مزاج انسان ہم میں نہیں رہا۔ دوپہر میں ہی تو ان کی بیٹی سے بات ہوئی تھی اور اب یہ خبر......" وہ بے حد افسردہ تھے۔

نور العین کے لیے شوکت حسین کا حوالہ اتنا انجان نہیں تھا سو وہ کچھ کچھ صورت حال سمجھ چکی تھی۔ ان سب کے دکھی ہونے کا پس منظر وہ جان گئی تھی اور اسے افسوس ہوا کہ اتنے دکھ کے لمحے کو اس کے بچاؤ کے لیے استعمال کیا گیا۔

"نبیل...... یہ میری بہن ہے، میں دراصل اس کے ساتھ ضروری کام سے نکلا تھا کہ تمہاری کال نے حواس باختہ کردیا اور میں اسی حالت میں یہاں چلا آیا تو اگر اس کے رات رکنے کا انتظام ہو سکے......" انہیں اب خیال آیا کہ وہ یہاں اکیلے نہیں تھے۔

"ہاں کیوں نہیں...... اندر خاندان کی خواتین موجود ہیں۔ کسی ملازمہ کے ساتھ انہیں اندر بھجوا دیتا ہوں۔" وہ بھی کسی عورت کی موجودگی میں پرسکون نہیں تھا سو اس نے شکر کا سانس لیا۔

"نور العین جاؤ...... ہم صبح ہوتے ہی واپس حویلی کے لیے نکل جائیں گے۔" اسے اندر بھیجتے ہوئے وہ قدرے پرسکون ہوئے اور ساتھ ہی حویلی والوں کا دھیان آیا کہ نہ جانے وہاں کیا صورت حال ہوگی۔

"میں کال کر کے آتا ہوں۔" وہ نبیل کو کہتے ایک طرف کو ہوئے۔ کئی لمحے وہ اسی سوچ میں گم رہے کہ اس وقت کسے فون کریں پھر خیال آنے پہ عبدالودود کو کال ملائی کہ اس وقت صرف وہی جاگ رہا ہوگا۔ ان کا خیال سچ ثابت ہوا کہ پہلی ہی کال میں فون اٹھا لیا گیا تھا۔

"زہے نصیب...... ہماری یاد کیسے آئی جناب کو؟" وہ صورت حال سے مکمل انجان تھا اس لیے مزاج کافی خوشگوار تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اسے بات بتانے کا مطلب ہے اسے مطمئن بھی کرنا جو وہ کسی صورت ہوگا نہیں اور نہ ہی اس وقت وہ کسی تفتیشی مرحلے سے گزرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ انہوں نے اسے بڑی امی سے بات کروانے کا کہا تھا۔

"میں تو حویلی میں نہیں ہوں۔ آج کچھ کام تھا سو ابھی آفس سے نکل رہا ہوں۔" عبدالودود کے جواب پہ انہوں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔

"اس وقت......؟"

"لیکن آپ کہاں ہیں، کیا حویلی میں نہیں ہیں؟" اس کی تفتیش شروع ہو چکی تھی۔

"میں تمہیں ایک لوکیشن بھیج رہا ہوں یہاں آؤ...... نور العین میرے ساتھ ہے اسے جاتے ہوئے حویلی واپس لے جاؤ۔ میں کل صبح واپس آؤں گا۔" عبدالودود کا یہاں ہونا انہیں غنیمت لگا۔ وہ اسے عبدالودود کے ساتھ واپس بھیج دیں گے اور باقی کا سارا مسئلہ بعد میں دیکھ لیں گے۔

"نوری آپ کے ساتھ ہے؟" عبدالودود کی حیرانی وہ آواز سے بھی محسوس کر سکتے تھے۔ "سب ٹھیک ہے ناں کوئی مشکل تو نہیں ہے؟" وہ اب مسلسل بول رہا تھا۔ اسے مطمئن کرنا ان کے لیے ہمیشہ سے مشکل رہا تھا۔

"تم بس آجاؤ۔" وہ اس وقت کچھ زیادہ تفصیل بتانے سے گریزاں تھے۔

❀ ❀ ❀

palm beach پہ سنہری کرنیں دستک دے رہی تھیں۔ سیاحوں کی کثیر تعداد یہ دلکش منظر دیکھنے کے لیے جمع تھی جب کہ کچھ لوگ بے چینی سے لائٹ ہاؤس کو جانے والے راستے کی جانب کھڑے تھے۔ وہاں کھڑے ہر شخص کی آنکھوں میں انتظار تھا۔ ساری رات فاطمہ ابراہیم نے کانٹوں کے بستر پہ گزاری تھی۔ طوفان آیا اور تباہی کی داستان رقم کرتے ہوئے چلا گیا لیکن لامیہ کی دوری نے انہیں عجیب اور خوفناک وسوسوں کے سپرد کردیا تھا۔ اب بھی ابراہیم کا ہاتھ

تھا مے وہ پہلی قطار میں کھڑی تھیں۔
"لامیہ..... میری بچی۔" اسے دیکھتے ہی وہ بے چین ہو کر اس کی جانب بڑھیں۔ انہوں نے اسے اپنے سینے میں یوں بھینچ لیا کہ اب اسے دور رکھا تو کوئی نئی قیامت آجائے گی۔
"شکر ہے بیٹا آپ خیریت سے ہیں۔ آپ کی ماما بہت ڈر گئی تھیں۔" وہ ماما سے الگ ہوئی تو انہوں نے اسے ساتھ لگا لیا۔
"بہت مشکل رات تھی ماما لیکن فائنلی سب ختم ہوا۔" وہ اپنی زندگی کے دونوں ستون کو سامنے دیکھ کر خوش تھی۔
"اذلان کہاں ہے؟" فاطمہ ابراہیم نے سب سے پہلے اس کی غیر موجودگی کو محسوس کیا۔
"ارے ہاں..... اذلان نظر نہیں آرہا وہ کہاں رہ گیا؟" ابراہیم درانی متلاشی نگاہوں سے اس کے پیچھے دیکھ رہے تھے۔
"پاپا..... وہ زخمی ہے۔ اسے ہیلی کاپٹر کے ذریعے ہاسپٹل لے جایا گیا ہے۔" لامیہ کے جواب نے ان دونوں کو پریشان کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔
"کیا ہوا اسے؟"
"یہ سب ہم بعد میں پوچھ لیں گے ابھی ہمیں اس کے پاس پہنچنا چاہیے۔" انہوں نے فاطمہ کو سوالات کا سلسلہ موقوف کرنے کا کہا اور جلدی سے واپسی کے لیے موڑے۔ ان دونوں نے بھی قدموں کا رخ موڑ لیا۔
"لامیہ تم بھی زخمی ہو؟" اس نے انہیں سہارا دینے کے لیے ہاتھ پکڑا تو اس کی زخمی کلائی ان کی نگاہوں سے چھپی نہیں رہ پائی۔
"کیا ہوا ہے لامیہ؟" ان کے تیز تیز چلتے قدم تھمے۔ وہ پریشانی سے اس کی چھلی ہوئی کلائی اور پنڈلیاں دیکھ رہے تھے۔
"آپ پارکنگ تک چل سکو گی؟" ان کا پریشان لہجہ اسے نادم کر گیا کہ ایک اس کی خواہش نے سب کو کتنا پریشان کر دیا تھا۔
"آپ پریشان نہ ہوں میں آسانی سے چل لوں گی۔" وہ انہیں بتا نہیں پائی کہ ان دونوں کی محبت نے اسے کتنی طاقت بخشی تھی۔
وہ ست روی سے چلنے کے باعث تیس منٹ سے زیادہ وقت لگاتے ہوئے پارکنگ میں پہنچے۔ پاپا کے گاڑی چلانے کے انداز سے اسے ان کی تشویش سے آگاہی ہو رہی تھی اور کہیں نا کہیں اس کے دل میں بھی وسوسوں کا ناگ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ اذلان کے حوالے سے کئی خیال اس کے دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ اس کا اقرار محبت لامیہ ابراہیم کو بہت سی الجھنوں کے سپرد کر گیا تھا۔

درخت جاں پر عذاب رت تھی نہ برگ جاگے، نہ پھول آئے
بہار وادی سے جتنے پنچھی ادھر کو آئے ملول آئے
نشاط منزل نہیں تو ان کو کوئی سا اجر سفر ہی دے دو
وہ رہ نورد رہ جنوں جو پہن کے راہوں کی دھول آئے
وہ ساری خوشیاں جو اس نے چاہیں اٹھا کے جھولی میں اپنی رکھ لیں
ہمارے حصے میں عذر آئے، جواز آئے، اصول آئے

وفا کی نگری لٹی تو اس کے اثاثوں کا کا بھی حساب ٹھہرا
کسی کے حصے میں زخم آئے کسی کے حصے میں پھول آئے

کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے طالب علمی کے دور کی یاد دلاتی ہوئی غزل نگاہوں کو باندھ گئی۔ وہ کئی بار اس غزل کو پڑھتے رہے اور مزید پڑھنے کی تمنا دل میں بیدار ہوتی رہی۔ انہیں یوں لگا شاعر نے ان کا دل چیر کر سرخ سیاہی سے الفاظ رقم کیے تھے، کبھی زمانے کی پسندیدہ غزل آج حال دل بن گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ یادوں میں مزید بھٹک جاتے ان کی نگاہ گھڑی پہ گئی اور آدھی رات گزرنے کے احساس نے انہیں یہ شوق ترک کرنے پہ مجبور کر دیا۔ انہوں نے کتاب بند کی اور کرسی دھکیلتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"حازم...... ابھی تک نہیں سوئے؟" امی کی آمد نے انہیں چونکایا۔

"کچھ مطالعے میں مصروف ہو گیا تھا امی۔" انہیں جواب دینے کے ساتھ ساتھ وہ لیپ ٹاپ بند کرنے لگے۔

"میں کافی دنوں سے محسوس کر رہی ہوں تم کچھ الجھے الجھے لگ رہے ہو۔ خیریت ہے ناں؟" وقت سے پہلے پڑنے والی ذمہ داریوں نے اسے کافی سنجیدہ اور ذمہ دار بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی انہیں حازم شفیق کی چھوٹی سے چھوٹی بات کی پروا رہتی تھی۔

"نہیں امی ایسی کوئی بات نہیں، آپ پریشان نہ ہوں۔" انہوں نے آگے بڑھتے ہوئے ان کی پیشانی پہ بوسہ دیا اور یہ ان کی ایک عرصے سے عادت تھی، ان کا یہ محبت و عقیدت بھرا بوسہ ماں کے وجود میں توانائی بھر دیتا تھا۔

"میں نے تم سے کئی باتیں کرنی ہیں لیکن تم ہاتھ ہی نہیں آ رہے۔" اس کا نرم رویہ دیکھ کر انہیں پچھلے دنوں کی کئی باتیں یاد آنے لگی تھیں۔

"یہاں بیٹھیے اور جی بھر کر باتیں کیجیے۔" ان کے سامنے کرسی رکھتے ہوئے انہیں بیٹھنے کو کہا اور خود بھی ان کے سامنے بیٹھ گئے۔

"یہاں محلے میں ایک رشتہ کروانے والی بوا ہیں، میں نے انہیں کنزی کا رشتہ ڈھونڈنے کے لیے کہہ دیا ہے۔"

"لیکن کیوں امی، ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟ اس کی پڑھائی بھی باقی ہے۔" وہ ان کی عجلت پسندی پہ حیران ہوئے۔

"اس کی عمر کم ہے لیکن تمہاری عمر تو گزر رہی ہے ناں...... چھبیس ستائیس سال شادی کے لیے بہترین عمر ہوتی ہے۔" انہوں نے ایک پل سوچتے ہوئے اس کی عمر کا اندازہ لگایا۔

"امی...... میری اور اس کی عمر کا کیا موازنہ؟" انہیں امی کا حساب کتاب سمجھ نہیں آیا۔

"حازم...... میں تمہارے ساتھ ساتھ کنزی کی بھی ماں ہوں، سچ کہوں تو میرے دل میں ہزار وسوسے اور اندیشے ہیں، مجھے بھی ہر ماں کی طرح لگتا ہے کہ تمہاری بیوی کے آ جانے کے بعد شاید حالات ایسے نہ رہیں اور میں کنزی کے لیے جو سب سوچ کے بیٹھی ہوں وہ نہ ہو سکے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے تمہاری فکر بھی کھائے جاتی ہے۔ کنزی کے شوق پورا کرنے کی میں تمہارے خوب صورت دن نہیں چڑھا سکتی اسی لیے مجھے یہی بہتر لگا کہ تم دونوں کی ذمہ داری سے ایک ساتھ سبکدوش ہو جاؤں تاکہ کسی کے ساتھ بھی زیادتی نہ ہو۔" اپنے دل میں پنپتے اندیشے انہوں نے بیٹے کے سامنے رکھ دیے۔

"آپ بھی بلاوجہ کی پریشانی پال لیتی ہیں۔ کنزی کے لیے آپ کی فکرمندی ٹھیک ہے لیکن میرے لیے خود کو پریشان نہ کریں اور نہ ہی میرا وقت گزرا جا رہا ہے۔ آپ تسلی رکھیں اور یقین بھی کہ ہم دونوں کے حوالے سے آپ کی ہر خواہش پوری ہوگی۔" انہیں امی پہ بے تحاشا پیار آیا جو نہ جانے کیسی کیسی سوچوں میں خود کو الجھائے رکھتی تھیں۔

”افشین کون ہے؟“ ان کے سوال نے حازم شفیق کو چونکانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔
”آپ کو کس نے بتایا افشین کا؟“ انہیں اندازہ تھا لیکن پھر بھی پوچھ بیٹھے۔
”یہ چھوڑو...... تم بتاؤ ناں کون ہے؟“ وہ اپنے سوال پہ قائم رہیں۔
”امی...... وہ میری کولیگ ہے۔ ایک ہی ڈیپارٹمنٹ میں ہم دونوں ہیں۔“ امی کو مطمئن کرنے کے لیے انہوں نے تفصیل سے جواب دیا۔
”اس کی کوئی تصویر ہے تو دکھاؤ۔“ امی کی اس بات نے ان کے چودہ طبق روشن کردیے۔
”میں کیوں رکھنے لگا اس کی کوئی تصویر؟“ وہ زچ ہوئے۔
”تمہارے پاس ہے تو سہی لیکن دکھانا نہیں چاہتے وہ الگ بات ہے۔ ایسا کرو خود ہی بتادو کیسی ہے؟“ ان کا انداز اٹل تھا۔
”امی...... آپ مجھے بتائیں گی کہ آپ کیا سوچ رہی ہیں؟“ وہ اب ان کے کسی سوال کا جواب نہیں دینے والے تھے۔
”دیکھو حازم...... وہ ہمارا زمانہ تھا جب ماں باپ نے کسی کے ساتھ قسمت جوڑ دی بلا چوں چرا اس پہ آمین کہہ دیا۔ اب وقت کے تقاضوں کو میں سمجھتی ہوں اس لیے تم یہ نہ سوچو کہ میری جانب سے کوئی اعتراض ہوگا۔ وہ تمہیں پسند ہے تو مجھے بھی جی جان سے پسند ہے، بس جیسے ہی کنزی کا کوئی اچھا رشتہ مل جاتا ہے میں ساتھ ہی اسے بھی تمہارے نام کی انگوٹھی پہنادوں گی۔“ وہ اپنی ہی رو میں مسلسل بول رہی تھیں۔
”امی...... امی...... ایسی کوئی بات نہیں۔“ انہیں سمجھ نہیں آرہی تھیں کہ وہ کیسے امی کو یقین دلائیں۔
”تو پھر کنزی اور عزت جھوٹ بول رہی ہیں؟“ اب کہ انہیں بھی غصہ آیا۔
”بالکل...... ان دونوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“ انہیں یقین تھا یہ کارنامہ ان دونوں کا ہوگا اور اب وہ سوچ چکے تھے کہ آسانی سے ان دونوں کو چھوڑنا نہیں۔
”تم اسے پسند نہیں کرتے جب کہ وہ دونوں کہہ رہی تھیں تمہارے بدلے بدلے انداز کے پیچھے یہ ہی وجہ ہے۔“ اب کے ان کا انداز دھیما ہوا۔
”امی...... افشین صرف میری کولیگ ہے۔ میں کسی کو پسند ضرور کرتا ہوں اور وقت آنے پہ آپ کو ضرور بتاؤں گا۔“ انہیں امی کا اداس چہرہ پسند نہیں آیا سو وقت کی مناسبت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے دل میں انگڑائی لیتے جذبے سے پردہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔
”تم سچ کہہ رہے ہو...... کون ہے وہ؟“ وہ بے تحاشہ خوش ہوئیں۔
”کچھ دیر ٹھہر جائیے آپ کو ضرور بتاؤں گا۔“ امی کی خوشی نے ان کے دل میں چھپے اندیشوں کو موت کی نیند سلادیا تھا اور شاید اب وہ بھی پرسکون نیند سونے والے تھے۔
”میں تو بڑی امید سے آئی تھی کہ بس جلدی سے تم دونوں کے ہاتھ پیلے کردینے ہیں۔ اب تم کہتے ہو تو رک جاتی ہوں۔“ انہوں نے دل ہی دل میں بچوں کی خوشی کے لیے دعائیں کیں اور اسے سونے کا کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

***

راستے کا اندھیرا اور ویرانی اسے اپنے وجود میں اترتی محسوس ہورہی تھی۔ گاڑی میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی اور ویسی ہی گمبھیر خاموشی ان دونوں کے درمیان تھی۔ اس کی دل سے خواہش تھی کہ ساتھ بیٹھا انسان اس سے کوئی سوال جواب نہ کرے ورنہ اس کی آنکھوں میں چھپا دریا لمحے میں سارے راز افشاں کرسکتا تھا۔

"تم پریشان ہو؟" اس کی خواہش تشنہ رہ گئی۔
"نہیں۔" اس نے یک لفظی جواب بھی کیسے دیا تھا یہ وہ ہی جانتی تھی۔
آج سب کچھ اس کی سوچوں کے برعکس ہو رہا تھا۔ آج اس کے حوصلوں کے سارے بند بہہ گئے تھے، اس نے اپنے ارزاں وجود کو سفید حویلی کی دیواروں سے آزاد کر لینا چاہا لیکن اس کی قسمت نے اسے اسی حویلی کے مردوں کے درمیاں گھما کے رکھ دیا تھا۔ اسے جو شخص مہرباں لگا اسی نے نقب لگائی تھی اور تاشفین علی چٹھہ کو دیکھ کر اس نے سوچا حویلی کے باغ میں اس کی لحد تیار ہوگی لیکن سب خیالوں کی تردید ہو رہی تھی۔ جن مردوں کے ظلم اور حیوانیت کے قصے وہ حورالعین سے سنتی آئی تھی آج وہی مرد اس کے پاسبان بنے ہوئے تھے...... کوئی سوال کیے بنا، کوئی الزام لگائے بغیر۔
"تمہارے لیے پیزا لے کر آیا تھا پیچھے سے اٹھالو۔" اس نے بات بدلی سو نورالعین نے سکون کا سانس لیا۔
"مجھے بھوک نہیں ہے۔" پیزا شدید پسند ہونے کے باوجود اسے طلب نہیں ہو رہی تھی۔
"پیزا ہو اور تمہیں بھوک نہ ہو...... نوری باجی آپ ٹھیک ہیں؟" عبدالودود کا حیران انداز و لہجہ اسے مسکرانے پہ مجبور کر گیا۔
وہ اتنا بھی آدم بیزار نہیں تھا جتنا اس نے سمجھ رکھا تھا۔ اس کی پسند سے بھی واقفیت رکھتا تھا اور آج ہی کے دن یہ بھی معلوم ہوا کہ شعلہ بنے رہنے والا انسان نرم لہجے میں بات کرنا جانتا تھا۔
"میں آپ کی باجی نہیں ہوں۔" اس سنگین ماحول میں بھی وہ باجی لفظ ہضم نہیں کر پائی تھی۔
"بہنیں باجیاں ہی ہوتی ہیں۔" اس نے اسٹیئرنگ سے ایک ہاتھ ہٹاتے ہوئے اس کے سر پہ ہلکی سی چپت لگائی۔
اس کے مان بھرے لہجے نے نورالعین کو یک دم خاموش کر دیا۔
"تھوڑا سا ہنسا مسکرا لیا کرو، بڑی امی تمہارے لیے بہت پریشان رہتی ہیں۔" وہ آج اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے بڑی امی کے خدشات سے آگاہ کر رہا تھا۔
"ان کا پریشان رہنا میرے لیے کچھ بہتر نہیں کر سکتا۔ میں انہیں بارہا کہہ چکی ہوں میرے لیے دعا کیا کریں۔" اس نے پختہ لہجے میں جواب دیا کہ عبدالودود کے وجود میں طمانیت پھیل گئی۔
سعد علی چٹھہ سے اس کے تعلقات ہمیشہ خراب رہے تھے۔ حورالعین کا وجود حویلی میں نہ ہونے کے برابر تھا لیکن اس کے باوجود نوری کے لیے اس کی فکرمندی کم نہیں ہوتی تھی۔ اس کی خاموش طبیعت اپنے والدین کے برعکس تھی، اس کے خدوخال اور خیالات میں بڑی امی کی جھلک واضح تھی اور اس سفر میں چند گھنٹوں کے دوران وہ اس کے لیے بے حد اپنائیت محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ سعد علی چٹھہ کی بیٹی ہے اس بات سے اسے نہ پہلے کبھی فرق پڑا تھا اور نہ آج پڑ رہا تھا جب کہ ان دونوں کے تعلقات میں بے حد بگاڑ آ چکا تھا۔
"کتنا سفر باقی ہے؟" چند پل کی خاموشی کو اس کے سوال نے توڑا۔
"ایک گھنٹہ لگے گا، تم تھک گئی ہو تو سیٹ پیچھے کر کے لیٹ جاؤ۔" اس کے انداز میں فکرمندی تھی، وہ اس کے مسلسل سفر سے آگاہ تھا سو اسے آرام کا مشورہ دینے لگا۔

ہسپتال کی راہ داری میں بے تحاشا رش تھا۔ لوگوں کا آنا جانا اک تسلسل سے جاری تھا۔ اس کے زخموں کی مرہم پٹی ہو گئی تو اس نے راہداری کے اختتام کی جانب قدم بڑھائے جہاں اذلان کو رکھا گیا تھا۔ وہ لوگ جب تک یہاں پہنچے تب تک اس کو اچھے سے دیکھ لیا گیا تھا اور اسے قدرے بہتر حالت میں دیکھ کر ماما پاپا مطمئن ہوئے تھے۔ ماما اسے زبردستی

ڈاکٹر کے پاس لے گئیں، اپنے زخم صاف کروانے اور ضروری ہدایات کے بعد وہ واپس اذلان کے کمرے میں آئی۔ اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ دھیما سا مسکرایا۔ وہ جو سمجھ رہی تھی کہ اس افراتفری میں وہ Light Hose کے راستے میں ہونے والی باتیں بھول چکا ہوگا، وہ محض اس کی خام خیالی تھی۔ اس کی نگاہوں میں اب بھی ان لمحات کا عکس واضح تھا۔ وہ یہ سب نظر انداز کرنا چاہتی تھی لیکن اس کی نگاہیں اسے اک ڈور سے باندھ رہی تھیں، بھولنے کی ہر کوشش وہ ناکام بنا رہا تھا۔

"اذلان حیدر شاہ...... تمہاری یہ کوششیں میرے لیے مشکل پیدا کررہی ہیں۔" وہ بلند آواز میں اسے انتباہ کرنا چاہتی تھی لیکن سب کی موجودگی کے باعث بڑبڑا کے رہ گئی۔

"تم کچھ کہہ رہی ہو؟" ماما نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"نہیں...... نہیں تو۔" وہ ہڑبڑا کر بولی اور اس کے انداز سے وہ بے تحاشہ محظوظ ہوا۔ اس کی مسکراتی آنکھیں لامیہ کو خفت میں مبتلا کرگئیں۔

"انکل...... میں اب ٹھیک ہوں۔ آنٹی کی طبیعت بہتر نہیں ہے آپ انہیں لے کر چلے جائیے۔" اس نے سنجیدہ لہجے میں انہیں مخاطب کیا اور اس کی بات کا پس منظر لامیہ کو خوب اچھے سے سمجھ آرہا تھا۔

"نہیں بیٹا میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ کو یہاں چھوڑ کر قطعاً نہیں جاسکتی۔" اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ماما کے جواب نے حالات بدل دیے۔ لامیہ کی مسکراہٹ نے اسے تپانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

"میں نے باجی اور بھائی جان کو خبر کردی ہے، وہ لوگ آتے ہی ہوں گے پھر ہم چلے جائیں گے۔" اس اطلاع نے لامیہ کا مسکراتا چہرہ ساکت کردیا تھا۔

"انکل...... میں ٹھیک ہوں، آپ نے بلاوجہ انہیں اطلاع دے دی۔" وہ جو فرصت کے لمحات گزارنے کا تمنائی تھا اس خبر پہ بے چین ہوا۔ لامیہ کے چہرے پہ پھیلتا خوف اسے مزید پریشان کررہا تھا۔

"آپ کو ڈاکٹر نے دو دن کا ریسٹ کہا ہے اور دو دن، ہم ان سے یہ بات نہیں چھپا سکتے تھے اس لیے مجھے ان کو بتانا بہتر لگا۔" پاپا کے تفصیلی جواب نے اسے خاموش کرادیا۔

اس کے موبائل پہ سبین کی کال آرہی تھی سو وہ خاموشی سے کمرے سے باہر چلی آئی۔ اس کی خاموشی اور کمرے سے جانے کو اذلان نے گہری نگاہوں سے دیکھا۔

"کیسی ہو؟" فون اٹھاتے ہی سبین نے فکرمندی سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔"

"وہ کیسی ہے؟" یہ سوال اذلان کے متعلق تھا۔

"وہ بھی اب بہتر ہے۔" وہ چند لمحے قبل سبین سے نہ جانے کون کون سی باتیں کرنا چاہ رہی تھی لیکن اس لمحے دماغ سلیٹ کی مانند خالی ہوچکا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پارہی تھی اب اس سے کیا کہے۔

"کیا ہوا؟ تم پریشان لگ رہی ہو۔" وہ اس کی خاموشی محسوس کرگئی۔

"نہیں...... پریشان نہیں ہوں۔" اس کے روکھے انداز سبین کی سمجھ سے باہر تھا۔

"ایک منٹ...... میں سمجھ گیا۔"

"کیا......؟" وہ ایک دم اتنا پرجوش بولی کہ لامیہ چونکی۔

"وہ پاگل تم کو لو یو کہتی...... تجی بولنا۔" سبین کے لہجے میں یقین تھا۔ وہ حیران سی بس اس کی بات سن کے رہ گئی۔

اذلان اسے کچھ ایسا کہہ گیا یہ سبین کو کیسے پتا تھا۔
"تمہیں کیسے پتا؟" وہ نہ چاہتے ہوئے پوچھ بیٹھی۔
"تم بس بے وقوف...... اس کالو کو سب کو نظر آتی تمہاری بڑی بڑی آنکھ بیکار ہوتی کیونکہ تم اس کالو کو نہیں دیکھتی۔"
سبین کا بس نہیں چل رہا تھا اس کے سر کو زور زور سے جھٹکا دے کر دماغ کی بند کھڑکیاں کھول دے۔ عام وقت ہوتا تو اس کی گلابی اردو لامیہ کو ہنسا ہنسا کے پاگل کر دیتی لیکن اس لمحے اس کی حسیات کام کرنا چھوڑ چکی تھیں۔
"میرے کو جواب دو۔" لامیہ کی خاموشی اسے بری لگ رہی تھی۔ وہ سبین کو کچھ جواب دینے کا سوچ رہی تھی کہ راہداری کی دوسری جانب سے اذلان کی فیملی اس طرف کو آتی نظر آئی۔ اگلے چند لمحات میں کیا ہونے والا تھا یہ سوچ کر ہی اس کو خوف آنے لگا۔ طیبہ حیدر شاہ کو اس کی اذلان کے ساتھ دوستی عام حالات میں پسند نہیں تھی اب تو اس کی وجہ سے ان کا بیٹا زخمی تھا، وہ کیا طوفان اٹھانے والی تھیں یہ اس سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔
"میں تمہیں بعد میں کال کرتی ہوں۔" اس نے ان کے قریب آنے سے پہلے سبین کی کال بند کر دی، وہ اپنا بھرم کسی دوسرے کے سامنے ٹوٹتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔
"اذلان کہاں ہے؟" اس سے چند قدم کے فاصلے پہ کھڑے ہو کر طیبہ حیدر شاہ نے پوچھا۔ وہ آداب ملاقات نبھانا چاہتی تھی لیکن مقابل کا رویہ اتنا خشک تھا کہ وہ کمرے کی جانب اشارہ کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکی۔
"آپ کیسی ہو؟" خشک لمحات میں نرم لہجہ حیدر شاہ کا تھا۔
"میں بالکل ٹھیک ہوں، اذلان بھی ٹھیک ہے۔" وہ نرمی کا جواب سختی سے نہیں دے سکی سو آواز میں تناؤ کم کرنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ وہ دونوں کمرے میں جا چکے تھے اور وہ سر دراہداری میں کھڑی سوچ کے منجدھار میں ڈوبی ہوئی تھی کہ یہاں کھڑی رہے یا آنے والوں کے پیچھے جائے حالانکہ یہاں رہ کر ان کی تلخ نگاہوں سے محفوظ رہ سکتی تھی جب کہ یہ رویہ نامناسب بھی تھا۔ اس نے حوصلہ مجتمع کرتے ہوئے اپنے قدم اندر کی جانب بڑھا دیے۔ وہاں حسب معمول حادثے اور اذلان کی حالت کے متعلق گفتگو جاری تھی، طیبہ حیدر اذلان کا ہاتھ پکڑے اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔
"آپ لوگ تھک گئے ہوں گے اگر چاہیں تو واپس چلے جائیں۔" حیدر شاہ نے پاپا کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے اٹھ کھڑے ہوئے۔
"فاطمہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ورنہ میں ضرور رکتا لیکن آپ بے فکر رہیں میں رات میں چکر لگاؤں گا۔" انہوں نے محبت سے اذلان کا کندھا تھپکا اور رخصتی کے لیے اجازت چاہی۔ لامیہ نے الوداعی نگاہوں سے بستر پہ لیٹے انسان کو دیکھا کہ نہ جانے دوبارہ کب اس سے ملاقات ہوگی۔
"ابراہیم...... اگر برا نہ لگے تو لامیہ کو یہاں ہی چھوڑ جاؤ۔" لامیہ کے قدم دروازے کے بالکل قریب پیچھے سے آتی آواز پہ تھمے، یہ طیبہ حیدر شاہ کی آواز تھی اور اس جملے کی توقع یہاں موجود سبھی افراد کو حیرت میں ڈال گیا تھا۔
"یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور بہتر وقت گزار سکتے ہیں۔ ہمارے ساتھ تو یہ چند منٹ بمشکل گزارے گا۔" یہ وضاحتی لہجہ اس نے پہلی بار سنا تھا۔ اس نے نافہم نگاہوں سے ماما کی جانب دیکھا لیکن وہاں اطمینان تھا۔
"اگر لامیہ رکنا چاہتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" پاپا کے جواب پہ سب کی سوالیہ نظریں اس پہ مرکوز ہوئیں۔ اس کے پاس اثبات میں سر ہلانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔

کبھی یوں بھی آ میرے روبرو
تجھے قریب پا کے میں رو پڑوں

مجھے منزل عشق پہ ہو یقیں
تجھے دھڑکنوں میں سنا کروں

سبین کی جانب سے آنے والا میسج اسے اپنی ہی نگاہوں میں چور بنا گیا۔ اسے یوں لگا کہ یہ پیغام سب کی سماعتوں کی نذر ہو گیا۔ اسے خوامخواہ سبین پہ غصہ آیا تھا۔
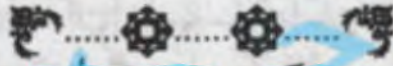
رات کی تاریکی میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ سب کچھ اپنے اندر چھپا لیتی ہے۔ اس کا دبیز دامن سب کے آنسو پونچھ لیتا ہے۔ اندھیرے کی یہ خصوصیت ازل سے ہے اور ابد تک رہنے والی ہے۔ سفید حویلی کی اونچی دیواروں تلے رات کی اوٹ میں کوئی سایہ، بہت خاموش اور مدھم قدموں سے ایک جانب بڑھ رہا تھا۔ ان کے انداز میں خوف کی بجائے بے خودی تھی، جیسے قدموں کے لیے راستہ انجان نہ ہو، جیسے یہاں آنا ان کا معمول ہو۔ باغ میں لگے قد آور درخت اس وقت بہت بھیانک لگ رہے تھے۔ باغ کے وسط میں لگا فوارہ جو سالوں سے بند ایک نشانی کے سوا کچھ نہیں تھا، دو قدموں نے اس کے قریب رکتے ہوئے سہارا لیا اور پھر ٹوٹے بکھرے حوصلے کو لیے چند قدموں کا فاصلہ پل صراط سا عبور کیا اور اپنا بوڑھا کانپتا جسم وہی گرادیا۔ زمین سے چند بالشت اونچی سفید پتھر کی چہار دیواری میں ان کا دل دھڑکتا تھا یوں کہہ لو ایک مٹی کا پنجرہ جس میں ان کی روح قید کردی گئی۔ اس پنجرے کی دیوار پہ اس کے مالک کا نام کندہ تھا لیکن وہ کتبہ دیکھے بغیر بھی یہاں کے مکین کو جانتی تھیں، ان کی کوکھ سے یہاں تک کا سفر بہت جلدی اس نے طے کیا تھا۔ نورالعین کے یوں چلے جانے نے انہیں کئی سال پہلے کے دردناک ماضی سے وابستہ کردیا تھا۔ وہ تب بھی روئی تھیں اور آج بھی آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ اس وقت وہ احمد علی چٹھہ کے پاس اک امید سے گئی تھیں لیکن آج ان کی امیدوں کے دیے روشن نہیں تھے۔ کئی سال پہلے ان کی امید سفید کفن میں اس بری طرح لپیٹی گئی کہ سالوں بعد آج ان حالات میں وہ خود اس امید کو دفن کرچکی تھیں اور جانے والی کو اتنی دور جانے دینا چاہتی تھیں کہ پکڑنے والے اس کی پیروں کی گرد نہ پاسکیں۔ ان کی دعائیں، التجائیں اب اس کی واپسی کے لیے نہیں تھیں بلکہ اس کی سلامتی کے لیے تھیں حالانکہ وہ جانتی تھیں یہ چہار دیواری جتنی بھی ظالم سہی باہر کی دنیا سے کم تھی۔ کوئی بہت خاموشی سے ان کے پہلو میں آن بیٹھا کہ ایک لمحے کو وہ چونکیں۔ حورالعین کو پہچاننے میں انہیں لمحہ نہیں لگا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آنسو اس اندھیرے میں موتیوں کی مانند چمک رہے تھے۔ وہ جو اسے تسلی دینے کو ساتھ لگانے لگی تھیں اس کی اگلی حرکت پہ دم بخود رہ گئیں، وہ ایک دم پاگلوں کی طرح اپنے ہاتھوں سے مٹی کھرچنے لگی۔

”یہ کیا کررہی ہو؟“ وہ کسی طرح اس کے ہاتھ روک نہیں پائیں۔

”وہ یہاں ہی تو آئے گی، میں خود اس کی رہائش تیار کرتی ہوں، میں خود اس کا گھر سجاؤں گی۔ آپ کو بڑی فکر رہتی تھی کہ آپ کے دل کا ٹکڑا یہاں اکیلا ہے اسی لیے آپ نے میرا دل بھی نوچ لیا۔“ بولنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ہاتھ تیزی سے چلا رہی تھی۔

”حور پاگل مت بنو، کیوں میرا وجود چھلنی کررہی ہو۔“ اب کے انہوں نے سختی سے اسے پیچھے کھینچا۔

”مجھے میری بیٹی لادیں بی جان...... اللہ کے واسطے مجھے میری بیٹی لادیں۔“ ساری عمر جس وجود سے فاصلہ رکھا آج اس درد نے انہی اس ہی گود میں لا گرایا تھا۔

آج وقت نہیں تھا حساب کتاب کا ورنہ بے شمار سوال حل ہونے کے منتظر تھے۔ وہ اسے کوئی جواب دینے والی تھیں کہ حویلی کا گیٹ کھلنے اور گاڑی کی آواز نے ان کے حواسوں پہ کاری ضرب لگائی۔ وہ جس لمحے سے ڈر رہی تھیں وہ آن پہنچا

تھا۔اب تسلی،دلاسے دینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔
”آہ......! انور بی بی، تمہاری قسمت میں بیٹیوں کے دکھ سے مرنا لکھا ہے۔“ انہوں نے ایک لمبی سانس لی اور خود کو کسی انہونی کے سپرد کر دیا۔
”بی جان ایسے نہ کہیں، میں مر جاؤں گی۔“ ان کی ہائے نے حورالعین کے اوسان خطا کر دیئے۔
”میں بھی زندہ لاش ہی ہوں اب شاید یہ جسم اتنا بوجھ بھی نہ اٹھا سکے۔“ انہوں نے گھٹنوں پہ دباؤ ڈال کر اٹھنے کی کوشش کی۔
”بی جان......نور بی بی آگئیں۔ عبدالودود صاحب اپنے ساتھ لائے ہیں۔“ یہ اطلاع دینے والی گل تھی اور اس کے لہجے کی خوشی ان کے سارے خوف اسی مٹی میں دفنا رہی تھی۔
”میری نوری......سنا بی جان وہ آگئی، اے میرے مالک تیرا شکر ہے۔“ حورالعین ایک لمحہ وہاں نہیں رکی۔ انہوں نے الوداعی نگاہوں سے سفید کتبے کو دیکھا اور اپنا وجود مٹی پہ ڈھیر ہوتا محسوس ہوا۔
”بی جان......کیا ہوا آپ کو؟“ ان کی سماعتوں میں گل کی آواز کے بعد کوئی آواز نہیں آئی۔ گل ان کو اٹھانے کی ناکام کوشش کرنے کے بعد اندر مدد لینے کو بھاگی جہاں حورالعین بیٹی کو ساتھ لگانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھیں اور مقابل مانو کوئی پتھر کا بت کھڑا تھا۔ گل کا فق چہرہ دیکھا اور اس کی بات سن کر سب اس کے پیچھے باغ کی طرف بھاگے تھے۔

......❁......❁......

یونیورسٹی کو جاتی طویل راہداری پہ بے انتہا رش تھا۔ رنگ برنگے آنچل لہرا رہے تھے، بھانت بھانت کی آوازیں تھیں۔ وہ دونوں گفتگو میں مگن لیکن تیز تیز چل رہی تھیں کہ ڈیپارٹمنٹ ابھی کافی دور تھا۔
”اس سال آپ دوڑ کے مقابلے میں شرکت کرنے والی ہو؟“ اپنے بالکل قریب مردانہ آواز سن کر وہ دونوں بری طرح چونکیں۔ عزت نے قہر بار نگاہوں سے آواز کے ماخذ کو دیکھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی غصہ پی گئی کیونکہ مقابل کے چہرے پہ بلا کی معصومیت تھی۔
”اس بار چھوڑ رہی ہوں آئندہ ایسے اچانک پیچھے سے آ کر بولا تو دو لگا دوں گی۔“ شہادت کی انگلی سے متنبہ کرنے پہ ہی اکتفا کیا گیا۔
”میں تاں پینڈو سا بندہ ہوں، مجھے یہ شہری آداب نہیں آتے۔ دوڑ لگا کر آپ تک پہنچا ہوں اس پہ بولنے سے بھی منع کیا جا رہا ہے۔“ حنان کے نروٹھے انداز پہ عزت کا غصہ کم ہوا تو کنزی بے ساختہ مسکرائی۔
”یہ بھی ایک الگ ہی آئٹم ہے۔“ کنزی کی بات پہ مسکراتے ہوئے عزت نے اثبات میں سر ہلایا۔
”ہاں جی مسٹر پینڈو......آپ کا گینگ آج کم کیوں ہے؟“ کنزی کو اسے تنگ کرنے میں مزا آ رہا تھا۔
”میں ان کا چوکیدار تھوڑی ہوں جو پل پل کی خبر رکھوں۔“ اس کے منہ توڑ جواب پہ کنزی حیران ہوئی۔ اس کی شکل سے غلط اندازہ لگایا گیا تھا۔
”لو ایک تو آ گیا۔“ عزت کی نظر اپنی طرف آتے اویس پہ گئی۔
”یہاں محفل کس خوشی میں سجائی گئی ہے۔“ وہ ان سب کو اکٹھا دیکھ کر خوشگوار حیرت کا شکار ہوا۔
”آپ کے آنے کی خوشی میں بالکل بھی نہیں۔“ اب کی بار بھی بولنے والی کنزی تھی۔ اس کے تیکھے لہجے پہ اویس نے چونک کر اسے دیکھا۔
”آپ بھی بول لیتی ہیں؟“ وہ عزت کی گوہر افشانیوں سے محظوظ ہوا لیکن کنزی کے متعلق اس نے کوئی رائے قائم نہیں کی۔

"آپ سے کس نے کہہ دیا میرے منہ میں زبان نہیں ہے۔" وہ تڑخ کر بولی۔ عزت مسکراتی نظروں سے ان کی نوک جھونک دیکھ رہی تھی۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یونیورسٹی کے اولین مہینوں میں ان دونوں کی دوستی دو کے دائرے سے نکل جائے گی۔ اس کے خیالات اور سوچیں کم ہی کسی دوسرے سے مناسبت رکھتی تھیں لیکن یہاں معاملہ الٹ تھا، حنان اور اویس کی جانب سے اسے کنزی جیسا رویہ ہی ملا تھا مطلب کہ وہ اس کی کڑوی کسیلی سنتے بھی تھے اور ساتھ بھی رہتے تھے۔ مجتبیٰ کے متعلق اس کی رائے پختہ نہیں ہوئی تھی، کبھی وہ اسے اپنا ہم خیال لگتا اور کبھی بالکل انجان جیسے کوئی سروکار نہ ہو۔

"میرا خیال ہے ہمیں ہی جانا پڑے گا ڈیپارٹمنٹ چل کر یہاں نہیں آئے گا۔" حنان نے پرسوچ انداز میں اس طرح سے کہا کہ سب کے لبوں پہ مسکراہٹ رینگ گئی۔

"کیا آج مجتبیٰ نہیں آئے گا؟" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ بیٹھی کیونکہ اکثر وہ سب اسی راستے میں اکٹھے ہو جاتے تھے۔

"کیا مجھے یاد کیا جا رہا ہے؟" اسی پل آنے والی آواز پہ وہ جی بھر کے شرمندہ ہوئی۔ اس کا پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔

"ارے بھائی...... شکر کرو تم بچ گئے، ورنہ میرے اسی انداز میں بولنے پہ دو لگانے کی دھمکی مل چکی ہے۔ میں تو ڈر گیا ہوں کیونکہ دو کی وضاحت نہیں ہوئی...... تھپڑ ہوں گے یا جوتیاں؟" عبدالحنان نے اس قدر دکھی لہجے میں کہا کہ عزت گھورنے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔

"ہاں تو احتیاط کیا کرو ناں، تمہیں نہیں پتا یہاں کسی کو معافی نہیں ملتی۔" اویس نے ساتھ اس کے بازو پہ چٹکی کاٹی۔

ان سب کی باتوں کا محور عزت بن چکی تھی لیکن اسے اپنا مرکز گفتگو بننا پسند نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اپنی رفتار تھوڑی تیز کر دی تا کہ ان سے آگے نکل جائے۔ اسی لمحے اس کی نگاہ حازم بھائی پہ پڑی جو دیگر کولیگز کے ساتھ جرنلزم ڈیپارٹمنٹ کے قریب کھڑے تھے اور ان کے بالکل ساتھ افشین نعیم تھی جو اپنے کھلے بالوں کو اک ادا سے بار بار کانوں کے پیچھے کر رہی تھی۔ یہ منظر ہمیشہ کی طرح آج برا نہیں لگا تھا، وہ افشین کے متعلق ان کی پسندیدگی قبول کر رہی تھی یا اس کی اپنی ترجیحات بدل چکی تھیں، وہ وجہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

"آپ نے بتایا نہیں کہ آپ میرا کیوں پوچھ رہی تھیں؟" وہ آہستہ قدموں سے چلتا پھر اس کا ہم قدم ہوا۔

"آپ تاخیر سے نہیں آتے اس لیے پوچھ لیا۔" وہ چند لمحے پہلے والی شرمندگی پہ قابو پا چکی تھی۔

"میں کچھ اور سمجھا......"

"کیا......؟" اس کی آنکھوں میں شرارت واضح تھی لیکن نہ جانے وہ کیا سمجھی۔

"مجھے لگا آپ کو کوئی کام ہوگا۔" اس نے ادائے بے نیازی سے کندھے اچکائے اور وہ کھول کر رہ گئی لیکن ایک مصنوعی مسکان چہرے پہ سجانا نہیں بھولی۔

یہ منظر کسی کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔

❁ ❁ ❁

ڈاکٹر اذلان کا مکمل چیک اپ کر کے جا چکا تھا۔ اس کی ساری رپورٹس ٹھیک آئی تھیں اور اگلے دن اسے گھر جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اس کے حوالے سے یہ خبر وہاں سب کو خوش کر گئی۔ لامیہ ڈاکٹر کے جانے کے بعد کمرے سے نکلی کہ وہ کچھ دیر ساری فیملی کو اکیلا چھوڑنا چاہتی تھی۔ آج طیبہ حیدر کا مزاج خلاف توقع ٹھیک تھا، ان کی نگاہوں کی تپش ختم تھی، زبان سے انگارے نہیں نکل رہے تھے اور وہ یہ سب دوبارہ شروع ہونے نہیں دینا چاہتی تھی اسی لیے مکمل احتیاط

رت رہی تھی۔ اسے بھوک کا احساس ہونے لگا تو اسٹاف سے پوچھ کر کافی اسٹینڈ کی جانب آئی، کافی کے ساتھ بسکٹ لے کر ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ ان لمحات میں بھی وہ اذلان کے الفاظ کو بھول نہیں پا رہی تھی باوجود اس کے وہ یہ سب یاد نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ وہ دوست تھے اور دوست ہی رہنا چاہیے لیکن اذلان کے اظہار نے اس کی سوچوں میں ادھم مچا دیا تھا۔ دل کے کسی کونے میں بغاوت کا پرچم لہرانے لگا تھا۔ وہ یہ سوچ چکی تھی کہ ابھی وقت زیادہ نہیں گزرا، ابھی لمحوں کی غلطی اختیار میں تھی، دل کی سازشوں پہ قابو پانا مشکل نہیں تھا، وہ اسی موڑ سے اذلان کو واپس پلٹا سکتی تھی اور یہ کوشش بہت جلد کرنے والی تھی۔

”میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟“ اس آواز کو اس نے اپنا وہم سمجھا لیکن سر اٹھاتے ہوئے وہم حقیقت کا پیرہن اوڑھ چکا تھا۔

”جی......“ سمٹ کر بیٹھتے ہوئے وہ محتاط ہوئی۔ اس نے ایک نگاہ اپنے کپڑوں پہ ڈالی، وہ ابھی تک ٹریکنگ سوٹ پہنے ہوئے تھی اور حالات ایسے تھے کہ تبدیل کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ وہ ہمیشہ اس کے رہن سہن پہ تنقید کرتی آئی تھیں سو وہ خود کو آنے والے لمحات کے لیے تیار کرنے لگی۔

”فاطمہ بتا رہی تھی تمہیں بھی چوٹیں آئی تھیں، اب ٹھیک ہو؟“ وہ اس لہجے کی کہاں عادی تھی سو حیرانی فطری تھی۔ اس نے صرف اثبات میں سر ہلایا۔

”تم سوچ رہی ہوگی کہ میں نے تمہیں یہاں کیوں روک لیا؟ میں تمہاری حیرانی سے واقف ہوں اس لیے زیادہ دیر کرنا مناسب نہیں سمجھا اور فوراً تم سے بات کرنے چلی آئی۔“ ان کے لہجے کی کھنک اور رعب اس وقت کہیں دور جا سوئے تھے، جو متانت ان کے انداز و بیان سے جھلک رہی تھی اس سے واقفیت کا کوئی لمحہ لامیہ ابراہیم کی یادداشت میں نہیں تھا۔

”میں سن رہی ہوں۔“ وہ نظریں جھکائے صرف اتنا ہی بولی۔

”اذلان تمہارے لیے دوستی سے بڑھ کے جذبات رکھتا ہے۔“ وہ اپنی بات شروع کر چکی تھیں اور آغاز ہی اس کے لیے حیران کن تھا۔ انہیں ان دونوں کی دوستی پسند نہیں تھی اور اب کہا اذلان کے جذبات پہ گفتگو کی جا رہی تھی۔

”میرے لیے وہ صرف ایک دوست ہے۔“ اس نے دل کے ایک شریر کونے پہ لہراتا پرچم اکھاڑ پھینکا اور نہایت مضبوط لہجے میں ان کی پہلی بات کی تردید کی۔ اسے یہ ہی کرنا تھا سو دور کھڑے پچھتاوے کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

ان کے لیے یہ انکار ناقابل یقین تھا تب ہی چند لمحے کی خاموشی دبے پاؤں وہاں سرک آئی تھی۔ وہ گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتی رہیں اور چند لمحے کے توقف کے بعد دوبارہ بات شروع کی۔

”میں تمہارے احساسات کا احترام کرتی ہوں لیکن کیا بہتر نہیں کہ تم میری بات سن لو......“ اس نے ازلی رعب کی ایک جھلک اس لمحے محسوس کی۔

”میں اس بات کا اقرار کرتی ہوں کہ مجھے تم دونوں کی دوستی ناپسند تھی اور اس کی وجہ بھی یہ ہی تھی کہ میں اذلان کی آنکھوں میں تمہارے لیے محبت دیکھ چکی تھی۔ میں اس کی ماں ہوں، اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی کوئی اور بن جائے اور میں انجان رہوں ایسا تو نہیں ہو سکتا۔“ اس نے خاموش رہ کر ساری بات سننے کا فیصلہ کیا۔

”میری ساری کوششیں اس نے ایک لمحے میں خاک کر دیں۔ آج اس نے تمہارے لیے اپنی جان داؤ پہ لگا کر میری ناپسندیدگی پہ شدید تمانچہ مارا اور مجھے اس دردناک حقیقت کا ادراک کروایا ہے کہ اس کے لیے سب سے اہم اور اول تم ہو...... تمہارے سامنے وہ کسی دوسرے کو اہمیت نہیں دینا چاہتا۔“ ان کا لہجہ اس شکست کا مظہر تھا جو انہیں اپنے بیٹے کے ہاتھوں کھانی پڑی تھی۔

ان کی باتیں لامیہ ابراہیم کو ہوا کے دوش پہ لہرانے کے لیے اکسار ہی تھیں کہ اس کی جنگ کوئی دوسرا جیت چکا تھا، جو عورت اسے بلانا پسند نہیں کرتی تھی آج اس کے سامنے برابری کی بنیاد پہ گفتگو کررہی تھی لیکن یہ سارے خیالات ایک لمحے کے تھے۔ وہ سامنے بیٹھی عورت کی بے بسی اپنے وجود میں اترتی محسوس کررہی تھی۔ اس نے ایسا کبھی نہیں چاہا تھا۔ وہ ان کی بات یہیں روک کران کے خدشات ختم کرنا چاہتی تھی۔ وہ انہیں کہنا چاہتی تھی کہ وہ ان کا ہی بیٹا ہے اور اس کی محبت اتنی خودغرض نہیں ہوسکتی کہ کسی کا بیٹا چھین لے لیکن وہاں سے خاموشی کی تلقین کی گئی تھی سو ناچار اسے خاموش رہنا تھا۔

"میں تمہاری محبت کی بساط پہ اپنے مہرے روک چکی ہوں، تم دونوں کے لیے میدان خالی کردیا ہے۔ میں چاہوں گی میرا بیٹا خوش رہے اور اس کی خوشی تم ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ میرے خیالات تمہارے متعلق بدل چکے ہیں لیکن یہ ضرور کہنا چاہوں گی کہ بدلاؤ لانے کی کوشش ضرور کروں گی۔" ان دونوں کے درمیان طویل خاموشی چھا گئی تھی۔

لامیہ کو احساس ہوا بات ختم ہوچکی ہے لیکن اب اس کے کہنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ اسے کس مشکل میں ڈال دیا گیا تھا وہ سمجھ نہیں پارہی تھی۔ ایک جانب اذلان کی محبت کو تسلیم کرلیا گیا اور دوسری جانب اس کے متعلق ناپسندیدگی باقی تھی۔ اس کے جواب کا انتظار ہی نہیں کیا گیا، اس پہ آج بھی اپنا فیصلہ ہی تھوپا گیا۔ اس نے چند لمحے سوچا اور اسے بہتر لگا کہ اس ماحول کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی رائے کے متعلق انہیں بتادے۔

"میں آپ کے اس بدلاؤ کی قدر کرتی ہوں لیکن اس فیصلے سے پہلے آپ کو میری رائے بھی جان لینا چاہیے تھی۔ اذلان میرے متعلق کیا سوچتا ہے آج سے پہلے میں مکمل بے خبر تھی۔ وہ ایک بہت اچھا انسان اور دوست ہے لیکن ساری زندگی گزارنے کے لیے یہ باتیں کافی نہیں ہوتیں۔ میں نے اسے کبھی دوست سے بڑھ کر کچھ نہیں سمجھا اور آپ کے خیالات سے آگاہی کے سبب اس دوستی میں، بہت سے اتار چڑھاؤ بھی آئے۔ میں آپ کو واضح بتارہی ہوں کہ جس نہج پہ آپ سوچ رہی ہیں اس سب کے متعلق میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا لیکن آپ کے بدلتے رویے کے سبب اب سوچنا ضرور چاہوں گی اور میں چاہوں گی اس کے یک طرفہ خیالات کو پذیرائی ملے کیونکہ اسے اداس دیکھنا میرے لیے بھی مشکل ہے۔" سب کچھ بول دینے کے بعد بھی اسے یوں لگ رہا تھا کہ کچھ باتیں وہ اب بھی مقابل کو سمجھا نہیں پائی۔

"اذلان کے خیالات کی قدر کرنا یا نہ کرنا تمہاری مرضی ہے، میں بس یہ کہنا چاہتی تھی کہ اب اس سب کے درمیان میں نہیں آنا چاہتی، یہ مکمل طور پہ تم دونوں کا فیصلہ ہونا چاہیے۔" اپنی بات مکمل کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور جیسے آئی تھیں ویسے ہی دبے قدموں واپس چلی گئیں۔

ان کی مدھم چال میں ٹوٹی ہوئی انا کا دکھ لامیہ کو صاف نظر آرہا تھا لیکن وہ اس کے متعلق اب مثبت سوچ رہی تھی۔ وہ ان کے ظرف کی قدر کررہی تھی اسی لیے اب انہیں وہاں اکیلا چھوڑنا ہی بہتر لگا۔ اس نے سبین کو شام میں گھر آنے کا میسج کیا اور خود وہاں سے واپسی کا سوچنے لگی۔

❀ ❀

کمرے میں ضرورت سے زائد افراد موجود ہونے پہ عجیب گھٹن زدہ ماحول ہوگیا تھا۔ ہر کسی کے چہرے پہ فکر و پریشانی تھی۔ ڈاکٹر کی موجودگی کے سبب کمرے میں خاموشی تھی لیکن نگاہوں ہی نگاہوں میں سب صورت حال سمجھنے کی کوشش کررہے تھے۔ نوری بی بے ہوش تھیں اور ان کی اس بے سدھ حالت نے ہر کسی کو بے چین کردیا تھا۔ نورالعین ان کے سرہانے بیٹھی نہ جانے کیا کیا پڑھ رہی تھی لیکن بے ہوشی ہنوز قائم تھی۔ عبدالودود ان کے قدموں میں بیٹھا اپنے ہاتھوں سے ان کے وجود کو حرارت دینے کی کوشش کررہا تھا۔ حویلی کے سارے افراد اس کمرے میں موجود تھے سوائے سعد علی چٹھہ کے اور

ان کا یا کثر ہی معمول تھا، اسی سبب کسی کو کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوا۔

"کیا ہوا ہے ڈاکٹر صاحب، کوئی پریشانی والی بات تو نہیں ہے؟" ڈاکٹر کے ہٹتے ہی سب کی سوالیہ نگاہیں اس پہ مرکوز تھیں لیکن سوال صرف احمد علی چٹھہ کی جانب سے آیا تھا۔

"انہیں شدید صدمہ پہنچا ہے، ذہنی حالت نہایت خراب محسوس ہو رہی ہے اور اس سے دیگر مسائل بھی جنم لے سکتے ہیں۔ میں نے انہیں ابتدائی علاج مہیا کر دیا ہے لیکن اگر یہ بارہ گھنٹے تک ہوش میں نہیں آتیں تو آپ انہیں ہسپتال لے جایئے گا۔" ڈاکٹر کے تفصیلی جواب نے سب کی پریشانی میں دگنا اضافہ کر دیا تھا۔

"عبدالودود...... ڈاکٹر صاحب کو باہر چھوڑ آؤ۔" بڑے ابا کے حکم پہ سر ہلاتا وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔

"شیماء...... ہماری غیر موجودگی میں حویلی میں کچھ ہوا تھا کیا؟" ان کے لہجے کی سختی بھرپور عیاں تھی۔

اس ایک سوال نے کمرے میں موجود سب افراد کو ساکت کر دیا تھا۔ نور العین کے ہاتھ بڑی امی کی پیشانی پہ رک گئے۔ شیماء بیگم کو حالات کی سنگینی کا احساس تھا لیکن صورت حال یہ ہو جائے گی کہ انہیں اکیلے ہی اس سب کی وضاحت دینی ہوگی یہ ان کے وہم و گمان میں نہیں تھا۔ وہ جانتی تھیں یہ معاملہ زیادہ دیر ان سے چھپا نہیں رہ سکتا لیکن بتا دینا بھی کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ وہ حویلی کی بڑی بہو تھیں، سارے معاملات دیکھتی تھیں لیکن اس سب میں بی جان کی حمایت حاصل تھیں، یوں اکیلے وہ کسی دوراہے پہ نہیں پھنسی تھیں۔

"میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔" ان کی طویل خاموشی نے ابا جان کے غصے کو مزید بڑھا دیا۔

حور العین ملتجی نگاہوں سے شیماء بیگم کو دیکھ رہی تھیں۔ ان دونوں میں کبھی اچھے تعلقات نہیں رہے تھے، وہ انہیں بلانے کی روادار نہیں تھیں لیکن آج ان کی اکلوتی بیٹی کی زندگی ان کے ہاتھ میں تھی۔ وہ جانتی تھیں انہوں نے اسے ہمیشہ اپنی بیٹی سمجھا تھا لیکن آج صورت حال مختلف تھی۔ آج حور العین کا بس چلتا تو وہ ان کے قدموں میں بیٹھ جاتی۔

"نہیں ابا جان...... حویلی میں تو ایسا کچھ نہیں ہوا جس کے باعث بی جان کی ایسی حالت ہو جائے۔" انہوں نے کس وقت سے جھوٹے لہجے کو پختہ کیا تھا یہ صرف وہ ہی جانتی تھیں۔

"لیکن کچھ تو ہوا ہے جس کی ہمیں خبر نہیں۔" وہ کمرے میں مسلسل چکر لگا رہے تھے۔

"ابا جان...... آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔" ان کی تشویش دیکھ کر سعد علی کو ان کے متعلق پریشانی لاحق ہوئی تھی۔

"اپنی بی جان کی حالت دیکھو کیسے دنیا جہان سے بے خبر ہو چکی ہیں، تمہارے سامنے ڈاکٹر کہہ کر گیا ہے انہیں کوئی صدمہ ہوا ہے اور جو بھی بات ہے اس کا تعلق اس حویلی سے ہے جو مجھے ہر حال میں جاننی ہے۔" ان کا کڑک لہجہ کمرے میں گونج رہا تھا۔

"چچی...... جب ہم لوگ آئے تب آپ اور بڑی امی دونوں عقبی باغ میں تھے، آپ کے اندر آتے ہی ان کی طبیعت خراب ہوئی تھی پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کو کچھ خبر نہ ہو۔" عبدالودود نہ جانے کس لمحے وہاں آن کھڑا ہوا اور اس کے سوال نے بجھتی ہوئی آگ کو دوبارہ ہوا دی۔ سب کی نگاہیں اب حور العین پہ مرکوز تھیں۔

"بتاؤ چھوٹی بہو۔" ان کے حکمیہ لہجے پر انہوں اس نے ایک نظر سامنے بیٹھی بیٹی کو دیکھا اور دوسری نگاہ عبدالودود پہ ڈالی جس کے سوال نے انہیں اک نئی مصیبت میں ڈال دیا تھا۔

"جب میں باغ میں گئی تو وہ قبر پہ سر ٹکائے ہوئے تھیں، مجھے محسوس ہوا وہ رو رہی ہیں لیکن میرے پوچھنے پہ انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔" انہوں نے نپے تلے لہجے میں جواب دیا۔

وہ جانتی تھیں اس جواب کے آگے کوئی سوال سر نہیں اٹھا پائے گا اسی لیے قدرے اطمینان نصیب ہوا۔ ابا جان چند لمحے اسے دیکھتے رہے اور پھر خاموشی سے کمرے سے نکل گئے۔

"آپ لوگ چلے جائیے، میں اور نوری یہاں موجود ہیں۔" اس نے بنا کسی کی طرف دیکھے کہا اور دوبارہ بڑی امی کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

ان چند لمحوں میں وہ اتنا تو جان گیا کہ کچھ ایسا تھا جو اس کی آنکھوں سے اوجھل تھا لیکن اگر کچھ چھپایا جا رہا تھا تو اس میں امی بھی شامل تھیں اور یہی سب سے حیران کن بات تھی۔ امی کی جانب سے ایسے رویے کی توقع اس نے نہیں کی تھی لیکن وہ حقیقت جان کر رہے گا یہ تہیہ اس نے کر لیا تھا۔
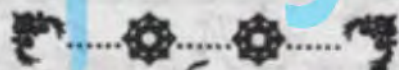
ساری رات غم واداسی کے گھنے پیڑ تلے کٹی تھی۔ انہوں نے کبھی ایک پل کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ اس بنگلے میں انہیں ایک رات اس طرح بھی گزارنی ہوگی کہ شفیق اور رحم دل مالک اس دنیا میں نہیں ہوں گے۔ اک بھی لمحہ ان کی یاد سے غافل نہیں گزرا تھا، نبیل کے بار بار آرام کرنے کے مشورے کے باوجود بھی وہ نرم بستر پہ کمر نہیں لگا پائے۔ انہوں نے اپنا وقت نوافل اور تلاوت کرنے میں گزارا۔ ظہر کے بعد شوکت حسین کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی گی اور اک باب دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ انگلینڈ سے آن لائن ان کی تدفین کے مناظر دکھائے گئے اور دکھی دل کے ساتھ انہوں نے تمام مہمانوں کو رخصت کیا۔

"عقیل...... اس گھر کی حفاظت تمہارے ذمے ہے۔ ہم لوگ چکر لگاتے رہیں گے لیکن مکمل دھیان تمہیں ہی رکھنا ہے۔" سب کو رخصت کرنے کے بعد وہ دونوں بھی جانے کے لیے تیار تھے۔

"صاحب جی...... سب ملازموں کو بھیج کر آپ نے یہ ذمہ داری مجھ پہ ڈال دی ہے۔ میں اتنی بڑی ذمہ داری نہیں سنبھال سکتا۔" وہ جوانی کی سرحد کو چھوتا ہوا لڑکا اس وقت عجیب بے بسی کا شکار تھا۔ وہ شریف اور دیانت دار تھا لیکن اتنی بڑی ذمہ داری اٹھاتے ہوئے ڈر رہا تھا۔

"مجھے سب ملازموں میں تم بااعتبار لگتے ہو۔ زیادہ فکر کرنے کی بات نہیں ہم دونوں اسی شہر میں ہوتے ہیں، کوئی بھی پریشانی ہو کال کر لینا۔ جب تک شوکت سر کی بیٹی نہیں آجاتیں تب تک یہ سب تم دیکھو گے۔ اس کے بعد ان کی مرضی جو وہ کرنا چاہیں۔" تاشفین نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا جو اس بات کا مظہر تھا کہ انہیں اس پہ بے انتہا یقین اور اعتماد ہے۔

سارے بنگلے کا ضروری قیمتی سامان ایک ہال میں کر کے اس کو تالا لگا دیا گیا۔ رقم اور زیورات برائے نام تھے لیکن انہیں بھی محفوظ جگہ رکھ دیا گیا اور ساری چابیاں نبیل کے مسلسل اصرار پہ تاشفین نے اپنے پاس رکھ لی تھیں اور باقی کی ذمہ داری عقیل کے سپرد کر دی گئی تھی۔

مجتبیٰ گھر آیا تو ہمیشہ کی طرح خاموشی نے استقبال کیا۔ اس نے متلاشی نگاہوں سے اردگرد دیکھا لیکن کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ پانی پینے کی غرض سے خود ہی کچن میں چلا آیا لیکن وہاں ماما کو دیکھ کر چونکا۔ وہ کونے میں رکھی کرسی پہ اپنے ہی خیالوں میں مگن بیٹھی تھیں۔

"ماما...... کیا ہوا، آپ ایسے کیوں بیٹھی ہیں؟" وہ پریشانی سے ان کے پاس آیا۔

"کچھ نہیں ہوا بس ایسے ہی......" صاف ظاہر تھا وہ اسے کچھ بتانا نہیں چاہ رہی تھیں۔

"ماما آپ مجھ سے کچھ چھپارہی ہیں۔" وہ ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔ اس کے انداز بتا رہے تھے وہ بات پوچھے بنا یہاں سے نہیں جائے گا۔
"تمہیں بھوک لگی ہوگی پہلے کچھ کھالو۔" وہ ایک بار پھر اسے ٹالنے کی کوشش کررہی تھیں۔
"میں سب کے ساتھ اکھٹے کھالوں گا۔" وہ جانتا تھا جن دنوں دادا آئے ہوتے تھے ان دنوں پاپا آفس نہیں جاتے تھے سو ابھی کچھ ہی دیر میں سب کو کھانے کے لیے اکھٹا ہونا تھا وہ انتظار کرسکتا تھا مگر اس وقت ماما کی پریشانی جاننا ضروری تھی۔
"تمہارے پاپا گھر نہیں ہیں صرف ہم دونوں ہی ہیں کھانے کے لیے۔" وہ اس کی بات کا پس منظر سمجھ گئی تھیں اس لیے کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی تاکہ صبیحہ کو میز پہ کھانا لگانے کے لیے کہہ سکیں۔
"میں آپ کو کچھ دنوں سے مسلسل پریشان دیکھ رہا ہوں اگر اب آپ نے نہیں بتایا تو میں پاپا سے پوچھ لوں گا۔" اس کی آواز نے ان کے بڑھتے قدموں کو روک لیا۔ وہ نا چاہتے ہوئے بھی واپس بیٹھ گئیں۔
"مجتبیٰ میں نے سالوں سے یہ سب اکیلے سہا ہے اور ہزار کوشش کی تمہیں ان معاملات سے دور رکھنے کی لیکن اب میں تھکنے لگی ہوں۔ اب یہ بوجھ برداشت کرنے کی سکت مجھ میں ختم ہوتی جارہی ہے۔" ان کا لہجہ اس قدر تھکا ہوا تھا کہ اسے اپنی لاعلمی پہ شرمندگی ہونے لگی۔
"اب آپ کو کچھ بھی برداشت کرنے کی ضرورت نہیں، آپ سارے معاملات مجھ پہ چھوڑ دیں۔ بتائیں کیا بات ہے؟" اسے اندازہ تو تھا کہ ماما کی پریشانی کا تعلق ضرور دادا سے ہوگا لیکن جاننا لازم تھا۔
"تمہارے دادا پیر شاہ آنے کا حکم دے گئے ہیں اور اس بار تمہارے بابا انکار نہیں کرسکے اور میری پہلے کبھی کسی نے سنی اور نہ اب کوئی سنے گا۔"
"بس اتنی سی بات پہ آپ پریشان ہیں؟"
"یہ اتنی سی بات نہیں مجتبیٰ...... وہاں کے ماحول سے تم واقف نہیں ہو۔ تم جانتے ہو جب مجھے علم ہوا کہ میرے وجود میں اک نئی زندگی پرورش پارہی ہے تو میں نے ہزار شدتوں سے بیٹی کی خواہش کی تاکہ اپنی اولاد کو شرک و توہمات کا حصہ نہ بننے دوں اور پھر تمہاری آمد پہ کیسے تمہیں وہاں سے شہر لائی یہ داستان بھی بہت لمبی ہے۔ تم اس خاندان کے اکلوتے وارث ہو، مختار احمد ہر حال میں تمہیں وہاں روکنا چاہیں گے، سارے معاملات تمہارے سپرد کرنا چاہیں گے اور اگر ایسا ہوگیا تو میری ساری زندگی کی محنت اور دعائیں اکارت جائیں گی۔ تم میری زندگی کا حاصل ہو میں تمہیں ضائع ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔" انہوں نے اپنے سارے خدشات اس کے سامنے عیاں کردیے تھے۔
"ماما...... آپ کو مجھ پہ بھروسہ نہیں ہے؟ آپ کو اپنی تربیت پہ اعتماد کرنا چاہیے، آپ کو مجھ پہ اعتماد کرنا چاہیے کہ میں آپ کی سکھائی باتوں کے خلاف کبھی نہیں جاؤں گا۔" ان کی ہر پریشانی اسی کے حوالے سے تھی اور اپنے ساتھ ان کی محبت وہ بخوبی جانتا تھا۔
"مجھے تم پہ یقین ہے مجتبیٰ لیکن میں مختار احمد کو بھی جانتی ہوں، وہ تمہیں قائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے اور تمہیں بڑوں کا ادب کرنا بھی تو میں نے ہی سکھایا ہے ناں۔" ان کی نگاہیں کسی نادیدہ مرکز پہ مرکوز تھیں جیسے پیر شاہ کے شب و روز کسی فلم کی طرح ان کی آنکھوں کے سامنے چل رہے ہوں۔
"ماما...... ادھر میری طرف دیکھیں۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر ان کا چہرہ اپنی طرف کیا۔ "آپ کو صرف مجھ پہ یقین رکھنا ہے، میں جاؤں گا اور آپ وہاں میرے ساتھ جائیں گی، اپنی بہترین تربیت کا عملی مظاہرہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں

جذبات رکھتا ہے اور ان کے لیے اس کی خواہش سے زیادہ اب کچھ بھی اہم نہیں ہے۔ وہ مجھے اپنا اکیس سال کا برا رویہ بھولنے کا کہہ رہی تھیں...... وہ ایسے بات کررہی تھیں جیسے سب بہت آسان ہو۔" وہ خود کو جتنا نارمل سمجھ رہی تھی اتنی نہیں تھی، اس کے اندر کوئی طوفان برپا تھا۔

اس کی باتیں سن کر وہ بھی کافی حیران ہوئیں۔ طیبہ حیدر شاہ کی نفرت، ناپسندیدگی ایک دم بدل گئی اور یہ الفاظ انہوں نے لامیہ کے متعلق کہے تھے، اب ان دونوں کی دوستی سے انہیں کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ وہ ہمیشہ ابراہیم کی بہن ہونے کا لحاظ کرتی آئی تھیں اس سب کے باوجود یہ بدلتا رویہ معمولی بات نہیں لگ رہی تھی جب کہ لامیہ کی طرف تو معاملہ ہی الٹ تھا، وہ کسی بھی معاملے میں ان کا لحاظ نہیں کرتی تھی۔

"ہوسکتا ہے اذلان کے رویے نے انہیں بدلاؤ کے لیے مجبور کیا ہو۔" وہ بھی یہ گتھی سلجھانے کی کوشش کررہی تھیں۔

"تو پھر آپ طیبہ حیدر شاہ سے واقف نہیں ہیں۔ وہ بڑی سے بڑی مجبوری کے آگے ہار نہیں مانتیں اور خود کی ہار تو بہت بعد میں آتی ہے۔" اس نے خالی مگ قریبی رکھی میز پہ رکھتے ہوئے انہیں جواب دیا۔

"کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔ میں نے ابراہیم سے ان کی ضد اور اٹل فیصلوں کے متعلق سن رکھا ہے لیکن اگر وہ تمہارے متعلق اپنے خیالات بدل رہی ہیں تو خوش آئند بات ہے۔ تم بھی اس کے متعلق سوچو۔" وہ ماں تھیں جو بھی ہو اذلان انہیں لامیہ کے لیے بہترین ساتھی لگتا تھا۔

"ماما...... سالوں کی کڑواہٹ چند شہد لمحوں سے دور نہیں ہوسکتی۔" سیڑھیوں پہ قدموں کی آواز سنائی دی تو دانستہ انہوں نے یہ موضوع ختم کردیا۔

"میں بہت تھک گئی ہوں اب آرام کروں گی۔" وہ بھی زخمی تھی لیکن اذلان کی حالت نے اسے خود سے بے نیاز کردیا تھا اب اپنے جسم کی تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ "اور ماما سبین آئے تو اسے میرے کمرے میں بھیج دیجیے گا۔" اس کے آخری الفاظ کمرے میں قدم رکھتے ہوئے پاپا نے بھی سنے تھے۔ وہ انہیں الوداعی مسکراہٹ سے نوازتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تھی۔

❁ ❁

مربع نما کمرے میں سنگیت کے سر اونچی آواز سے گونج رہے تھے۔ چار لڑکیاں دائرے میں گھومتے ہوئے رقص میں مصروف تھیں اور وہاں بیٹھے تماش بین نیم خوشی سے داد دے رہے تھے کیونکہ وہ یہاں ان چار کو نہیں بلکہ نازنین کو دیکھنے آئے تھے لیکن فی الحال اس کی آمد کے آثار ناپید تھے اسی اثنا میں وہاں مدھم سا شور پیدا ہوا اور ایک وجیہہ انسان کلف زدہ کپڑوں میں بڑے بڑے قدم اٹھاتا سیدھا نین تارا کی آرائشی مسند کی جانب آیا۔ اس کے مغرور انداز نے نین تارا کے پسینے چھڑا دیے لیکن ہونٹوں پہ ہلکی مسکراہٹ سجائے وہ مسند سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ نین تارا سے چند قدم کے فاصلے پہ کھڑا ہوا، اس کے ساتھ آئے شخص نے آگے بڑھ کے اس کے کان میں سرگوشی کی اور یہ ہی لمحہ تھا جب نین تارا کی آنکھوں میں ہوس کی چمک دوبالا ہوئی۔ اس کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ آنے والا چلتا پھرتا بینک ہوگا۔

"چوہدری صاحب...... آپ نے بلاوجہ آنے کی زحمت کی، یہ جگہ آپ جیسے شرفا کے آنے کے لائق تھوڑی ہے؟ آپ نے ہمیں بلا لیا ہوتا سر کے بل چل کر نہ آتی تو آپ نین تارا کو قدر دانوں کی فہرست سے نکال دیجیے۔" وہ اپنا ریشمی پلو سمیٹتی ان کے بالکل قریب آن کھڑی ہوئی۔ ڈھلتی عمر کی ادائیں مقابل کو ذرا نہیں بھائی تھیں۔

"ہم قدر دانوں کو مایوس نہیں کرتے لیکن اپنی خدمت میں تاخیر بھی برداشت نہیں ہوتی۔" اس نے پان کے رنگ سے اٹے دانتوں کی نمائش کی اور اسے نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ جو حسن کی بو سونگھتا گلی گلی گھومتا رہتا، رنگ برنگے پھولوں پہ بھنورا بن منڈلاتا رہتا، وہ نازنین کے جان لیوا حسن سے کیسے انجان رہ سکتا تھا۔ اس نے لاہور کی تاریخ دیکھ رکھی تھی لیکن لاہور میں کوئی تاریخی حسن بھی رکھتا ہے یہ اسے اب معلوم ہوا تھا۔ اس کے کانوں میں جیسے ہی اعلان پہنچا کہ کوئی اپسرا راستہ بھول کر پرستان کی بجائے بازار حسن میں بھٹک رہی ہے وہ سب کام چھوڑ کر یہاں آن پہنچا، وہ سفید پروں کا لمس محسوس کرنا چاہتا تھا، گمشدہ جہانوں سے آشنائی اپنا حق سمجھتا تھا سو یہ چند لمحوں کی تاخیر اسے پسند نہیں آرہی تھی۔

"لالی..... صاحب کو کمرہ خاص میں ادب سے لے جاؤ۔" نین تارا نے لالی کو آواز دی جس کی ٹانگوں پہ اس کے دیے زخموں کے نشان باقی تھے۔ "آپ تشریف رکھیے، میں آپ کی تلاش کو آپ کے روبرو لانے کی تیاری کرواتی ہوں۔" اس کے بگڑے انداز کی نین تارا نے ذرہ برابر پروا نہیں کی کیونکہ وہ انتظار کے کرب اور تڑپ سے بخوبی آگاہ تھی۔ وہ جانتی تھی دید کی طلب کیسے بڑھائی جاتی ہے۔ اک عمر کا تجربہ ایسے لوگوں کا منتظر ہی تو ہوتا تھا۔

سعد علی چٹھہ چار و ناچار لالی نامی انسان کے پیچھے چل دیا، جس کے بھدے چہرے اور لنگڑاتے وجود نے اسے بیزار کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ابھی تک تو اس کی امیدوں کے چراغ پانی پہ تیر رہے تھے، وہ جس آس کے ساتھ وہاں آیا تھا وہ اسے ڈوبتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

"تمہاری بتائی باتوں میں سے اک بات بھی جھوٹ نکلی تو تمہارے وارثوں کو غائبانہ نماز جنازہ پڑھنے کا حکم دے دوں گا۔" اس نے اپنے ساتھ آئے انسان کو قہر بار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ان کا راہبر بنا لالی مدھم آواز میں ہونے والی باتوں پہ مسکرا دیا۔ یہاں جو بھی آتا اس کے نخرے ایسے ہی ہوتے تھے لیکن جو بانصیب نازنین تک پہنچ جاتے ان کے قدموں کو واپسی کی راہ یاد نہیں رہتی تھی۔ وہ اس نشے میں ڈوب جاتے جوان کے ٹھکانوں کا عکس دھندلا کر دیتا تھا۔

"آپ یہاں انتظار کریں۔" خوشبو سے معطر کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے لالی نے نئے مہمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم یہیں رکو، وہ نازنین ہے تم جیسے اسے کمرہ خاص میں دیکھنے کا حق نہیں رکھتے۔" سعد علی چٹھہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے مینیجر کو لالی نے اس شدت سے واپس باہر کھینچا کہ وہ تلملا کے رہ گیا، زنانہ انداز رکھنے والے انسان کی یہ طاقت اسے برداشت نہیں ہوئی لیکن یہاں کچھ کہنا اپنی شامت بلانا تھا سو وہ خاموش ہو گیا۔ سعد علی چٹھہ نے لالی کے الفاظ سنے تو ہزار کوششوں کے باوجود خود کو بے نیاز ظاہر نہیں کر سکا، بے اختیاری انتظار کے شعلوں پہ دہکنے لگی تھی۔

وہ کتنے ہی پل بے چین قدموں سے کمرے میں ٹہلتا رہا، کبھی سرخ رنگ کے کپڑوں سے آراستہ بستر پہ بیٹھ جاتا اور کبھی اپنے کپڑوں پہ آنے والی نادیدہ سلوٹوں کو بے اختیار ٹھیک کرنے لگتا۔ اس کے قدموں نے ہر راہ دیکھ رکھی تھی لیکن اس بار کیا منفرد تھا وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ یہ شاید گیارہواں چکر تھا جب چھن چھن کی آواز نے اس کے قدموں کو ساکت کیا اور نہ جانے کتنے لمحے گزرے، جب یہ آواز اس کے عین پیچھے آ کے تھم گئی تھی۔

"یہ چند دن نازنین نے خود کو دان کیے تھے لیکن تمہارے نوٹوں کی کڑکڑاہٹ نے نین تارا کو اتنا مجبور کر دیا کہ وہ میرے پاؤں پہ پازیب کا سر پہنانے سے باز نہیں آئی۔ اب کسی عنایت کی امید مت رکھنا، چند لمحے دید کا مزہ لو اور اپنا راستہ ناپو۔" وہ اپنے سے چار قدم دور کھڑے انسان کی چوڑی پشت دیکھتے ہوئے بولی۔ ناگواری اس کے لہجے سے خوب عیاں تھی۔

سعد علی چٹھہ چھن چھن کے شور سے ڈوب کر ابھرا نہیں تھا کہ ادائے بے نیازی کا کڑا وار اس کی پشت پہ تیز دار برچھی کی مانند کیا گیا۔ آواز میں اتنی کڑک تھی تو حسن کیسا ہوگا؟ تصور کی رنگین مزاجی عروج پہ پہنچ گئی تھی۔

"جتنے تم نے پیسے دیے ہیں اتنے میں لوگ نازنین کی جوتیاں سیدھی کرتے ہیں، تم کس خوش فہمی میں منہ موڑے کھڑے ہو۔" اسے سامنے کھڑے انسان کی حرکت پہ شدید غصہ آیا تب ہی آگے بڑھتے ہوئے اس کے کالر کو پکڑ کر کھینچتے ہوئے جھٹکا دے کر رخ اپنی جانب موڑا۔ سعد علی چٹھہ کا کالر کھینچا گیا تھا، وہ انسان جو کسی کی اٹھی آنکھ برداشت نہ کرے اس حرکت پہ دم سادھے کھڑا تھا...... عجیب تھا، بے حد عجیب تھا۔ یہ جھٹکا اس کی انا پہ نہیں دل پہ لگا تھا۔ وہ مڑنے سے پہلے ہاتھ کے جوہر دکھانے کا ارادہ کر چکا تھا یہ بھول کر کہ سامنے صنف نازک تھی لیکن اک لمحے کی جھلک نے سب ارادے خاک کر دیے تھے۔ وہ کسی پری کا تصور کیے وہاں آیا لیکن وہاں تو کوئی جادوگرنی کھڑی تھی۔ اس نے کوئی سحر ہی تو پھونکا تھا جس نے کھلا ہاتھ بند مٹھی بنا دیا تھا۔

"میں نے تو سنا تھا تم کوئی دیوی ہو، پریوں سا حسن رکھتی ہو لیکن تم تو کوئی جادوگرنی ہو، نگاہوں سے باندھتی ہو، ہونٹوں سے پھونکتی ہو اور ہاتھ اٹھا کر سب راکھ کر دیتی ہو۔" سعد علی کے الفاظ سرسراتے ہوئے اس کے اردگرد گونجے۔

وہ اس بے مروت انسان کو دھکے دے کر کمرے سے نکلوانا چاہتی تھی لیکن اس کے الفاظ ریشم تھے، جو نازنین کے سارے وجود پہ کسی بوڑھے پیڑ پہ منت کے دھاگوں کی طرح لپٹنے لگے تھے۔ اس کے الفاظ نے اس قدر گرہیں باندھ دیں کہ وہ مزاحمت کے قابل نہیں رہی تھی۔ اسے کسی نے جادوگرنی کب کہا تھا؟ چند گنے چنے لوگ اس کمرے تک آتے اور اس کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہو کر چلے جاتے لیکن نازنین کے دل میں ناپسندیدگی کا بیج بو جاتے تھے۔ یہ انوکھا انسان تھا جو اونچے سر سے سامنے کھڑا تھا اور تعریف کے الگ پیمانے اس کے ہاں رائج تھے۔ وہ پری تھی، دیوی، مہارانی، ملکہ اور نہ جانے کیا کیا...... لیکن وہ سحر پھونکتی تھی یہ اس نے اس سے پہلے کب سنا تھا۔

"بیٹھو......" وہ گلاب رنگ مسہری پہ آن بیٹھی اور مقابل کو بھی بیٹھنے کو کہا۔ لہجے کی تلخی مدھم ہو گئی تھی۔

"نہیں......ابھی صرف دیکھنے آیا تھا افواہیں کس قدر سچی ہیں۔"

"پھر کیا محسوس ہوا؟" وہ اس کی حالت چہرے سے ہی جان چکی تھی لیکن اپنی تعریف کسے بری لگتی ہے۔

"ملاقاتوں کا سلسلہ عروج پہ جانے والا ہے، تیار رہیے گا۔" وہ چند قدم چلتا اس تک آیا۔

"یہاں جو ایک بار آیا، دوبارہ نازنین نے آنے کی اجازت نہیں دی۔ تمہیں کیا چیز اتنی امید دلا رہی ہے؟" اس کے حوصلوں کی وہ معترف ہوئی اور شاید حسن کی بھی، اسے جادوگرنی کہنے والا خود کب کم تھا۔

"حسن میری کمزوری ہے، وہ چاہے لاکھ پردوں میں چھپا ہو مجھے وہاں کے سب راستے معلوم ہو جاتے ہیں۔" اس نے نہایت نرمی سے نازنین کا ہاتھ تھاما، اپنی دلی کیفیت ہاتھ پہ ثبت کی اور احتراماً آہستہ قدموں سے پیچھے ہٹ آیا۔ یہ حسن کا احترام تھا۔ نازنین نے اسے مسکراتی نظروں سے جاتے دیکھا۔ کوئی تو اس کے مقابلے کا آیا تھا اور وہ ابھی سے ان ملاقاتوں کا انتظار کرنے لگی جس کا ذکر وہ کر کے گیا تھا...... یعنی کہ وہ دوبارہ اس کمرے تک آنے والا تھا۔ دونوں اپنی اپنی خوشی میں سرشار اس بات سے انجان تھے کہ ساری عمر وہ ایک دوسرے کے مدار میں رہنے والے تھے، جتنے بھی دور نکل جائیں گے گھوم کر وہیں آئیں گے۔

***

اذان کی آواز سماعتوں کو بہت بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ رشیدہ بیگم اذانوں سے پہلے اٹھ کر فرض انسانی میں مصروف ہو جاتی تھیں اور موذن کی آواز گونجتے ہی ان کی کوشش ہوتی وہ عزت کو بھی اٹھا دیں لیکن اکثر یہ خواہش ناکام ہی رہ جاتی تھی۔ وہ برآمدے میں اپنا بستر سمیٹتے ہوئے کمرے میں آئیں تاکہ عزت کو اٹھانے کی کوشش کر سکیں اور کمرے میں قدم رکھتے ہی انہیں شدید حیرانی ہوئی۔ وہ اٹھ چکی تھی لیکن ابھی تک بستر پہ ہی بیٹھی تھی۔

”طبیعت ٹھیک ہے؟“ اس انہونی پہ انہیں پہلی فرصت میں اس کی صحت کے متعلق خیال آیا۔اس کے جواب دینے سے پہلے ہی اس کی پیشانی پہ ہاتھ رکھ کر دیکھنے لگیں۔

”امی...... میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ اس نے آرام سے ان کا ہاتھ پیچھے کیا۔

”اچھا چلو اٹھ کر نماز پڑھ لو۔“ وہ دوپٹا سیدھا کرتے ہوئے واپس جانے لگیں۔

”امی آپ کل پھر خالہ سے پیسے مانگ کر لائی ہیں؟“ اس کے انداز میں حد درجہ سنجیدگی تھی۔

”تمہارا ان باتوں سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔“ انہوں نے اسے دوٹوک جواب دیا۔

”امی آپ کیا چاہتی ہیں؟ آج مجھے دوٹوک الفاظ میں بتا دیں۔“ اس کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔”میں نے آپ سے بارہا کہا دکانوں کے متعلق حازم بھائی سے مشورہ کریں آپ نہیں مانیں، مجھے پتا بتانے کا کہا، پولیس میں جانے کا کہا آپ کسی طور کسی بات پہ متفق نہیں ہوئیں۔ میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ اس طرح آپ کا بار بار خالہ سے پیسے لینا مجھے کتنا شرمندہ کرتا ہے۔ میں اپنی ہی نظروں میں گر جاتی ہوں۔ آپ کیا چاہتی ہیں، میں خالہ کی طرف جانا چھوڑ دوں، اس کمرے میں منہ چھپا کر بند ہو کر بیٹھ جاؤں؟“ اس کے انداز سے اس کی تکلیف نمایاں تھی۔

”تمہیں کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟“ وہ عزت کو بنا بتائے یہ کام کرنے گئی تھیں پھر اسے کیسے پتا چلا یہ بات انہیں حیران کررہی تھی۔

”امی مجھے کوئی کیوں بتائے گا اور سوال اس وقت یہ نہیں ہے۔ آپ کا یوں پیسے مانگنا مجھے کس قدر تکلیف میں مبتلا کرتا ہے آپ سمجھ کیوں نہیں پا رہیں۔ ساری زندگی خود ہی خودداری کے سبق پڑھائے رہیں اب خود ہی رگوں میں بھیک کی تکلیف کیوں اتار رہی ہیں؟“ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

اس کی نگاہوں کے سامنے گزرے دن کی سہ پہر گردش کرنے لگی تھی۔ یونی ورسٹی سے واپسی پہ وہ دونوں عزت کے گھر ہی چلی آئی تھیں۔ عزت کچن میں چلی گئی تو وہ خالہ کو ڈھونڈتی اوپر چلی آئی جہاں خالہ کی آواز نے اس کے قدموں کو بے جان کردیا تھا۔ وہ حازم بھائی سے عزت کی مدد کرنے کے متعلق بات کررہی تھیں۔ وہ مزید کچھ بھی سنے بنا واپس پلٹ آئی تھی۔ وہ اسے بنا کوئی جواب دیے کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔ اس کی تکلیف انہیں بے حد اذیت دے رہی تھی۔ وہ اس کی باتوں کو بچپنا سمجھتی تھیں لیکن آج اندازہ ہوا وہ حد درجہ حساس تھی۔ وہ عجیب دوراہے پہ آن کھڑی ہوئیں تھیں کہ اک طرف مجبوریاں اور دوسری طرف بیٹی کے احساسات...... انہوں نے جائے نماز بچھائی اور اپنے آنسو اس رب کی بارگاہ میں پیش کردیے۔ ان کی نماز کا اختتام ہو رہا تھا جب وہ دوپٹا لیے باہر کے دروازے کی طرف جاتی نظر آئی۔

”کہاں جارہی ہو؟“ انہوں نے جلدی سے نماز ختم کی اور سہمی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

خالہ کی طرف جارہی ہوں۔“ اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

”اس وقت کیوں جارہی ہو؟“

”امی مجھے کام ہے، میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔ ناشتہ بنا دیجیے آج جلدی یونیورسٹی جانا ہے۔“ وہ مزید کچھ بتائے دروازہ عبور کرگئی۔

اسے معلوم تھا اس وقت حازم بھائی مسجد سے گھر واپس آرہے ہوں گے اور اسے ان سے ہی کام تھا۔ وہ خالہ کے دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ گلی کے دوسری طرف سے وہ آتے دکھائی دیے۔ وہ بھی اسے وہاں کھڑا دیکھ چکے تھے تب ہی قدموں کی رفتار تیز کرتے ہوئے جلد اس تک پہنچے۔

”کیا ہوا...... سب ٹھیک ہے؟“ چابی سے دروازہ کھولتے وہ اس سے مخاطب ہوئے۔

"مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔" وہ کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر بولی۔
"ایسی کون سی بات ہے؟" وہ حیران ہوئے۔ "خیر بولو۔" وہ راہداری میں ہی کھڑے ہو گئے۔
"مجھے حجاب کرنی ہے۔" اس کی بات نے انہیں شدید حیران کیا۔
"لیکن کیوں؟" وہ منہ کھولے اسے دیکھ رہے تھے۔ "مطلب تمہاری پڑھائی مکمل نہیں ہوئی۔"
"میرے پاس کیوں کا جواب نہیں ہے۔ آپ بس یہ بتائیے میری کوئی مدد کر سکتے ہیں یا نہیں؟" اس کا انداز اس حد تک روکھا تھا کہ وہ چند لمحے ساکت نگاہوں سے اسے دیکھتے رہے۔
"نہیں...... "ان کا انکار عزت سے زیادہ خود ان کے لیے اذیت ناک تھا۔
وہ اس کے سوال کا جواب دینے ہی والے تھے کہ کل کا مسکراتا منظر ان کی نگاہوں میں آن چبھا۔ وہ اس منظر سے خود کو آزاد نہیں کروا پائے تھے۔ وہاں خاموشی چھا چکی تھی۔ عزت سر جھکائے اتنے صاف انکار کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ان کی مدد سے عاجز آ چکے تھے یہ اس وقت صاف محسوس ہو رہا تھا۔ یہ لہجہ، الفاظ عام حالت میں اسے پاگل کر دیتے لیکن اس پل وہ بے حس تھی۔ امی کے رویے کے باعث اسے اسی چیز کا خوف تھا جو ہو گئی تھی۔
"ٹھیک ہے حازم بھائی۔ کوئی بات نہیں۔" وہ جس خاموشی سے آئی تھی اسی خاموشی سے واپس چلی گئی۔
وہ چیخنا چاہتی تھی، چلانا چاہتی تھی، اس رویے اور انکار پہ انہیں جھنجھوڑنا چاہتی تھی لیکن وہ کچھ نہیں کر پائی۔ وہ ان کا دیا کھا چکی تھی، اس کی ماں مدد کے لیے ان کے پاس آئی تھی تو وہ کیسے انہیں کچھ کہہ سکتی تھی۔ اب تو بس احسان تھا جس کے نیچے اس کا وجود دبنے لگا تھا اور کچھ بھی ہو وہ احسان فراموش نہیں ہو سکتی تھی۔
"ہو گیا کام؟" اسے واپس آتے دیکھ کرامی نے سوال کیا۔
"نہیں، لیکن ہو جائے گا۔" وہ چپ چاپ واپس کمرے میں چلی گئی۔ اس کی خاموشی اور سرخ آنکھیں انہیں تازیانہ لگی تھیں۔ اس کے لیے ناشتہ تیار کرتے دو آنسو خاموشی سے گال پہ لڑھک آئے تھے۔ وہ تو اسے بڑا سخت جان سمجھتی تھیں لیکن اب اس کی حساسیت سے انہیں خوف آنے لگا تھا۔ آج سے انہوں نے اس کے گرد دعاؤں کا حصار مزید مضبوط کر دیا تھا۔

❁......❁......❁......❁

شہری آبادی، وقت کی تیز رفتاری اور ترقی کے نشان بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ پختہ سڑکیں اختتام پذیر تھیں۔ گاڑی کچی مٹی سے اٹے راستے پہ دھول اڑاتے عازم سفر تھی۔ وہ تینوں ایک ہی سفر پہ رواں اور منزل بھی ایک ہی تھی لیکن تینوں اپنی اپنی سوچوں کے منجدھار میں پھنسے ہوئے تھے۔ رقیہ زبیر احمد خدشات کی ڈور سے الجھی ہوئی تھیں، اگلے لمحات کا خوف انہیں راستے کے حسن سے انجان کر رہا تھا۔ انہیں وہ دن پوری جزئیات سے یاد تھے جب وہ سفید حویلی سے رخصت ہو کر ان خستہ حال راستوں سے گزری تھیں۔ یہاں گزرا ہر دن ان کے لیے امتحان ثابت ہوا تھا، ایک طویل جنگ کے بعد وہ اس بوسیدہ روایات کے حویلی سے نکلنے میں کامیاب ہوئی تھیں لیکن آج کا یہ سفر انہیں واپس انہی راستوں کی طرف لوٹنے کا اشارہ لگ رہا تھا۔ زبیر احمد خود کو بے بسی کی انتہا پہ محسوس کر رہے تھے۔ وہ اپنے باپ کا اکلوتا سہارا تھے لیکن ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے باعث مہینوں ملے بغیر گزار دیتے۔ اپنے گھر میں سکون پانے کی کوشش کرتے ہوئے انہیں سالوں ہو گئے اور یہاں ان کی آمد ان کے سالوں کی ریاضت کو خاک میں ملا دیتی تھی۔ بچپن کے دامن سے ماں کی پریشانی اور باپ کی خاموشی لپٹی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود وہ گزرنے والے مناظر سے جی بہلا رہا تھا۔ وہ اتنا ہی مسرور تھا جتنا سفید حویلی کی طرف کیے جانے والے سفر میں ہوتا تھا۔ زمینیں فصلوں کے وجود سے خالی تھیں، کہیں کہیں آسمان پہ اڑتی پتنگیں بے رونق

فلک کو خوب صورت بنانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ گاڑی رکتے ہی اس نے اپنے اردگرد لوگوں کا ہجوم اکھٹے ہوتا دیکھا۔ وہ بمشکل دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکلا اور اسی دوران اس کا نام لے لے کر سلامتی کی دعائیں مانگی جارہی تھیں۔ کوئی اس کے قریب آنے کی کوشش کررہا تھا اور کوئی اسے چھونے کو بے تاب تھا۔ یہ سارے منظر اس کے لیے نئے تھے۔

''سب لوگ ہٹ جاؤ، چھوٹے پیر صاحب کو گزرنے کا راستہ دو۔'' ایک ڈنڈا بردار انسان کی پاٹ دار آواز نے ایک لمحے میں جگہ خالی کروادی تھی۔ سب لوگ فوراً نگاہیں جھکائے، ہاتھ باندھے ترتیب سے کھڑے ہو گئے تھے۔ مجتبیٰ نے قدم آگے بڑھانے سے پہلے پیچھے مڑ کر رقیہ زبیر احمد کی جانب دیکھا جو ابھی تک گاڑی سے نہیں اتری تھیں۔ وہ انہیں ایک لمحہ بھی اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

''مجتبیٰ...... آگے بڑھو۔'' پاپا کی آواز پہ اس نے نافہم نگاہوں سے انہیں دیکھا اور شاید وہ بھی اس کی پریشانی بھانپ گئے تھے۔ ''تمہاری ماما پیر خانہ میں جائیں گی، ہماری عورتیں یہاں نہیں ٹھہرتی۔'' ان کے جواب کے ساتھ ہی گاڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئی تھی۔

مجتبیٰ نے اپنے قدم بڑھائے اور سفید ماربل لگے فرش پہ دھیرے قدموں سے آگے چلتا گیا۔ ہجوم اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کچھ لمحوں بعد وہ ایک وسیع احاطے کے سامنے کھڑا تھا اور اس احاطے میں عورتوں کا ہجوم تھا۔ اسی اثناء میں چند لوگ آگے بڑھے اور پھولوں کے ہار اس کے گلے میں پہنانے لگے۔ وہ خود کو ایک عام سا انسان سمجھتا تھا، یہاں ہونے والے سب واقعات اس کی سمجھ سے بالاتر تھے اور اسی سبب اس نے شاید گزشتہ کچھ سالوں میں پہلی بار اپنے باپ کا ہاتھ پکڑا تھا۔ وہ دل ہی دل میں بے تحاشا الجھ رہا تھا۔

''لوگو...... چھوٹے پیر صاحب سب سے پہلے دربار میں حاضری دیں گے اور اس کے بعد تم لوگوں کو بیعت کی سعادت حاصل ہوگی۔'' اسی انسان کی آواز پہ مجمع چھٹنے لگا۔

''یہ سب کیا ہے پاپا...... ہم تو صرف کسی عرس کے لیے آئے تھے اور یہ سب مجھے چھوٹا پیر کیوں کہہ رہے ہیں؟'' ایک سبز مینار سے ملحقہ عمارت کی جانب بڑھتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

''تم یہ سب سوال اپنے دادا سے پوچھنا۔'' انہوں نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔ وہ اسے کیسے بتاتے کہ یہ سب دیکھ کر ان کے دل پہ کیا بیت رہی تھی۔ کئی سال پہلے وہ انہی روایات سے دور بھاگے تھے اور اب اس فیصلے کا بھگتان ان کا بیٹا بھرنے والا تھا۔

''پیر صاحب کا حکم ہے کہ اندر صرف چھوٹے پیر صاحب جائیں گے۔'' وہ عمارت میں داخل ہو رہا تھا جب اس نے یہ آواز سنی۔ وہ حیرت سے مڑا اور یہ دیکھ کر حیرت مزید بڑھ گئی کہ یہ الفاظ زبیر احمد کے لیے تھے۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ انہوں نے اسے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا اور واپس مڑ گئے۔ دروازہ بند کردیا گیا، نیم روشن کمرے میں وہ اس وقت اکیلا کھڑا تھا۔

''آؤ مجتبیٰ...... ہم تمہارے ہی منتظر تھے۔'' سامنے نظر آتی دو قبروں کے پار اس نے مختار احمد کا وجود دیکھا۔

''یہ سب کیا ہے دادا جان...... بابا کو باہر کیوں روکا گیا؟'' اس پل اس کی زبان پہ سوال ہی سوال تھے۔

''سب باتوں کے جواب وقت کے ساتھ مل جائیں گے۔ اس وقت تم صرف اپنے فرض پہ دھیان دو جو تمہارے باپ کی ناخلفی کے باعث وقت سے پہلے تمہارے کاندھوں پہ ڈالا جارہا ہے۔'' مختار احمد کا لہجہ اس قدر سنجیدہ اور کڑک تھا کہ چاہتے ہوئے بھی وہ کچھ بول نہیں پایا۔ اک خوف کی لہر اس کے وجود میں دوڑ گئی۔

''یہ دو سامنے نظر آتی مبارک قبریں ہمارے بزرگوں کی ہیں اور یہ سارا فیض انہی کے باعث ہم سب کو حاصل ہے۔

میں نے ساری عمران مبارک ہستیوں کی خدمت کی اور اب میرے بعد یہ فرض تمہیں سنبھالنا ہے۔ روایات کے مطابق میرے بعد تمہارا باپ اس کا حق دار تھا لیکن اس ناخلف نے اس خدمت سے معتبر اپنے دلی جذبات کو سمجھا لیکن تمہاری شکل میں مجھے میرا وارث مل گیا ہے۔ سب باتیں تمہیں آہستہ آہستہ سمجھ آجائیں گی، ابھی صرف یہ یاد رکھو کہ اب سے پیر شاہ کا سیاہ و سپید تم ہو، آج سے پیر شاہ کے ماننے والوں کے مائی باپ تم ہو، آگے بڑھو اور ان مبارک ہستیوں کو سلام کرو...... ان سے دعا کرو کہ وہ تمہیں فیض یاب کریں۔" چوکور کمرے میں مختار احمد کی آواز گونج رہی تھی اور اس سے پہلے ان کے یہ انداز مجتبیٰ نے کب دیکھے تھے۔

"مجتبیٰ دیر نہ کرو آگے بڑھو۔" اس کے ساکت قدم آگے بڑھنے سے انکاری تھے۔ وہ اب رقیہ زبیر احمد کے خدشات کو سمجھ رہا تھا لیکن دادا کا انداز اسے خوف زدہ کررہا تھا۔

وہ دبے دبے قدموں آگے بڑھا اور سبز چادروں میں ڈھکی قبروں کے پاس آن کھڑا ہوا۔ وہ جو چاہ رہے تھے ویسا وہ کبھی نہیں کرنے والا تھا اس لیے اس نے بس ہاتھ اٹھائے اور آنکھیں بند کیے دعا مانگنے لگا۔ مختار احمد نے یہ دیکھ کر بھی خود پہ قابو رکھا کیونکہ وہ قطرے کے ذریعے پتھر میں سوراخ کرنا جانتے تھے اور انہیں یہ بھی معلوم تھا زیادہ سختی معاملات خراب کردیتی ہے۔

"میرے پیچھے آؤ۔" اس کے ہاتھ نیچے ہوتے ہی وہ کمرے میں بنے ایک اور کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ وہاں ایک اور دروازہ کھلا جس کے آگے طویل راہداری تھی اس میں نیم اندھیرا تھا۔ وہ دونوں خاموشی سے چلتے ہوئے ایک بڑے آرائشی دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔

"یہاں وہ نیک عورتیں موجود ہیں جنہوں نے اپنی ذات ان بزرگوں پہ قربان کردی، سب سے پہلے تمہاری بیعت کا حق ان کو ہے۔ دروازہ کھولو اور اندر چلے جاؤ میں یہاں تمہارا منتظر ہوں۔" خاموشی ہونے کے باعث دادا کی آواز بہت گونج دار تھی۔

مجتبیٰ نے ایک لمبا سانس لیا، ہلکا سا دباؤ دروازے پہ ڈالا اور دروازہ کھلتا چلا گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں ایسا کچھ ہونے والا تھا۔ پرت در پرت نئے نئے راز کھل رہے تھے۔ اس پل بھی وہ انجان تھا کہ اس پہ کیسی کربہ حقیقت کا ادراک ہونے والا تھا۔

"آپ جیسی معزز ہستی کا ہم گناہ گاروں کے پاس چل کر آنا ہمارے لیے سعادت ہے۔" وہ ابھی نگاہ اٹھا بھی نہیں پایا کہ ایک مترنم آواز وہاں سنائی دی۔

وہ ابھی تک راہداری سے پہلے ہونے والے واقعات پہ الجھا ہوا تھا اور اسی الجھن میں اس نے نگاہ اٹھانے کی غلطی کرلی۔ اس کے سامنے صنف نازک موجود تھی۔ وہ ہاتھ باندھے، نگاہیں جھکائے اس کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ اس نے اپنے قدم پیچھے بڑھائے اور یہ جان کر جھٹکا لگا کہ پیچھے دروازہ بند ہوچکا تھا۔ وہ اس پل زندگی کے مشکل ترین مرحلے میں پھنس چکا تھا۔ مجتبیٰ زبیر احمد پیر شاہ کی کہانیوں کا کردار بننے والا تھا۔

(ان شاءاللہ باقی آئندہ ماہ)

سفید پھولوں سی ایک دعا

نزہت جبین ضیاء

سرمئی شام کے سائے دھیرے دھیرے اپنے پر پھیلا رہے تھے،شاہ خاور دن بھر کی تھکا دینے والی مسافت مشرق سے مغرب تک طے کرتا ہوا دھیرے دھیرے اپنی منزل کی جانب گامزن تھا۔شام ہوتے ہی پرندے دن بھر رزق کی تلاش میں اڑنے کے بعد اپنے ٹھکانوں کی جانب لوٹ رہے تھے۔گاؤں کے کچے گھروں کے آنگنوں سے اٹھتا ہوا دھواں اس بات کا عکاس تھا کہ یہاں مٹی کے بنے ہوئے چولہوں کے آس پاس بچے جمع ہو کر رات کے کھانے کا انتظار کر رہے ہیں۔جبکہ شہروں میں اس وقت سڑکوں پر گاڑیوں اور لوگوں کا اژدھام تھا۔ہر طرف ٹریفک کا شور، گاڑیوں کا دھواں، ہارن کی تیز آوازیں، لوگوں کی گہما گہمی، جلد بازی، ہر کسی کو اپنی منزل پر پہنچنے کی جلدی تھی۔اس لیے نا ٹریفک کے قوانین کی پاسداری ہوتی نا پیدل چلنے والے عام لوگوں کا خیال۔لمبی لمبی گاڑیاں، رکشہ، بڑی بسیں، ٹیکسی اور بے شمار موٹر سائیکلوں کا شور۔ زندگی کی مکمل چہل پہل اس بات کی دلیل تھی کہ شہروں میں راتیں جلدی نہیں ہوتیں، ابھی تو لوگ اپنے اپنے کاموں سے لوٹ رہے تھے پھر گھر پہنچ کر ان کے آئندہ کاموں کا لائحہ عمل تیار ہوتا اور اپنی دیگر مصروفیات کو جاری رکھنا ہوتا تھا۔

شہر کے اس بے پناہ شور، ہنگامے اور گہما گہمی سے کچھ دور دلاور شاہ اپنے خاندان کے ساتھ بڑے سے گھر میں رہائش پذیر تھے۔یہاں آباد ہوئے ان کو چند سال ہی ہوئے تھے، انہوں نے شہر کے وسط کے شور ہنگامے اور بھیڑ بھاڑ میں رہائش پسند نہ کی تھی تب ہی انہوں نے اس نسبتاً پرسکون اور کم آبادی والے علاقے کو ترجیح دی تھی۔گو کہ ان کی آبائی زمینیں اور جائیداد اور آباؤ اجداد کی رہائش

گاؤں میں تھی مگر وقت کے ساتھ ساتھ اور بدلتے ہوئے حالات اور تقاضوں کی وجہ سے مجبوراً ان کو شہر کی طرف کوچ کرنا پڑا۔

ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی جب بچے بڑے ہوئے تو ان کو گاؤں کا ماحول، یہاں کے لوگ اور رہن سہن بالکل پسند نہ آیا، میٹرک تک تو گاؤں کے اسکول سے تعلیم حاصل کی مگر جب بڑے بیٹے مختار شاہ نے میٹرک کرلیا تو مزید پڑھائی کے لیے شہر آنا پڑتا تھا۔ روزانہ آنا جانا آسان نہ تھا پھر جب ستار شاہ نے میٹرک کیا تب بچوں نے شہر جانے پر اصرار کیا کہ لڑکوں کے لیے تو اتنا مشکل نہیں ہے لیکن جب نگین کو آگے تعلیم حاصل کرنا ہوگی تب اس کے لیے مشکل ہوجائے گی۔ دلاور شاہ کسی صورت گاؤں چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کو شہر کا ماحول ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا کچھ تو گاؤں سے والدین اور آباؤ اجداد کی یادیں وابستہ تھیں تو دوسری جانب شہر کے حوالے سے تلخ اور تکلیف دہ یادیں آج بھی ان کے ذہن میں محفوظ تھیں۔ ایک زمانہ تھا کہ دلاور شاہ کو بھی شہر جانے کا بہت شوق تھا، ان کو نا گاؤں اچھا لگتا نا یہاں رہ کر زمین داری کرنا ان کو شہر کا ماحول، وہاں کے لوگ اور شہری زندگی بہت اچھی لگتی تھی، بے فکری آزادی اور ہنگاموں سے بھرپور زندگی گزارنا چاہتے تھے، ان کے بڑے بھائی فیروز شاہ کم پڑھے لکھے تھے، بس میٹرک تک پڑھ کر زمینیں اور دیگر کام کاج سنبھال لیا تھا ان کو شہر جانے کا قطعی شوق نا تھا، وہ گاؤں میں ہی خوش تھے، ان کی بیوی بھی عالم شاہ کی بھتیجی تھی۔ گاؤں کی تو تھی مگر قدرے تیز اور چالاک خاتون تھیں۔

دلاور شاہ نے میٹرک کرلیا تھا، وہ پڑھائی میں بھی اچھا تھا، میٹرک کے بعد ابتدائی دو سال تو انہوں نے جیسے تیسے کالج میں گزارا کرلیا، لیکن پھر ان کی شہر جاکر تعلیم حاصل کرنے کی خواہش نے شدت پکڑ لی اور وہ بضد ہوگئے کہ ان کو مزید تعلیم کے لیے شہر جانا ہوگا اور وہیں ہوسٹل میں قیام ہوگا، حالانکہ والدہ اس بات کے حق میں نہیں تھیں کیونکہ ان کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ شہر میں نہ خالص غذا ملتی ہے نہ پر فضا ماحول اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ماں کے ہاتھ کے کھانے نصیب نہ ہوتے، مگر لاڈلے بیٹے نے ضد پکڑلی تھی، سو وہ بھی مجبور ہوگئیں اور شہر جانے کی اجازت دے دی۔ دلاور شاہ بہت خوش تھے، شہر کا ماحول، وہاں کے لوگ اور تیز ترین زندگی ان کا خواب تھی اور وہ خواب پورا ہونے جارہا تھا، دلاور شاہ نے خوشی خوشی رخت سفر باندھا اور شہر کا رخ کیا۔ دلاور شاہ گاؤں کے پلے بڑھے، گبرو نوجوان تھے سرخ و سفید اور لمبے چوڑے، بڑی بڑی مونچھوں کو تاؤ دے کر وہ جب صبح صبح خوش لباس ہوکر یونیورسٹی میں داخل ہوتے تو ہر نگاہ ان کی جانب اٹھ جاتی، پیسے کی کمی نہ تھی، ہر ماہ وقت سے پہلے ان کے اکاؤنٹ میں والد پیسے بھیج دیتے اور دلاور شاہ ٹھاٹ سے رہتے۔ وہی دلاور شاہ جو گھر سے تو محض تعلیم حاصل کرنے کی ضد لے کر نکلے تھے یہاں آکر یہاں کے ماحول میں اس طرح کھوگئے کہ تعلیم ایک طرف رہ گئی اور ان کے شاہانہ ٹھاٹ باٹ اور کروفر نے الگ ہی رنگ جمانے شروع کردیئے، بہت سے لڑکے اور لڑکیاں ان کے آگے پیچھے پھرتے، بہت سی لڑکیوں کے تو وہ آئیڈیل بن گئے تھے، گاؤں کے چوہدری شاہانہ ٹھاٹ باٹ، جاگیردارانہ رکھ رکھاؤ، اعلیٰ کپڑے اور رعونت دیکھ کر لڑکیاں آہیں بھرنے لگیں اور اسی بات کو لے کر دلاور شاہ اپنا مقصد اور کیریئر کا حصول بالکل بھول گئے اور خود کو راجہ اندر سمجھ بیٹھے۔ پڑھائی کی طرف سے توجہ بالکل ہٹ گئی، ایک تو شہری ماحول، یہاں کے طور طریقے اور جینے کا انداز ہی الگ تھا اوپر سے اضافی شکل و صورت اور پیسے نے ان کو منفرد بنادیا اور وہ اپنی انفرادیت کو پڑھائی سے ہٹ کر استعمال کرنے لگے، وہ یونیورسٹی میں ہونے والی دیگر سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے، ان کے اردگرد لوگوں کا ہجوم رہنے لگا اور ان کو یہ سب اچھا لگتا تھا کچھ لوگوں کے اکسانے پر وہ سیاست میں آگئے اور یونیورسٹی میں ہونے والی سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ یہاں تک کہ امیدوار کے لیے اپنا نام دے دیا، اس میں تو روپیہ پیسہ پانی کی

طرح بہانے والا ہونا چاہیے اور پیسے کی ان کے پاس کمی نہ تھی، ادھر والد بیچارے اس خوش فہمی میں تھے کہ کم از کم ایک بیٹا پڑھ لکھ کر الگ زندگی گزارے گا، بظاہر اتنے کروفر اور رعب دار نظر آنے والے دلاور شاہ سیدھے سادھے اور معصوم تھے۔ ان کو شہر کے داؤ پیچ سے واقفیت نا تھی نا یہاں کے کچھ مکار اور چاپلوس لوگوں کے بارے میں علم تھا۔ وہ ان لوگوں کے ہاتھوں بے وقوف بنتے رہے روپے پیسے سے بھی اور اپنی بے وقوفی سے بھی۔ یونیورسٹی کے کچھ بدمعاش اور آوارہ گرد لوگ بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئے۔ اب ان کی توجہ پڑھائی کی طرف سے مکمل طور پر ہٹ گئی تھی وہ ہاسٹل سے تیار ہو کر آتے تو محض آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرتے اور سامنے والی پارٹی کو کس طرح سے نیچا دکھائیں اس امور پر بحث ہوتی اور لوگ اپنی اپنی رائے پیش کرتے۔ ان کو یہاں آئے ایک سال ہو چکا تھا، پہلا سال تو جیسے تیسے پاسنگ مارکس لے کر کلیئر کر لیا تھا مگر اس بار تو کوئی امید نہ تھی کہ چالیس فیصد بھی حاصل کر سکیں۔

یونیورسٹی میں سیاسی سرگرمیوں نے زور پکڑ لیا تھا۔ انتخابات جیسے جیسے قریب آ رہے تھے، ہنگامے اور شور شرابہ، کنویسنگ اتنے ہی عروج پر ہو رہی تھی۔ اس روز دلاور شاہ اپنے دوستوں کے ساتھ کینٹین میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ مخالف پارٹی کے کچھ لوگ بھی آ گئے۔ معمولی سی بات پر ان کے دوست سے تکرار ہوئی، دوست نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس کو تھپڑ جڑ دیا، بس پھر کیا تھا، دوسری پارٹی کے لوگوں نے ان پر ہلہ بول دیا۔ خوب مارا ماری ہوئی، لوگوں نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی، مگر دونوں جانب سے اتنی جارحانہ کارروائیاں جاری تھیں کہ باقی اسٹوڈنٹ بھی وہاں سے کھسک لیے، کرسیوں ٹیبل اور برتنوں کا آزادانہ استعمال ہو رہا تھا۔ دلاور شاہ بھی ان لوگوں میں شامل تھے۔ لوگ زخمی ہو رہے تھے، لڑکیاں گھبرا کر رونے لگی تھیں ایسے میں کسی نے پرنسپل کو اطلاع دے دی، کسی نے دلاور شاہ کی پیٹھ پر کرسی کا پایہ مارا تھا دلاور شاہ نے گھوم کر دیکھا تو غصے سے بے قابو ہو کر بنا سوچے سمجھے سامنے رکھا شیشے کا گلاس

اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا، حملہ اچانک اور غیر متوقع تھا، گلاس نہ جانے کس اینگل سے لگا کہ اس کا تقریباً پانچ چھ انچ کا ٹکڑا سر میں جو لگا دھڑا دھڑ خون بہنے لگا، اتنا شدید حملہ تو اب تک کسی نے نہیں کیا تھا، وہ لڑکا زمین پر گر گیا، اس کے ساتھیوں نے دیکھا تو بھوکے شیر کی طرح دلاور شاہ پر جھپٹ پڑے لیکن اس وقت تک یونیورسٹی کے گیٹ پر کھڑے رینجرز کے اہل کار اور ٹیچرز بھی آ گئے۔ لڑکا بے حس و حرکت پڑا تھا جیسے کہ جاں بحق ہو گیا ہو، دلاور شاہ کے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ عام یا معمولی لڑکا نہیں تھا اس کے والد سیاسی پارٹی کے رکن تھے، اس لڑکے (حماد) کو تو فوراً ہاسپٹل بھیجا گیا، جھگڑا کسی اور کا تھا مگر سب کو تو مناسب کارروائی کے بعد چھوڑ دیا گیا مگر دلاور شاہ پولیس کی حراست میں تھے کیونکہ یہ اقدام قتل کی واردات تھی، دلاور شاہ تو بالکل پاگل ہو گیا۔ یہ اچانک سے اتنی بڑی افتاد آ پڑی تھی، انہوں نے تو خواب میں بھی ایسا کچھ نہ سوچا تھا، انہوں نے پولیس کے سامنے معافیاں مانگی، دہائیاں دیں کہ یہ سب غیر متوقع طور پر ہوا۔ ورنہ اس جھگڑے سے ان کا کوئی تعلق نہیں مگر پولیس کب سننے والی تھی۔ ان کو اندازہ نہیں تھا کہ یہاں کے لوگ کتنے شاطر اور گھاگ ہیں کل تک آگے پیچھے پھرنے والے تمام دوست منظر سے غائب ہو چکے تھے، وہ لڑکیاں جو ہر وقت ان کے سامنے رہنے کی کوشش کرتی تھیں اپنی اپنی فیملی کے بارے میں باتیں کرتیں اپنے بھائیوں اور باپ کے تعلقات کے بارے میں بتاتی رہتیں کہ فلاں وزیر کا بیٹا بھائی کا دوست ہے، تو فلاں ایم این اے میرے چاچو ہیں۔ وہ سب کی سب غائب ہو گئیں، دلاور شاہ کو رونا آ گیا، دوسری پارٹی کے لڑکے، اوباش، عیاش اور ایسے ہی والدین کی پیداوار تھے مگر دلاور شاہ تو شریف، نیک گھرانے کا بیٹا تھا۔ ان کو اس طرح کے داؤ پیچ کب آتے تھے گو کہ پیسے کی کمی نہ تھی مگر شاطر اور چالاک نہ تھے۔ دلاور شاہ سوچ سوچ کر پاگل ہو رہے تھے کہ بابا اور ماں جی کا کیا حال ہوگا جب ان کو یہ سب پتا چلے گا؟ انہوں نے ہاتھ پیر جوڑ کر دوست سے کہا

کہ کم ازکم میرے بابا کو اطلاع دے دو۔ عالم شاہ کو خبر ہوئی تو فیروز شاہ کے ساتھ بھاگم بھاگ شہر پہنچے، اپنی ساری دوستیاں، اور رابطے عمل میں لائے، بے تحاشہ کوششوں اور سامنے والی پارٹی کو بھاری رقم دے کر اس کیس سے خارج ہوئے ان سب کارروائیوں میں جہاں پیسہ پانی کی طرح بہایا گیا وہاں عالم شاہ کی برسہا برس کی عزت اور مرتبہ بھی خاک میں مل گیا تھا۔

❁ ❁ ❁

وہ بیٹا جس پر عالم شاہ کو فخر تھا اس بیٹے نے ان کا شان سے اٹھا ہوا سر جھکا دیا تھا۔ ان کو رسوا کر کے رکھ دیا تھا۔ پیسہ تو ایک طرف لیکن عالم شاہ کو دلاور شاہ کی حرکتوں اور آوارہ گرد دوستوں کے ساتھ مل کر پڑھائی سے دور ہو جانا اور غیر نصابی سرگرمیوں میں اس حد تک ملوث ہو جانا بہت برا لگا تھا۔ دلاور شاہ نے شہر آ کر اپنی عزت، وقار سب کچھ گنوا دیا تھا، دلاور شاہ ہاتھ جوڑے باپ کے سامنے کھڑے تھے، رو رو کر اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کی معافیاں مانگ رہے تھے۔ عالم شاہ غیض وغضب کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ عالم شاہ نے اپنا فیصلہ سنایا کہ دلاور شاہ پڑھائی وڑھائی چھوڑ کر واپس گاؤں جا کر صرف زمین داری کریں گے اور آئندہ شہر کا نام بھی زبان پر نہیں لائیں گے، دلاور شاہ جو پہلے ہی اتنے بڑے حادثے کے بعد دل برداشتہ اور ہراساں ہو گئے تھے کہ باپ کا فیصلہ سن کر سر جھکا دینے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا۔ وہ خود بھی اس تلخ تجربے سے پریشان ہو گئے تھے۔ ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ جو خواب لے کر شہر آئے تھے یوں چکنا چور ہو کر بکھر جائے گا واپسی کا سفر طے کرتے ہوئے وہ مسلسل سوچوں کی زد میں تھے، کتنے ارمان لے کر، دل میں خوشگوار سوچیں لے کر اسی راستے سے شہر گئے تھے۔ وہ سفر کتنا دلفریب تھا، دل ودماغ پرسکون اور آنے والے دنوں کو لے کر وہ کتنے پر جوش تھے لیکن اس بار واپسی کا سفر کتنا دل گرفتہ اور تکلیف دہ تھا گھر پر بوڑھی ماں بیٹے کے اچھے مستقبل کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی اور بیٹا یہاں آ کر سب کچھ بھول بحال چکا تھا۔

"یہ سنبھالو اپنے لاڈلے کو اگر اتنا پیسہ اور کچھ تعلقات نہ ہوتے تو ساری عمر جیل میں سڑتا رہتا تمہارا لاڈلا بیٹا۔" عالم شاہ نے کمرے میں داخل ہو کر دلاور شاہ کو کاندھے سے پکڑ کر بیوی کی طرف دھکیلا اور غصے سے بولے۔

"ہائے ربا...... اللہ نہ کرے۔" ماں تھیں بیٹے کو سینے سے لگا کر رو پڑیں۔ دلاور شاہ سر جھکائے آنسو بہاتے رہے۔

اس واقعے کے بعد دلاور شاہ بالکل چپ ہو گئے تھے، انہوں نے اپنی ساری کتابیں اور پڑھائی سے وابستہ اشیاء کو الماری میں رکھ کر تالا لگا دیا تھا، ایسا کرتے وہ بے ساختہ رو پڑے تھے۔ ان کا تو خواب تھا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا لیکن...... اپنی کوتاہی اور جھوٹی شان میں آ کر انہوں نے خود ہی اپنا مستقبل بس زمینوں اور گاؤں تک محدود کر لیا تھا۔ ان کا خواب ادھورا ہی رہ گیا تھا۔ حالانکہ اماں نے کئی بار چاہا کہ پرائیویٹ ہی امتحان دے لے مگر عالم شاہ کا فیصلہ نہ بدلا۔ اب دلاور شاہ زمینوں کا حساب کتاب دیکھنے لگے اور اسی حویلی کا حصہ بن کر رہ گئے تھے۔ فیروز شاہ اپنی بیوی شگوفہ کے ساتھ حویلی کی دوسری طرف بنے ہوئے حصے میں رہتے تھے اور اس حصے میں زرتاج، عالم شاہ اور دلاور شاہ رہتے تھے۔ دلاور شاہ ویسے تو خوب صورت تھے ہی، دوبارہ سے گاؤں کا خالص کھانا ملا، ساتھ خوب محنت بھی کرتے، پھر سے تر وتازہ اور سرخ وسفید ہو گئے۔ زرتاج بیگم کی ایک بہن تھیں ان کی بیٹی زرنگار جس نے گاؤں کے اسکول سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ سگھڑ سیدھی سادی اور نیک لڑکی تھی۔ زرتاج نے دلاور کے لیے زرنگار کا رشتہ مانگ لیا۔ اس وقت زرنگار اٹھارہ برس کی الہڑ دوشیزہ تھیں جبکہ دلاور شاہ پچیس برس کے بھرو جوان۔

گاؤں کے رسم ورواج اور حیثیت کے مطابق دلاور شاہ کی شادی خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ زرنگار امید سے اچھی نکلی، نہ صرف شوہر بلکہ ساس اور سسر کا بھی بہت خیال

رکھتی، بالکل اپنے ماں باپ کی طرح ان کی ضرورتوں کا خیال رکھنا، ان کے چھوٹے چھوٹے کام کرنا زرنگار کو اچھا لگتا، دلاور شاہ جو ذہن میں بہت سے خواب سجا کر بیٹھے تھے ایک زمانہ بہلے۔ ان کے ذہن میں بیوی کے حوالے سے شہری پڑھی لکھی اور ماڈرن لڑکی کا تصور تھا، جو فیشن کے کپڑے پہنتی ہو، اس کے شانوں تک کٹے سنہری ڈائی کیے بال ہوں، جو اونچی ہیل کی سینڈلز پہن کر ماربل کے چکنے فرش پر ٹھک ٹھک کرتی چلتی پر اعتماد ہو۔ جس کی باتوں میں اردو کم اور انگریزی زیادہ ہو۔ وہ سن گلاسز لگا کر لمبی سی گاڑی ڈرائیو کرے تو اس کے پہلو میں بیٹھ کر دلاور شاہ یک ٹک اسے دیکھے جائیں لیکن...... ان کے سارے خواب، ساری خواہشات وقت کے ہاتھوں میں کھلونے کی طرح آ کر ٹوٹ گئی تھیں۔ اب وہ زرنگار کو دیکھ کر جیتے تھے، ماتھے تک اوڑھنی، خوب صورت ہاتھوں پر مہندی لگائے، ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے اپنے لمبے سیاہ اور گھنے بالوں کو جب وہ نہا کر یونہی پشت پر پھیلا دیتی تو ان آبشاروں سے ٹپکتے پانی کے قطرے دلاور شاہ کو بہت بھلے لگتے۔ وہ آگے بڑھ کر اپنی ہتھیلی میں وہ قطرے سمو لیتے۔ تب انہیں احساس ہوتا کہ اصل زندگی صرف اور صرف محبت انڈراسٹینڈنگ، ایک دوسرے کا خیال رکھنا اور خلوص سے ہی ملتی ہے اور جس شخص کو خوب صورت بیوی کے ساتھ ساتھ یہ سب کچھ مل جائے تو وہ خوش قسمت ترین ہوتا ہے اور دلاور بھی ایسے لوگوں میں ہی شامل تھے کہ جو اپنی زندگی اور اپنی شریک حیات سے سو فیصد مطمئن تھے۔

اللہ پاک نے شادی کے سال بھر بعد ہی مختار شاہ کو ان کی جھولی میں ڈال دیا۔ مختار شاہ کی پیدائش پر خوب خوشیاں منائی گئیں۔ زرتاج بیگم نے غریبوں میں کھانا تقسیم کیا، صدقے اور خیرات دیئے۔ زرتاج بیگم کو یہ خوشی تھی کہ ان کو پہلوٹی کا پوتا ملا ہے، بڑی بہو تو پہلوٹی کی بیٹی تھی۔ فیروز شاہ بذات خود بھی خود غرض تھے اور اوپر سے ان کی بیوی شگوفہ بھی تیز طرار اور فسادی قسم کی خاتون تھیں، اس لیے وہ کم کم ہی آتے جب پیسوں کا حساب کتاب ہوتا اور اناج وغیرہ کی تقسیم کا وقت ہوتا تب میاں بیوی آجاتے حصے سے کچھ زیادہ ہی وصول کر لیتے، زرتاج بیگم چپ ہو جاتیں نا بھی زرنگار نے احتجاج کیا البتہ کبھی کبھی دلاور شاہ ضرور اس بات کو لے کر ماں سے الجھ جاتے کہ ان کو زیادہ کیوں مل رہا ہے؟ لیکن ماں کے سامنے زیادہ بولتے بھی نہیں تھے۔ دن گزرتے رہے، اللہ پاک نے مختار شاہ کے بعد زوار شاہ اور پھر نگین کی صورت میں دلاور شاہ کی فیملی مکمل کر دی تھی۔ گو کہ بچے گاؤں کے ماحول میں پرورش پا رہے تھے مگر زرنگار نے ان کی پرورش میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ وہ ابتدا میں بچوں کو خود پڑھاتی، وقت پر کھانا، وقت پر سونا اور پڑھائی کا خیال رکھتی، بچے بڑے ہوئے تو گاؤں کے اسکول میں داخل کروا دیا، بقول زرنگار کے کہ سارے بچے یہیں سے ابتدائی تعلیم حاصل کریں گے۔ زرنگار اور دلاور بچوں کے معاملے میں بہت حساس تھے۔ اس لیے ان کی تربیت پر خاص توجہ دیتے، زوار شاہ فطرتاً بہت سلجھا ہوا تھا جبکہ مختار شاہ تھوڑا سا ضدی اور اکھڑ مزاج تھا نگین بھی ویسی ہی تھی۔

جب مختار شاہ نے میٹرک کر لیا تو اعلیٰ تعلیم کے لیے شہر جا کر ہاسٹل میں رہنے کی اجازت چاہی دلاور شاہ کو اپنے ساتھ ہونے والے تمام واقعات آج تک ذہن کے پردے پر یوں تھرکتے محسوس ہوتے کہ جیسے کل ہی یہ سب کچھ ہوا ہو۔ شہر کا نام سن کر وہ بری طرح چونکے۔ وہ جانتے تھے مختار تو فطرتاً ویسے بھی ضدی اور ہٹ دھرم ہے۔

”نہیں زرنگار میں اسے شہر جانے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتا۔ اس سے کہو یہیں کالج میں داخلہ لے لے۔ دنیا آتی جاتی ہے اس کالج میں اور پھر بچوں کی سہولت کے لیے ہی یہ کالج قائم ہوا ہے۔“ دلاور شاہ نے صاف انکار کر دیا۔

”شاہ جی زمانہ بہت بدل چکا ہے اور جو مضمون مختار پڑھنا چاہتا ہے وہ سہولت یہاں پر موجود نہیں ہے۔ اسے پتا نہیں کیا کیا پڑھنا ہے۔ کہتا ہے یہاں پر نہیں ہے وہ پڑھائی۔“ زرنگار نے ملائمت سے شوہر کو سمجھایا۔

”نہیں زرنگار۔ میرا دل دہل جاتا ہے، میری روح کانپ اٹھتی ہے جب میری آنکھوں کے آگے وہ مناظر آجاتے ہیں۔ مجھے کہیں سے بھی کوئی بچت کی صورت نظر نہیں آتی تھی، مجھے اس وقت لگتا تھا کہ جیسے سب کچھ ختم ہوگیا ہو۔ میرے سامنے بابا اور اماں کے چہرے آجاتے۔ بس بہت اذیت سے وہ دن گزارے تھے زرنگار۔“ گزشتہ یادیں تازہ ہوئیں تو دلاور شاہ کے رونگٹے ایک بار پھر سے کھڑے ہوگئے۔

”تم سچ کہتی ہو کہ زمانہ بدل گیا ہے، اسی طرح سے زمانے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی فطرتیں بھی بدل گئیں۔ عیاریاں، چالاکیاں اور مفاد پرستی عام ہوگئی ہے۔ میں مختار کی فطرت جانتا ہوں، اس میں تو صبر اور برداشت بھی نہیں ہے، وہ فطرتاً ضدی بھی ہے اور میں جان بوجھ کر اسے ایسے اندھیرے میں دھکا نہیں دے سکتا کہ جہاں تنہا رہ کر وہ مزید بگڑ جائے۔ اس سے کہو پڑھائی جاری رکھنی ہے تو یہیں ہمارے درمیان رہ کر پڑھے۔ ورنہ پڑھائی ختم کردے۔“ دلاور شاہ نے فیصلہ سنادیا۔

”شاہ جی بچوں سے یوں ضد اچھی نہیں ہوتی۔ وہ اپنا اچھا برا خود سمجھ سکتے ہیں۔“ زرنگار نے سمجھانا چاہا۔

”اسے ضد نہیں میری مجبوری سمجھ لو زرنگار۔“ وہ کہہ کر جاچکے تھے۔ مختار شاہ بھی اسی باپ کے بیٹے تھے، وہی خون رگوں میں گردش کررہا تھا انہوں نے بھی ضد پکڑ لی۔ اگلے سال زوار شاہ بھی کالج میں آجاتے پھر نگین بھی تین سال بعد اس مقام پر کھڑی ہوتی۔ سب کے سب اس بات کے حق میں تھے کہ گاؤں کو خیرباد کہہ دیا جائے۔ عالم شاہ اور زرتاج بیگم کا انتقال ہوچکا تھا۔

فیروز شاہ بھی کافی دنوں سے دبی دبی زبان سے زمین اور جائیداد کا بٹوارہ کرنے کا کہہ رہے تھے۔ والدین کے انتقال کے بعد وہ اور ان کی بیوی شگوفہ کے اس مطالبے نے بھی شدت پکڑلی تھی۔ بھلا دلاور شاہ تن تنہا کس طرح گاؤں میں رہنے کو ترجیح دیتے، اکیلے زمینوں کو سنبھالنا ان کے بس کی بات نہیں تھی کیونکہ فیروز شاہ بھی شہر منتقل ہورہے تھے۔ بچے بھی یہاں رہنا پسند نہیں کرتے۔ زرنگار بھی ان کو یہی کہتی کہ بہتر یہی ہے کہ جائیداد کا حصہ تقسیم کرکے شہر میں جا بسیں تاکہ بچوں کی آگے پڑھائی کا مسئلہ بھی حل ہوجائے۔ دلاور شاہ حالانکہ اس معاملے میں سخت تھے مگر زرنگار کی باتوں سے وہ پگھل گئے اور حالات کو دیکھتے ہوئے آخر انہوں نے بھی ہتھیار ڈال دیے اور شہر میں زمین دیکھنے لگے۔ وہ ایسی جگہ گھر بنانا چاہتے تھے جو پرسکون اور آبادی سے نسبتاً دور ہو، جہاں کم آبادی ہو اور اتنا بڑا گھر ہو کہ جہاں پر آنے والے وقت میں دونوں بیٹے اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ باآسانی رہ سکیں۔ یہی سوچ کر انہوں نے گنجان آبادی سے کچھ فاصلے پر ہزار گز کا پلاٹ خرید کر اسے اپنی مرضی اور سہولت کے لحاظ سے تعمیر کروایا۔ درمیانی حصے میں رہائش کے اعتبار سے کمرے، لاؤنج، کچن وغیرہ بنوایا جبکہ چاروں جانب بلند باؤنڈری بنوا کر دیواروں کے ساتھ ساتھ مٹی کی کیاریاں بھی بنوادیں جس کو ترچھی لال اینٹوں سے سجایا گیا، کیاریوں میں مختلف قسم کے پھولوں کی بیلیں اور پودے لگائے گئے تھے۔ بڑے سے گیٹ کے ساتھ ہی فرش تھا سائیڈ میں کار پارکنگ کا حصہ اور دوسری جانب چھوٹا سا گارڈن تھا۔ جس میں سنگی بینچ اور میز بنائی گئی تھی۔ آہنی گیٹ کے ساتھ راہداری سے ہی اندر جانے والے راستے کو شیڈ سے کور کیا گیا تھا۔ راہداری سے گزر کر اندر جانے کے لیے ماربل کی تین سیڑھیاں عبور کرکے بڑا سا نقشین اخروٹ کی لکڑی کا دروازہ تھا اندر داخل ہوتے ہی سامنے بڑا سا لاؤنج اور اس کے کونے میں خوب صورت اور جدید طرز کا کچن۔ سائیڈ میں بیڈرومز اور داخل ہوتے ہی سیدھے ہاتھ پر لمبائی میں ڈرائنگ روم بنایا گیا تھا۔ غرض یہ کہ تمام ضروریات سے آراستہ یہ اپنے طرز کا خوب صورت اور بہترین گھر تھا جہاں آکر بچوں کے ساتھ ساتھ زرنگار بھی بہت خوش تھی۔ وسیع وعریض بڑی سی چھت تھی جس سے آس پاس کے کچھ تعمیر شدہ اور کچھ زیر تعمیر گھر نظر آرہے تھے۔ کچھ فاصلے پر شاپنگ سینٹر تھا جہاں ضروریات زندگی کی تمام اشیاء

دستیاب تھیں۔ اسکول اور کالج قدرے فاصلے پر تھے لیکن پک اینڈ ڈراپ کی سہولتیں موجود تھیں۔ دلاور شاہ نے گاؤں کے تعلق سے تمام حساب کتاب کرلیا تھا، ویسے بھی والدین کی وفات اور بڑے بھائی کے بے حس رویے کی وجہ سے وہ خود بھی بددل ہوگئے تھے مگر پھر بھی ایک انسیت تو تھی اس جگہ سے اس وقت مختار شاہ فرسٹ ایئر میں تھے۔ زوار شاہ میٹرک میں تھے اور نگین ساتویں کلاس کی طالبہ تھی۔ شہر آ کر دلاور شاہ نے کپڑے کی چھوٹی سی فیکٹری کی بنیاد رکھی اور اللہ کا نام لے کر کاروبار کی شروعات کی۔ گاؤں میں کافی لوگ ایسے تھے کہ جو شہر آ کر پیسے کمانا چاہتے تھے وہ لوگ دلاور شاہ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوگئے یہاں سے گاؤں کا راستہ بھی بہت زیادہ دور نہ تھا آج کل تو بسیں بھی چلتی تھیں یوں کچھ پرانے لوگ ساتھ شامل ہوگئے، اور آہستہ آہستہ کام ترتیب سے ہوتا گیا۔ بچے بھی یہاں آ کر بہت خوش اور مطمئن تھے۔ زرنگار بیگم نے گھریلو کام کاج کے لیے ایک عورت رکھ لی تھی اسی طرح زندگی ایک نئے انداز سے گزرنے لگی تھی۔

موسم تبدیل ہونے لگا تھا، موسم کی تبدیلی کے آثار ہوئے تو زرنگار نے گھر کی تفصیلی صفائی کروالی ساتھ ہی سردیوں کے کپڑے، گدے اور رضائیاں وغیرہ بھی ٹرنک سے نکلوا کر دھوپ کے لیے کھلے چھت پر ڈلوادیے۔ یہ سارا کام وہ ماسی کے ساتھ مل کر کرواتی تھی دلاور شاہ بھی دو دن کے لیے کراچی سے باہر گئے ہوئے تھے۔ سارے کاموں سے فارغ ہوکر سہ پہر کے قریب زرنگار نہا کر بچوں کے ساتھ لان میں بیٹھی چائے پی رہی تھیں یہاں اس وقت ہلکی ہلکی دھوپ اتر آئی تھی اور اس وقت وہ دھوپ بھلی محسوس ہورہی تھی۔ مختار شاہ اپنے موبائل میں گم تھے جبکہ زوار شاہ کچھ پڑھ رہے تھے، نگین اپنے اسکول کا پروجیکٹ تیار کررہی تھی۔ اسی وقت گیٹ پر خان بابا کی آوازیں آنے لگیں جیسے کسی سے بات کررہے ہوں۔

"کون ہے خان بابا؟" زرنگار نے زوار شاہ کو گیٹ کی جانب بھیجا۔

"مما کوئی عورت ہے عجیب سی وہ آپ کے بارے میں بات کررہی ہے۔" زوار شاہ واپس آ کر بولا۔

"اچھا خان بابا اسے بھیج دیں۔" زرنگار نے تھوڑا سا اٹھ کر گیٹ کی طرف نگاہ دوڑائی تو سیاہ پرنٹڈ چادر میں ملبوس کوئی عورت نظر آئی جس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ وہ اندر آئی خستہ حال عورت جس کے جسم پر میلے اور بوسیدہ کپڑے تھے، تھکا ہوا وجود، گرد میں اٹے پیر، پیروں میں کالی دو پٹی والی چپل، اتنے گرد آلود ہونے کے باوجود اس کے سفید پیر خوب صورت لگ رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا وہ لمبی مسافت طے کرکے یہاں تک آئی ہے۔ اتنی نڈھال اور تھکن سے چور تھی۔ وہ آ کر سامنے گھاس پر ڈھے گئی اور لمبی لمبی سانسیں لے کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"نگین ایک گلاس پانی دو۔" زرنگار نے کہا تو نگین نے بوتل سے پانی نکال کر اس کی سمت بڑھایا۔ لپک کر پانی لیا اور ایک ہی سانس میں پورا پی گئی۔

"بی بی...... یہ آپ نے ہی دیا تھا ناں؟" اس عورت نے ہاتھ آگے بڑھایا اس میں مڑا تڑا سا کارڈ تھا۔ جو مستقل ہتھیلی میں دبا رہنے کی وجہ سے پسینے سے گیلا ہوچکا تھا۔ زرنگار نے حیرت سے کارڈ کی جانب دیکھا اور اس کی ہتھیلی سے کارڈ اٹھالیا۔

"یہ...... یہ تو دلاور شاہ کا کارڈ ہے، یہ تمہارے پاس کیسے آیا؟" انہوں نے آنکھیں ترچھی کرکے قدرے تیز لہجے میں پوچھا۔

"بی بی جی، یہ...... یہ میرے پاس نہیں تھا۔ میرے گھر والے نے مجھے دیا تھا کہ کسی میڈم نے اسے دیا ہے۔ یہ آپ کا ہی ہے ناں؟" اس نے بات مکمل کرکے امید بھری نظروں سے زرنگار کو دیکھا۔ زرنگار نے کچھ دیر سوچا تب ہی ان کو اچانک یاد آیا کہ جب وہ لوگ شروع شروع میں یہاں آئے تھے تب ایک رکشے والے کو یہ کارڈ دیا تھا۔

"یہ کارڈ تو میں نے کسی رکشے والے کو دیا تھا۔" زرنگار نے اس کو اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی...... بی بی جی۔ وہ رکشے والا میرا گھر والا تھا جی۔ اس کی فوتگی ہوگئی ہے میں...... میں بہت پریشان ہوں جی، بہت مجبور بھی، بہت دور سے چل چل کر یہاں تک آئی ہوں۔ میں بھکارن نہیں ہوں جی۔ میں کام کی تلاش میں ہوں۔ محنت کروں گی مگر عزت کا سودا نہیں کروں گی۔ شاید اب تک مر بھی جاتی اگر ایک بیٹی کا بوجھ ساتھ نہ ہوتا تو۔“ اس کے لہجے میں اذیت چیخ رہی تھی کرب اور تکلیف ایک ایک لفظ سے عیاں ہو رہی تھی۔ وہ کتنی مجبور اور لاچار تھی، زرنگار نے اس کے سراپے پر بھرپور نگاہ ڈالی وہ بہ مشکل تیس سال کی ہوگی، بلاشبہ وہ خوبصورت تھی۔ غربت، افلاس اور بھوک نے اس کے چہرے پر گو صدیوں کی تھکن اتار دی تھی مگر آج بھی وہ حسن کا شاہکار تھی۔

”میں بہت مجبور ہو کر آپ کے پاس آئی ہوں بی بی صاحبہ، غربت بہت بری شے ہے اور اس پر اگر شکل اچھی ہو تو زمانے کا ہر شخص اس کو اپنی جاگیر سمجھ لیتا ہے۔ بہت مشکل ہے زندگی......“ وہ رو رہی تھی۔ اس کے لفظوں کے اندر بے بسی چھلک رہی تھی۔

”تم اب کہاں رہتی ہو؟“ زرنگار نے پوچھا۔

”جی ابھی تو کوئی ٹھکانہ نہیں ہے میرا۔ بس اللہ کا آسرا ہے۔ ساتھ ہی جوان ہوتی ہوئی بیٹی کی اٹھان دیکھ دیکھ کر دل دہلتا ہے۔ کب تک اسے چھپاؤں گی؟ خود کو چھپاؤں یا اس کو؟ یہاں تو قدم قدم پر بھوکے بھیڑیے گھات لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ نہ عمر کا خیال ہوتا ہے نہ عزت اور احترام کے معنی جانتے ہیں۔“

”اچھا اچھا...... ایسا کرو تم اپنی بیٹی کو لے کر یہاں آجاؤ۔ میں تم کو کام بھی دوں گی اور رہائش بھی مگر خبردار کوئی ہوشیاری نہ دکھانا۔ میری ہمدردی کا ناجائز فائدہ مت اٹھانا ورنہ مجھے دوسرا طریقہ بھی آتا ہے۔ بہت سے ایسے مظلوموں کی کہانیاں سن رکھی ہیں میں نے جو بعد میں چونا لگا کر رفو چکر ہو جاتے ہیں اور ہمدردی کرنے والا بے چارہ ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے۔“ زرنگار کو ویسے تو اس پر رتی برابر بھی شک نہیں تھا مگر انہوں نے اپنے طور سے اسے وارننگ بھی دے دی تھی۔

”بیگم صاحب، آپ کا بہت شکریہ۔ اللہ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں ایسی ویسی عورت نہیں ہوں جی۔ نہ چور، نہ مکار اور نہ ہی آوارہ۔ اگر ایسی ویسی ہوتی تو شاید اس حالت میں نہ ہوتی۔ سچائی، عزت اور بے داغ زندگی کے لیے تو اتنے پاپڑ بیلنے پڑ رہے ہیں مجھے۔ بس مجھے دو وقت کی روٹی، عزت سے رہنے کو تھوڑی سی جگہ مل جائے۔ جہاں میں اپنی بچی کے ساتھ عزت اور سکون سے رہ سکوں میرے لیے یہی بہت ہے بی بی جی۔ اللہ پاک آپ کو اجر دے آمین۔“ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعائیں دیں۔

”ٹھیک ہے تم کل اپنی بیٹی اور جو سامان ہے وہ لے کر آجانا۔ میں تمہارے لیے رہنے کا بندوبست کر دوں گی۔“ وہ سر ہلا کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں تشکر کا احساس تھا۔

”بی بی صاحب ساری زندگی آپ کو دعائیں دوں گی۔ اللہ پاک آپ کا گلشن یونہی آباد رکھے۔“ وہ دعائیں دیتی ہوئی اٹھی اور گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

”مما جان یہ غریب لوگ کیوں ہو جاتے ہیں؟“ نگین کے سوال پر وہ چونکیں۔ بھلا کیا جواب دیتیں کہ یہ اللہ کی مصلحت ہے کہ وہ کسی کو امیر بناتا ہے تو کسی کو غریب، کسی کے نصیب میں آزمائشیں، ٹھوکریں، ناکامی اور مفلسی ڈال دیتا ہے تو کسی کی جھولی میں آسائشات، کامیابیاں اور عروج ڈال دیتا ہے، اللہ پاک کی مصلحت اور حکمت کے آگے ہم انسان مجبور اور بے بس ہیں لیکن ہمارا ایمان اس بات پر پختہ ہونا چاہیے کہ وہ ذات پاک جو کچھ بھی کرتا ہے اس میں بڑی اعلیٰ حکمت اور بھلائی پوشیدہ ہوتی ہے ہم ناقص العقل لوگ بعض اوقات اس حکمت کو سمجھ نہیں پاتے لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس رب تعالیٰ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ رات کو دلاور شاہ واپس آئے تو زرنگار بیگم نے آج آنے والی عورت اور اس کے آنے میں جو واقعہ ملوث تھا وہ سب ان کے سامنے گوش گزار کر دیا۔

”ارے زرنگار بیگم آپ بھی ہر فیصلے میں عجلت سے کام لیتی ہیں۔ نہ جانے کون ہے، وہ سچ کہہ بھی رہی ہے یا نہیں؟ آج کل کے حالات اس قابل نہیں کہ یونہی کسی پر بھروسہ کرلیا جائے، کم از کم مجھ سے مشورہ تو لے لیا ہوتا۔“ دلاور شاہ جو پہلے ہی شاکی رہتے تھے ان کو زرنگار کا اس طرح سے فیصلہ کرنا اچھا نہیں لگا۔ حالانکہ وہ زرنگار کی کسی بھی بات سے اختلاف نہیں کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ زرنگار بیگم معاملہ فہم اور سمجھدار خاتون ہیں لیکن آج کل کے حالات سے خوف زدہ بھی تھے اور پھر شہر کے حوالے سے تلخ یادیں آج بھی ان کے ساتھ تھیں کہ جب بھی وہ دن یاد کرتے تو ان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے۔

”نہیں شاہ جی ہمیں سو فیصد یقین ہے کہ وہ ایک مجبور، بے سہارا اور شریف عورت ہے، جس کو حالات نے اس مقام تک پہنچایا ہے کہ وہ یوں دربدر پھر رہی ہے اور شاہ جی اگر ہم اسے سہارا نہیں دیں گے تو کل کو خدانا خواستہ وہ بیٹی سمیت غلط ہاتھوں میں جاسکتی ہے۔ اس لیے میں نے اللہ اور اس کے رسول کو حاضر و ناظر جان کر اس کے لیے یہ پیشکش رکھی ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ ہمارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائے گی، اس کو بس شرافت کے ساتھ سر چھپانے کا ٹھکانہ درکار ہے اور کچھ نہیں لیکن پھر بھی اگر میں نے اس میں کوئی منفی بات یا کوئی قابل مذمت بات دیکھی تو ایک منٹ سے پہلے پہلے اس کو یہاں سے چلتا کردوں گی، آپ فکر نہ کریں۔“ زرنگار نے دلاور شاہ کو مطمئن کردیا تھا اور دلاور شاہ سر ہلا کر رہ گئے اور بیوی کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر پینے لگے۔

دوسری صبح مختار شاہ اپنے کالج، نگین اور زوار اسکول اور دلاور شاہ فیکٹری چلے گئے زرنگار ناشتے سے فارغ ہوکر ابھی چائے پی رہی تھیں کہ چوکیدار نے گل مینا کے آنے کی اطلاع دی۔ گل مینا جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوئی سامنے ہی لاؤنج میں ڈائننگ ٹیبل پر زرنگار بیٹھی تھیں۔ گل مینا کے پیچھے بارہ تیرہ برس کی بچی تھی۔ نازک سراپا، سرخ و سفید رنگت، لمبے سیاہ بالوں کی دو لمبی لمبی چوٹیاں آگے ڈالے وہ معصومیت اور حسن کا مکمل پیکر نظر آرہی تھی۔

”یہ میری بیٹی پری گل ہے جی۔ پری گل بیگم صاحبہ کو سلام کرو۔“ گل مینا نے سلام کرکے بیٹی کی طرف اشارہ کیا پھر زرنگار سے مخاطب ہوئی۔

”اوہ اچھا...... ادھر آؤ پری گل، ڈرو نہیں۔“ زرنگار نے بغور اس کو دیکھ کر ملائمت سے کہا وہ لڑکی سہمی ہوئی اور کچھ پریشان سی لگ رہی تھی۔ زرنگار کی بات پر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان کے پاس آگئی۔

”تم گھبراؤ نہیں گل پری۔ یہاں تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی میری بیٹی بھی ہے تمہاری جتنی تم اس کے ساتھ کھیلنا۔ یہاں تمہیں اور تمہاری ماں کے لیے کوئی مشکل درپیش نہیں ہوگی۔ ان شاء اللہ یہاں پر تم لوگ محفوظ رہوگی۔“ زرنگار کی بات پر پری گل کے چہرے پر تھوڑا اطمینان آیا، اس نے مڑ کر اپنی ماں کی طرف دیکھا گل مینا بھی کل کی بہ نسبت آج خاصی پرسکون نظر آرہی تھی۔

”اللہ پاک آپ کو اجر دے بی بی صاحبہ۔“ گل مینا نے ہاتھ اٹھا کر دعا دی۔ رہائشی ایریا کے پچھلی طرف ایک کمرہ اور چھوٹا سا واش روم بھی بنایا گیا تھا، وہ کمرہ ان دونوں کے لیے صاف کرکے رہنے کے لیے دے دیا گیا، مختصر سا سامان چند جوڑوں اور ایک چارپائی، صندوق پر مشتمل تھا جو سیٹ کرکے اس کمرے کو آباد کرلیا گیا تھا۔

”اوہ مما، آپ بھی ناں ہر کسی پر اپنی عنایات کے پہاڑ توڑنے لگتی ہیں، اپنی محبت نچھاور کرنے لگتی ہیں، بھلا کیا ضرورت تھی ان غلیظ لوگوں کو گھر میں جگہ دینے کی۔“ مختار کالج سے آیا تو کچن میں برتن دھوتی گل مینا کو دیکھ کر ماں کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

”ہش...... ایسا نہیں کہتے مختار، بری بات ہوتی ہے مجبور اور بے سہارا لوگ ہیں۔“ زرنگار نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”مجبور اور بے سہارا لوگوں کے لیے ایدھی سینٹر اور دوسری جگہیں ہیں مما ان کو وہاں بھیج دیں۔“ مختار کے لہجے میں رعونت تھی۔ ”ہم نے ٹھیکہ لیا ہے کیا غریب اور مجبور

لوگوں کو سہارا دینے کا۔"

"بھائی...... پلیز ایسا نہیں کہتے اللہ پاک ناراض ہوتا ہے۔" نگین جو پیچھے سے آ گئی تھی اس کو بڑے بھائی کی باتیں اچھی نہیں لگیں۔

"تم دادی اماں مت بنو آئی سمجھ۔" وہ غصے سے نگین کی جانب پلٹا اور نگین منہ بسور کر رہ گئی۔

"مختار تم جاؤ چینج کرو اور آ کر کھانا کھالو۔ فضول بحث مت کرو۔ میں نے جو مناسب سمجھا ہے کیا ہے جب تمہارے پاپا کو اعتراض نہیں ہے تو تم کون ہوتے ہو اعتراض کرنے والے اور یوں کسی کو بنا سوچے سمجھے برا نہیں کہو کچھ لوگ سچ مچ مجبور اور بے بس ہوتے ہیں۔ ان کو سہارا دے کر ہمیں اجر ہی ملے گا۔ ہمارے اجر و ثواب کو مٹی میں مت ملاؤ۔" زرنگار نے قدرے تیز لہجے میں بڑے بیٹے کی کلاس لی تو وہ پیر پٹختا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ کچن میں برتن دھوتی ہوئی گل مینا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

شام کو دلاور شاہ آئے تو ان کے سامنے گل مینا اور پری گل آئیں سلام کر کے ایک طرف کھڑے ہو گئیں۔ پری گل ان کے لیے گلاس میں پانی نکال کر سلیقے سے ٹرے میں رکھ کر اوپر سے طشتری ڈھانپ کر لے آئی۔ دلاور شاہ نے بغور دونوں کو دیکھا۔ ان کو پری گل کا یہ انداز اچھا لگا۔ وہ نگین کی ہم عمر ہوگی مگر وقت اور حالات نے کتنا تضاد کر دیا تھا دونوں کے نصیبوں میں۔ جب کہ گل مینا بھی ان کو سیدھی سادی لگی چلتر، چال باز اور مکار عورت کہیں سے بھی نہیں لگی انہوں نے دو چار سوالات کیے اور مطمئن ہو گئے۔ گل مینا نے کچن کے سارے کام اچھی طرح سے سنبھال لیے۔ پری گل ساتھ ساتھ لگی رہتی، خود کو بڑی سی کالی چادر میں اچھی طرح سے چھپائے وہ کام میں مصروف رہتی۔ پری گل بھی ہمیشہ بڑی سی کالی پرنٹڈ چادر اوڑھے رہتی سر پر سے اس طرح سے لپیٹے رکھتی کہ چہرہ بھی پوری طرح سے نظر نہ آتا۔ نگاہیں جھکائے مصروف عمل رہتی۔

زوار شاہ جو فطرتاً نرم دل اور ہمدرد انسان تھا اس کو ان لوگوں کے رکھنے یا ساتھ رہنے پر کوئی اعتراض نہ تھا بلکہ وہ تو ماں سے ان کے بارے میں سن کر کف افسوس مل رہا تھا کہ بے چاری کتنی مجبور عورت ہے، نگین بھی خوش تھی اس کو خوشی تھی کہ پری گل سے وہ کھیلا کرے گی اور اس کو اپنی سہیلی بنا لے گی۔ معصوم سی پری گل اسے بہت اچھی لگی تھی۔

"یہ لو گل مینا شام کو بازار جا کر اپنے اور پری گل کے لیے کاٹن کے سوٹ لے آنا۔" گل مینا شام کو چائے لے کر آئی تو زرنگار نے کچھ نوٹ اس کی جانب بڑھائے اور بغور اس کے کپڑوں کو دیکھا، سیاہ پرنٹڈ سوٹ جو بہت زیادہ پہننے اور دھلنے کی وجہ سے اپنی اصل رنگت کھو چکا تھا۔ بے شک لباس صاف ستھرا تھا مگر بدرنگ اور جگہ جگہ سے سلا ہوا تھا۔ سر کی چادر کئی جگہ سے پھٹ گئی تھی اور کافی سوراخ نظر آ رہے تھے۔ گل مینا نے نظر اٹھا کر زرنگار بیگم کو دیکھا اس کے چہرے پر تشکر اور آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی نمایاں تھی۔

"بہت بہت مہربانی جی، اللہ پاک نے آپ کو میرے لیے فرشتہ بنا کر بھیجا ہے جی۔ کتنا خیال رکھتی ہیں آپ۔" اس نے نوٹ ہاتھ میں پکڑتے ہوئے نم لہجے میں کہا۔ "سچی لگتا تھا میرے لیے اب دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔ مجھے مر جانا چاہیے مگر جب پری گل سامنے آتی تو سب کچھ بھول کر اسے سینے سے لگا لیتی کہ اگر مجھے کچھ ہو جائے گا تو زمانہ تو اس معصوم کی ہڈیاں تک بھنبھوڑ کر رکھ دے گا۔" کہتے ہوئے اس کی آواز رندھ گئی اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ زرنگار بیگم نے آگے بڑھ کر اس کا کاندھا تھپتھپایا۔

"اس دنیا میں ہر کوئی برا نہیں ہے، جہاں برے اور گھٹیا لوگ ہیں وہیں اچھے، نیک اور خدا ترس لوگوں کی کمی نہیں ہے، ہر کوئی یہی کہتا ہے زمانہ خراب ہے، زمانہ برا ہے، کیسا زمانہ آ گیا ہے۔ زمانہ برا نہیں ہوتا، برے لوگ ہوتے ہیں اس زمانے کو بنانے والے بھی لوگ ہیں اور بگاڑنے

والے بھی ہم لوگ ہی ہیں۔ اگر زمانہ برائی کی سمت جارہا ہے تو اسے برائی سے بھلائی کی طرف لانے والوں کی کمی بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا چل رہی ہے۔ یہ تو سب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے کسی انسان میں نہ حوصلہ ہے، نہ ہمت کہ دوسرے شخص کو اٹھا کر ایک پیسہ بھی دے۔ یہ اس کو اللہ کی طرف سے توفیق ہوتی ہے کہ وہ اپنے مال سے ایک پیسہ بھی کسی کی جھولی میں ڈال دے۔ بس اللہ پاک ہمیں نیک عمل کی توفیق عطا فرمائے آمین۔'' زرنگار نے اس کی بات پر لمبی چوڑی بات کہی اور وہ سر ہلا کر تائید کرنے لگی۔

''سچ ہے بی بی جی۔ یہ دنیا بھی عجیب شے ہے۔ انسان کو کیسے کیسے تماشے دکھاتی ہے۔ بھوکے بھیڑیے بھی یہیں ملتے ہیں تو فرشتوں کی بھی کمی نہیں۔ کوئی عورت سے چادر کھینچ کر اس کی عزت نیلام کرتا ہے تو کوئی ابن آدم اس عورت کو چادر تھما کر اس کی عزت بچالیتا ہے۔ بہت اونچ نیچ دیکھے ہیں میں نے بھی۔ بہت دکھ، تکلیف اور مصیبتوں سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہوں۔ کئی بار اللہ پاک کے سامنے گر کر اس سے اپنے دکھوں کا حساب بھی مانگا مگر توبہ توبہ جی پھر خود ہی توبہ کرلی کہ وہ تو ہمیں عطا کرنے والا ہے۔ بھی بھلا تو بھی برا۔ ہم اس سے صرف دعا ہی مانگ سکتے ہیں خیر کی۔ بھلے کی اور میری دعائیں بھی قبول ہوگئیں کہ آپ جیسے لوگوں سے واسطہ ہوگیا۔''

''اچھا گل بینا ایک بات بتاؤ، تم کہاں کی رہنے والی ہو، اس حال تک کیسے پہنچیں؟ تم نے مجھے یہ سب باتیں بتائی نہیں۔'' زرنگار بیگم نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی بی بی جی۔ یہ بہت لمبی کہانی ہے جی، دکھ اور تکلیف سے بھری ہوئی۔ آپ کے پاس اتنا وقت ہوگا کیا؟'' اس کے لہجے میں دکھ بول رہے تھے۔

''ہاں ابھی تو میں فری ہوں، اگر تم سنانا چاہو تو سنا سکتی ہو۔'' زرنگار کی بات پر اس نے ٹھنڈی سانس لے کر آنکھیں بند کیں جیسے ماضی کے تانے بانے بن رہی ہو۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آرہے تھے، چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اس کے دل و دماغ میں اٹھنے والے طوفان کا اندازہ لگانا مشکل نا تھا، اس نے آنکھیں کھولیں۔ اس کی خالی خالی آنکھوں میں اذیت تھی۔ کرب اور دکھ نمایاں تھا۔
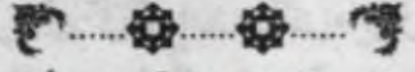
اندرون پنجاب بسنے والا یہ چھوٹا سا گاؤں خوب صورتی میں اپنی مثال آپ تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکوں سے جھولتے لمبے لمبے درخت، خوش نما منظر میں لپٹے چھوٹے چھوٹے پہاڑ، سنہری دھوپ میں نکھرا ہوا یہ چھوٹا سا گاؤں۔ پھولوں اور پھلوں سے لدے خوش نما درخت، ناچتی گاتی فصلیں، چھوٹے چھوٹے مٹی کے بنے ہوئے مکانات اور ان مکانات کے صحن میں رکھے مٹی کے چولہوں سے اٹھتا ہوا دھواں۔ بارش میں کھیتوں کے حسن اور شادابی میں مزید نکھار اور دلکشی بڑھ جاتی۔ سورج کی کرنیں صبح صبح جب اس گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لیتیں تو ایسا منظر ہوتا کہ جیسے کسی حسین دوشیزہ نے گوٹا اور کرن لگا دوپٹا ماتھے پر سجالیا ہو۔ اونچے نیچے راستے اور پگڈنڈیاں اور ان پگڈنڈیوں پر آتی جاتی گاؤں کی الہڑ دوشیزائیں جو اپنے سروں پر روایتی چادریں ڈالے کبھی کھیتوں میں نظر آتیں تو کبھی بکریاں چرا رہی ہوتیں۔ بڑے بڑے وسیع و عریض رقبے پر پھیلے کھیت اور کھیت پر کام کرنے والے انتہائی اور غریب لوگ تھے جبکہ ان کھیتوں اور زمینوں کے مالک بڑے دولت مند اور اونچے اثر والے لوگ تھے۔ زمانہ بدل گیا۔ حالات بدل گئے مگر کچھ جگہیں آج بھی ایسی تھیں کہ جہاں بااثر لوگوں کی حکومت تھی اور نچلے طبقے کے لوگ آج بھی کمی کمین کہلاتے تھے جو سر جھکائے ملکوں اور مالکوں کے زیر اثر رہتے تھے۔

ایسے لوگوں میں حمید کی فیملی بھی تھی اس کا تعلق تو سرحد سے تھا مگر وہ لوگ کچھ ذاتی مسائل کی وجہ سے وہاں سے اس گاؤں میں آکر آباد ہوگئے تھے۔ حمید اپنی بیوی بختاں اور ایک بیٹی گل بینا کے ساتھ رہتا تھا۔ ملکوں کے کھیتوں پر کام کرکے اپنا گھر چلاتا تھا۔ یہاں کے بیشتر لوگ اسی طرح کے کام کرتے جو ذرا سا پڑھ لکھ جاتے وہ شہر میں نوکریاں تلاش کرلیتے یہاں سے شہر جانے والی سڑک بھی

ن چکی تھی اس لیے لمبا فاصلہ طے کر کے بسوں کے ذریعے صبح جا کر شام ڈھلے لوٹ آتے تھے۔

"اماں مجھے کبھی کبھی اجازت نہیں دیں گی؟" گل مینا کے لہجے میں ناامیدی تھی، اس وقت وہ اپنی سکھیوں فاطمہ، سکینہ اور رضیہ کے ساتھ افسردہ اپنے کمرے میں پلنگا چارپائی پر بیٹھی تھی۔

"ارے کیوں فکر کرتی ہے تیری اماں اتنی بھی ضدی نہیں مان جائے گی ہم بھی تو ہوں گے ناں تیرے ساتھ۔" فاطمہ نے تیسری بار یہی جملہ دہرایا تو گل مینا کو غصہ آ گیا۔

"بتایا تو ہے کہ وہ ڈرتی ہے مجھے باہر بھیجنے سے۔ ابا بھی منع کرتا ہے کہ باہر نہ نکلا کر۔ پتا نہیں ایسا کیا رکھا ہے میرے اندر۔" وہ جھلا کر بولی۔

"چل ہم پوچھ لیں گے تیری اماں سے تو رنج نہ کر۔" رضیہ سے اس کا اترا ہوا منہ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

"چل تو بھی کر لے کوشش۔" گل مینا نے بڑی بڑی پلکیں اٹھا کر رضیہ کی طرف دیکھا اور اٹھتے ہوئے بولی تو سب مل کر صحن کے کونے میں بنے چھوٹے سے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئے۔ جہاں بختاں بیٹھی ہنڈیاں پکا رہی تھی۔

"آ گئی ناں حمایتیوں کو لے کر۔" بختاں جو کافی دیر سے اندر کھچڑی پکتے دیکھ رہی تھی اس نے آٹا گوندھ کر پرات سرکاتے ہوئے گل مینا کو غور سے دیکھ کر کہا تھا۔

"اماں جانے دے ناں۔ ایک بار صرف ایک بار جانے دے آئندہ تجھ سے نہیں بولوں گی۔ ساری سکھیاں جاتی ہیں، کسی کی اماں تو منع نہیں کرتی۔ تجھے کیا ڈر ہے اماں۔" وہ عاجزی سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر لاڈ سے بولی۔

"ارے پگلی...... یوں جوان جہان لڑکیوں کا گھروں سے باہر نکلنا چنگا نہیں ہوتا اور تو، تو ہے اتنی خوب صورت، میری اک ہی اک دھی ہے تو، اگر کہیں کسی بھوت پریت کا سایہ پڑ گیا تو میں تو مر جاؤں گی۔" بختاں کے لہجے میں خوف تھا۔ "تو ہمیشہ پوچھتی ہے ناں کہ تجھے باہر کیوں نہیں جانے دیتی تو سن میری بڑی بہن تھی تیری خالہ، وہ بہت حسین تھی، اس کے لمبے بال گھٹنوں سے نیچے تک تھے، وہ ہنستی تو لگتا کہ گھنٹیاں بجنے لگی ہوں، وہ بولتی تو لگتا فضا میں کوئل کوک رہی ہو، وہ چلتی تو ہر کوئی اس کو دیکھے جاتا، وہ جو کپڑا پہنتی اس پر سج جاتا، وہ دن بھر گاؤں کی گلیوں میں اترائی پھرتی تھی، لوگوں سے تعریفیں کرواتی رہتی تھی۔ اماں اسے منع کرتی مگر وہ باز نہ آتی اور ایک روز وہ شام ملتے ہوئے پیڑ کے نیچے سے گزری تو، تو......" ایک لمحے کے لیے بختاں خاموش ہوئی۔ اس کے چہرے پر خوف تھا۔

"تو...... تو کیا ہوا؟" رضیہ نے تجسس سے پوچھا۔

"کہتے ہیں دو شام ملتے وقت جن، بھوت پریت کا سایہ ہو جاتا ہے اور اس پر بھی پیڑ پر سے جنات نے قبضہ کر لیا اور پھر دیکھتے دیکھتے وہ بالکل سوکھ گئی، جیسے کانٹا...... نا کھانے کا ہوش ہوتا نا پہننے کا، نا سہیلیاں یاد تھیں ناں ہم لوگ۔ اماں کا رو رو کر برا حال ہو گیا تھا، گاؤں تو گاؤں شہر بھی گئے دنیا جہاں کے پیروں کو دکھایا مگر اس کی حالت نا سنبھلی آخر میں اماں نے رو رو کر اپنی آنکھیں گنوا دیں۔ اس کو سنبھالتے سنبھالتے ابا بھی بے حال ہو گیا اور وہ یونہی مر گئی۔ بس تب سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں نے پھر باہر نکلنا بند کر دیا تھا اور...... اور تو بھی بہت حسین ہے مینا، بالکل اپنی ماسی جیسی، مجھے تجھے دیکھ کر بھی ہول آتے ہیں۔ ڈر لگتا ہے تو اتنی منتوں اور مرادوں کے بعد تو ہماری جھولی میں آئی ہے، میں نے تجھے ایسے ہی نہیں پایا دھیے۔" بختاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ رضیہ، فاطمہ اور سکینہ بھی آزردہ ہو گئی تھیں۔

"ہائے میری پیاری اماں۔" گل مینا نے آگے بڑھ کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ "میں کون سا دن رات باہر گھومتی ہوں۔"

"ہاں ماسی بختاں، تیری بات اپنی جگہ ٹھیک ہے مگر ہم سب بھی تو ہوں گے میرا چھوٹا بھائی بھی ساتھ ہوگا ہم دن ڈھلنے سے بہت پہلے لوٹ آئیں گے اور کون سا گاؤں کے باہر جانا ہے ماسی۔ تو فکر نہ کر ہم گل مینا کو گھر سے لے

جائیں گے اور گھر پر چھوڑیں گے بس تو اجازت دے دے اب کی بار میلہ لگا ہے، ہم خود بھی نہیں گئیں مگر سنا ہے اس بار بہت بڑا میلہ لگا ہے تو دل کرتا ہے سب کا۔" سکینہ نے کہا تو بختاں نے نگاہ اٹھا کر گل مینا کو دیکھا سچ ہی تو ہے وہ بے چاری کہاں جاتی تھی دن بھر گھر کے کاموں میں لگی رہتی یا پھر پندرہ دن میں ایک بار شہزاد سے ملاقات ہوتی۔

"اچھا ٹھیک ہے، مگر جلدی لوٹ آنا۔" بختاں کی اجازت ملتے ہی گل مینا بچوں کی طرح اچھل کر تالیاں بجانے لگی اور جھٹ سے اماں کے گال چوم لیے۔ بختاں مسکرادی تھی۔

ویسے بھی جمعرات کے جمعرات بختاں گاؤں میں بنے بزرگ کے مزار پر گل مینا کی لمبی حیاتی کے لیے دیئے جلاتی تھی اور کسی سے نظر کا تعویذ منگوا کر بھی اس کے گلے میں ڈال رکھا تھا۔ اپنے طور سے سارے انتظامات کر رکھے تھے، کیوں نہ کرتی شادی کے اتنے سال بعد تو اللہ نے جھولی بھری تھی اور بھری بھی تو پریوں جیسی خوب صورت گڑیا سے جس کو دیکھ کر آس پاس کے لوگ رشک کرتے کہ حمید اور بختاں کے گھر شہزادی آئی ہے۔ حمید اور بختاں نے اس شہزادی کو ہتھیلی کا چھالہ بنا کر رکھا تھا زمین پر قدم پڑنے نہیں دیتے، اس کے لیے دم کیے گئے پانی لاتے تو کبھی تعویذ لا کر گلے میں باندھتے، وہ بڑی ہوتی گئی جیسے جیسے بڑی ہو رہی تھی اس کے حسن میں مزید اضافہ بھی ہو رہا تھا، اس گاؤں میں کچھ فاصلے پر بختاں کی بہن رہتی تھی، وہ بیوہ تھی ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا بیٹا تو جوان تھا مگر بیٹی کافی چھوٹی تھی۔ بھائی اور اماں کی لاڈلی جس کا نام ستارہ تھا اور وہ بھی ستارے جیسی چم چم چمکتی، ادھر ادھر اچھلتی کودتی، اور ہنستی مسکراتی رہنے والی گڑیا تھی۔ شہزاد نے گاؤں کے اسکول سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور پھر شہر میں کسی فیکٹری میں نوکری کرلی تھی۔ اس کے لیے روزانہ فیکٹری سے آنا جانا دشوار ہوتا اس لیے وہ وہیں کرائے پر کمرہ لے کر رہنے لگا تھا اور پندرہ دن میں ایک بار گاؤں آتا تھا۔ شہزاد کا رشتہ بچپن سے ہی گل مینا سے طے ہو چکا تھا۔ شہزاد اور گل مینا ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے اگر گل مینا حسین تھی تو شہزاد بھی کم خوب صورت نہ تھا۔ اونچا لمبا بھرے بھرے بازوؤں اور ہلکی ہلکی داڑھی مونچھ والا شہزاد جب شہر سے نیلی جینز اور کالی قمیص پہن کر آتا تو کتنی دیر گل مینا اسے دیکھتی رہتی تھی۔ اس ایک دن کا انتظار گل مینا پورے چودہ دن کرتی، شہزاد بھی گاؤں آتے ہی اس سے ملنے آجاتا پھر دونوں دیر تک گھر کے صحن میں یا کبھی کمرے میں بیٹھے ڈھیروں باتیں کرتے۔ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ ان کی اس مثالی محبت سے گھر والے ناواقف نہ تھے۔ جس دن شہزاد نے آنا ہوتا اس دن صبح سے ہی گل مینا بے کل سی ادھر سے ادھر گھومتی رہتی۔ خاص طور پر اندر سے اچھا جوڑا نکال کر نہا کر پہنتی، ہاتھوں میں رنگ برنگی چوڑیاں اور بالوں میں پراندہ سجالیتی یہ وہ تحائف ہوتے جو شہزاد شہر سے آتے ہوئے لانا نہ بھولتا۔ شام ہوتے ہی شہزاد آجاتا اور دونوں کو لگتا کہ برسوں بعد ملے ہوں۔ حمید اور بختاں ان کو دیکھ دیکھ کر مسکراتے رہتے تھے۔

"بڑا پیار ہے دونوں میں، رب ان کی حفاظت کرے، ان کی سوہنی جوڑی کو کسی کی نظر نہ لگے۔ یونہی ساتھ ساتھ رہیں ہمیشہ۔" بختاں کی آنکھیں بیٹی کی جدائی کے تصور سے بھیگ جاتی تھیں۔

"ارے جھلی۔ تو، تو شکر ادا کیا کر کہ تجھے اتنا اچھا پیار کرنے والا اور گھر وجمائی مل رہا ہے، رویا نہ کر بس دعا مانگا کر سوہنے رب سے ان کی خوشیوں کے لیے کہ ہمیشہ خوش آباد رہیں ہمارے بچے۔" حمید خود بھی آزردہ ہو جاتا مگر بختاں کو سمجھانے لگتا تھا۔

شام ہونے کو تھی آج شہزاد نے آنا تھا مگر ابھی تک نہیں آیا تھا، گل مینا بہت بے چین تھی اس بار اس نے رنگین چیزیں لانے کا وعدہ کیا تھا اماں چولہے کے پاس بیٹھی ساگ صاف کر رہی تھی، گل مینا دروازے پر گئی تب ہی اسے شہزاد آتا دکھائی دیا۔ گل مینا سلام کرنے کی بجائے منہ پھیر کر کھڑی ہوگئی اس کے چہرے پر ناراضگی تھی۔

"سلام سوہنیے۔" شہزاد نے مسکرا کر سلام کیا مگر جواب ندارد۔ "کیا ہوگیا ہے تجھے؟" شہزاد نے پوچھا تھا۔

"اتنی دیر..... اتنی دیر لگادی تو نے آنے میں، پتا بھی ہے پورے چودہ دن میں اس ایک دن اور دو گھنٹے کا انتظار کرتے گزارتی ہوں۔" شکوہ لبوں پر مچلا تھا۔

"ارے پگلی۔ بس میں کبھی دیر سویر ہو جاتی ہے۔ قسم سے بس اماں کے ہاتھ کی چائے پی اور سیدھا تیرے پاس چلا آیا۔" شہزاد اس کے سامنے آکر جذب سے بولا تھا۔

"جا میں نہیں بولتی۔" وہ منہ پھیر کر اترائی تھی۔

"ایسے تو نا کر جند جانی تو ایسے منہ پھیرے گی تو میں تو مر جاؤں گا قسمے۔" وہ عین سامنے آکر گل مینا کے گورے گورے ہاتھ تھام کر محبت سے بولا تھا۔

"اوئے..... اب یہ بکواس تو نا کر۔ ایمان سے آئندہ ایسا بولا تو قسم سے بالکل نہیں بولوں گی۔" وہ تڑپ کر بولی اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

"اچھا اچھا، دیکھ ہاتھ جوڑ کر کان پکڑ کر معافی مانگتا ہوں۔ اپنے دیوانے کو معافی دے دے۔" وہ عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر کہتا تو گل مینا مسکرا کر اس کے موٹے موٹے مضبوط ہاتھ تھام لیتی۔

"ارے پگلی تو خوامخواہ ناراض ہوتی ہے۔ تجھے میرا انتظار رہتا ہے تو کیا میں اس ایک دن کے لیے چودہ دن تک ایک ایک پل گن گن کر نہیں گزارتا۔ جتنا تو یاد کرتی ہے مجھے اس سے زیادہ تو میں تجھے یاد کرتا ہوں۔ تجھے کیا پتا کہ آج بھی اماں سے یہی کہہ رہا تھا کہ اب دوری برداشت نہیں ہوتی، اماں جلدی سے مینا کو گھر لے آ پھر ہم لوگ شہر چلے جائیں گے مگر اماں کہتی ہے کہ تو میرا اک ای ایک پتر ہے میں خوب دھوم سے شادی کروں گی۔ اس لیے پیسے جوڑ رہی ہوں۔ سچی مینا تو بہت بھاگ والی ہے کہ تجھے اماں جیسی ساس ملنے والی ہے وہ تو تجھ پر صدقے قربان ہوتی رہتی ہے اور ستارہ۔ ستارہ کا بس چلے تو ابھی تجھے اٹھا کر لے جائے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھے۔" شہزاد کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔

"سچی.....؟" اس نے بڑی بڑی آنکھیں پھیلائیں۔ "اور..... اور تو کیا کہتا ہے؟" گل مینا نے ایک ادا سے لمبی چوٹی کو پیچھے ڈالتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

"میں..... میرا کیا پوچھتی ہے ظالما۔ میرا تو، تو نے سکھ چین، نیند سب حرام کر کے رکھ دیا ہے۔ میں تو ابھی اٹھا کر لے جاؤں تجھے سب کی نظروں سے دور۔ جہاں بس تو اور میں ہوں کوئی تیسرا نا ہو۔" کاندھے سے تھام کر گل مینا کا چہرہ اوپر اٹھا کر لہجے میں وارفتگی سموئے وہ گل مینا کے قریب۔ بہت قریب کھڑا تھا۔ گل مینا کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ جوان اور خوبرو سنگت میں وہ بہکنے لگی آنکھیں بند کیے اس کے الفاظ کے حصار میں گم تھی۔ شہزاد نے اسے سینے سے لگایا تو وہ چونکی تھی۔

"پتا ہے ابا اور اماں کیا کہہ رہے تھے؟" سانسوں کو بحال کر کے وہ چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔

"کیا.....؟" وہ بھی پاس آ گیا۔

"ابا کہہ رہا تھا کہ اس بڑی عید کے بعد ہمارے ویاہ کے لیے خالہ سے بات کرے گا۔" اس نے شرماتے ہوئے ابا اور اماں کی درمیان ہونے والی گفتگو کا کچھ حصہ اسے بتایا تھا۔

"ہائے سچی..... مطلب مجھے اماں کو بھی بتا دینا چاہیے کہ تیاریاں تیز کر دے۔" شہزاد نے خوش ہو کر کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر مسکرا دی تھی۔ خوب صورت جان دار زندگی سے بھرپور مسکراہٹ جس میں خوشی، بے فکری، چاہت اور آنے والے خوب صورت دنوں کی جھلک شہزاد محسوس کر سکتا تھا۔

"اچھا اچھا..... اب جلدی سے پیسے نکال؟" اچانک ہی گل مینا نے اپنی نازک سرخ ہتھیلی شہزاد کے آگے کر دی تھی۔

"کیوں بھئی۔ شادی کا جوڑا تو نے خود خریدنا ہے کیا؟" شہزاد شرارت سے بولا تھا۔

"نا جی۔ وہ تو خالہ ہی لائے گی۔ مجھے تو کل میلے میں جانے کے لیے پیسے چاہئیں۔ جو میلہ لگا ہے ناں سب

گاؤں والے جارہے ہیں۔ سنا ہے بہت اچھا میلہ ہے۔ اماں نے مجھے بڑی مشکلوں سے اجازت دی ہے میں بھی کل اپنی سہیلیوں کے ساتھ جاؤں گی۔ وہاں سے رنگین چوڑیاں، پراندے، جھمکے خریدوں گی اور سہیلیوں کے ساتھ مل کر ہم چاٹ بھی کھائیں گی۔"

"اچھا واہ بھئی مطلب میرے بنا اکیلے اکیلے مزے کرو گی۔" شہزاد نے جیب سے کچھ نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے تھے۔

"تجھے فرصت کہاں ہے؟ تو صبح پھر لوٹ جائے گا۔" پیسے مٹھی میں دبا کر وہ مایوسی سے بولی۔

"اچھا اچھا اب منہ مت بنا کر بیٹھ جا۔ شادی کے بعد پورے پندرہ دن کی چھٹی لے کر صرف اور صرف تیرے ساتھ گھوموں گا۔ تو کیوں دل چھوٹا کرتی ہے جھلی، اب جلدی سے اچھی سی چائے بنا کر لا۔ ایسے باتوں میں لگا دیتی ہے کہ ماسی بختاں سے بھی سلام دعا نہ کر سکا چل میں اندر جاتا ہوں چائے وہیں پر لے آنا۔" شہزاد نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ دوپٹے کے پلو میں پیسے باندھ کر مسکراتی ہوئی صحن کے کونے میں مٹی سے بنے چولہے کی طرف چل دی اور شہزاد محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

"کتنی معصوم ہے یہ لڑکی۔" وہ دل میں سوچتے ہوئے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد حمید بھی آ گیا، شہزاد کچھ دیر بیٹھ کر واپس لوٹ گیا، اس بار اس نے زیادہ دن کے بعد آنا تھا اس نے جاتے وقت یہ بات گل مینا کو بتائی تھی کہ وہ پہلے سے ہی موڈ آف کر لیتی اور ناراض ہو کر ملاقات کا مزا کرکرا کر دیتی۔

"ہائے ربا، پندرہ دن سے زیادہ۔ مطلب کتنے دن لگائے گا؟" گل مینا نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"گل مینا مجھے اس بار کام بہت زیادہ ہے۔ میرے صاحب نے مشکل سے چھٹی دی ہے اس بار بھی اور یہاں پر آیا تو شادی کا بھی سن لیا ہے تو۔ مجھے جلدی آنا مشکل ہوگا۔ ان شاء اللہ ایک ماہ میں آ جاؤں گا تو فکر نہ کرنا بلکہ خوشی خوشی شادی کی تیاریاں کرنا دیکھ لینا یہ دن یونہی گزر جائیں گے۔"

"شہزاد مجھے ڈر لگتا ہے۔ اتنے دن گزارنا مشکل ہوگا میرے لیے اور تیرے سے تو کوئی رابطہ بھی نہیں ہو سکتا کتنی بار کہا ہے کہ کوئی فون نمبر دے دے مگر تو سمجھتا ہی نہیں۔"

"ارے پگلی۔ ڈر کس بات کا؟ میں کوئی بچہ ہوں کہ شہر جا کر گم ہو جاؤں گا اور اس بار آؤں گا تو۔ کوئی چھوٹا موٹا سا موبائل لیتا آؤں گا۔ بس پیسوں کی تنگی ہے ذرا۔" نا جانے کیوں اس بار گل مینا بہت ہی زیادہ اداس تھی۔ شہزاد کے جاتے وقت اس کی آنکھوں میں بے تحاشا آنسو امڈ آئے تھے، جیسے کہ شہزاد سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ رہی ہو۔ دل کہتا تھا کہ جی بھر کر شہزاد کو دیکھ لے شاید کہ یہ آخری ملاقات ہو وہ اس کے آگے سوچ کر سہم جاتی تھی۔

"ارے پگلی، یوں کیا دیکھنے لگی؟ نظر لگائے گی کیا اپنے دیوانے کو؟" شہزاد نے اس کو محویت سے دیکھتا پا کر اس کا سر ہلا کر شرارت سے کہا تو وہ جھینپ کر پھیکی ہنسی ہنس دی۔ ڈھیر سارے وعدے کر کے وہ لوٹ گیا اور گل مینا اداس ہو گئی تھی۔

دوسرے دن صبح ناشتے سے فارغ ہو کر گل مینا نے گھر کی صفائی کی، آج اس نے میلے پر بھی جانا تھا، یہ میلہ ہر سال لگا کرتا، گاؤں میں کھیتوں سے ملحق بڑا سا میدان تھا جو ملکوں کی ملکیت تھا، وہاں پندرہ دن کے لیے یہ میلہ لگتا تو گاؤں کے پرسکون ماحول میں خوشگوار تبدیلی آ جاتی، گاؤں کی عورتیں، لڑکیاں اور بچے سارا سال اس میلے کا انتظار کرتے، طرح طرح کے جھولے، سرکس، کٹھ پتلی کا تماشہ، رنگ برنگی چیزوں کے اسٹال لگتے، کہیں رنگین چوڑیاں بجی ہوتیں تو کہیں چم چم کرتے سلور اور گولڈن بندے، جھمکے نظر آتے۔ چھولے اور چاٹ کے ٹھیلے اپنی بہاریں دکھا رہے ہوتے تو کہیں لیموں کے شربت والا آوازیں لگا کر اپنی جانب بلاتا۔ لکڑی کے ڈولی والے جھولوں پر بیٹھ کر لڑکیاں کھلکھلاتیں۔ رنگین کاغذوں سے بنے مختلف کھلونے، بچوں کی توجہ کا مرکز ہوتے تو مٹی سے بنے رنگ برنگے برتن اور جانور کے اسٹال پر بچے مچل جاتے۔

گاؤں میں اور تو کوئی تفریح نہیں تھی غریب اور محنت کش لوگ جو سارا سال ملکوں کے کھیتوں پر خون پسینہ بہا کر فصلیں کھڑی کرتے ان کی حفاظت اپنے بچوں کی طرح کرتے اور بدلے میں ملکوں سے تھوڑا سا اناج اور چند پیسے وصول کرتے، وہ لوگ اسی میں خوش اور مگن تھے۔ سالہا برس سے ان کے آباؤاجداد بھی ملکوں کے زیراثر رہے اور آج تک یہ سلسلہ جاری وساری تھا یہاں پر ملکوں کی حکمرانی اور ان کا راج تھا اور وہی ان غریبوں کے ناخدا بنے بیٹھے تھے۔ گل مینا جب تک چھوٹی تھی تو کبھی بختاں کے ساتھ تو کبھی حمید کے ساتھ اس میلے میں جاتی تھی مگر جب سے سیانی ہوئی تھی بختاں نے اسے پابندیوں میں جکڑ دیا تھا، اس کی چھوٹی سی چنری اب بڑی سی چادر میں بدل گئی تھی۔ چادر بھی ایسی کہ آدھا چہرہ بھی ڈھانپ لیتی۔ گل مینا جو گاؤں کی پگڈنڈیوں پر، کھیتوں میں سکھیوں کے ساتھ اچھلتی کودتی پھرتی تھی۔ ساون بھادوں میں جب مینہ خوب برستا تو وہ سہیلیوں کے ساتھ نیم کے درخت پر لگے جھولے پر سارا دن جھولا جھولتی رہتی اور جب بارش کی مسلسل بوچھاڑ سے اس کا دودھ جیسا سفید رنگ مزید سفید ہو جاتا۔ ٹھنڈی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے اس کے نازک سے بدن پر کپکپی طاری کر دیتے تب وہ بھاگ کر گھر آ جاتی۔ جہاں اماں گرم گرم قہوہ اور دیسی ابلا ہوا انڈا لیے اس کی منتظر ہوتی مگر پھر کتنے ساون آ کر چلے گئے۔ اسے اماں صحن میں جانے تک کی اجازت نہیں دیتی تھی کتنے میلے آئے اور ختم ہو گئے وہ ہر بار اماں سے میلے میں جانے کی ضد کرتی اور اماں ٹال جاتی۔ وہ منہ بسور کر رہ جاتی مگر اتنے سالوں بعد آج اس کو اجازت ملی وہ بہت خوش تھی۔ وہ نادان بھلا کب جانتی تھی کہ اماں تو ماں ہوتی ہے اللہ پاک نے ماں کو ایسی مٹی سے بنایا ہوتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کی زندگی میں آنے والے طوفان کو پہلے سے محسوس کر لیتی ہے اور حتی الامکان یہی کوشش کرتی ہے کہ اس کی اولاد کسی قسم مشکلات کا شکار نہ ہو، اس کی زندگی میں کوئی دکھ، کوئی رنج و پریشانی نہ آئے۔ ماؤں کے دل میں الٹے سیدھے واہمے، خدشات ہوتے ہیں شاید بختاں بھی ایسی کیفیت کا شکار تھی۔ اس کی چھٹی حس یا اس کی ممتا کسی بڑے طوفان کے آنے کا پتا دے رہی تھی لیکن ہونی کو کون روک سکا ہے۔ ہم انسان صرف مفروضے قائم کرتے ہیں، خدشات پال لیتے ہیں، اچھی بری سوچ رکھ سکتے ہیں۔ اس سے آگے تو وہی ہوتا ہے جو رب چاہتا ہے۔ طوفانوں کے آگے جتنے بند بھی باندھ لو۔ لاکھ احتیاط کر لو مگر جس طوفان کو آنا ہوتا ہے وہ سارے بند توڑ کر، تمام حفاظتی انتظامات کی دیواریں پھلانگ کر آ کر ہی دم لیتا ہے۔ نادان گل مینا بھی اس طوفان سے قطعی ناآشنا تھی جو اس کی معصوم اور بے فکر زندگی میں آنے کو پر تول رہا تھا۔

سکینہ، شادو، رضیہ اور فاطمہ کے ہمراہ وہ گھر سے نکلی خود کو اچھی طرح سے چادر میں لپیٹ کر چہرے کو بھی کور کر لیا، ابا نے بھی اسے پیسے دیئے تھے وہ بہت خوش تھی اماں کی ہدایات کے ساتھ وہ گھر سے نکلی، کچا راستہ عبور کرتے ہوئے سکھی سہیلیوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرنا بھلا لگ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنی اور شہزاد کی شادی کے بارے میں باتیں کر رہی تھی۔

"ہائے گل، تو کتنی بھاگوں والی ہے کہ گاؤں کا سب سے گبھرو جوان تجھے اتنا پیار کرتا ہے اور اب تیری شادی بھی ہونے والی ہے۔" فاطمہ نے حسرت سے کہا تھا۔

"ارے تو ہماری گل بھی تو اتنی حسین ہے۔ اس کے لیے تو ایسا ہی شہزادہ آنا تھا۔" سکینہ نے گل مینا کو رشک سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"اور پتا ہے تم لوگوں کو شہزاد کیا کہہ رہا تھا؟" گل مینا نے اتراتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا...... کیا؟" چاروں نے پوچھا تھا۔

"شہزاد کہہ رہا تھا اس بار وہ الگ گھر کا بندوبست کر کے آئے گا تاکہ شادی کے بعد ہم لوگ صغراں ماسی، ستارہ کے ساتھ شہر میں رہ سکیں۔" اس کے لہجے میں متانت تھی۔

"ہائے سچی کتنا مزا آئے گا تجھے گل۔ سچی مجھے بہت

شوق ہے شہر میں رہنے کا۔ اونچی اونچی عمارتیں۔ صاف صاف سڑکیں۔ لمبی چمچماتی موٹر کاریں۔ اچھے اچھے کپڑے پہنے لوگ مگر میرا بالا تو یہیں ہے۔ نہ ہی شہر جانا چاہتا ہے تو بہت نصیبوں والی ہے گل۔'' سکینہ نے حسرت سے گل مینا کے کھلے کھلے چہرے کو دیکھا تھا۔

''اچھا...... اچھا بس نظر نہ لگا دینا ہماری بنو کو۔'' رضیہ نے بمشکل لگایا۔

''دعا کرو رب ہماری بنو کو خوش رکھے۔ شہر میں لوگ بہت چالاک ہوتے ہیں میں نے تو یہ بھی سنا ہے۔'' رضیہ نے آنکھیں پھیلا کر کہا تھا۔

''ارے پگلی، اتنے دنوں سے شہزاد ہے وہاں، ایسا کچھ نہیں ہوتا۔'' گل مینا نے عقل جھاڑی تھی۔

''ہائے اللہ کتنا بڑا میلہ ہے یہ تو۔'' گل مینا نے احاطے میں داخل ہوکر چاروں طرف نگاہ دوڑائی جہاں خوب رونقیں لگی ہوئی تھیں۔

''ہائے اللہ سب سے پہلے تو میں ڈولی والے جھولے میں بیٹھوں گی۔ قسم سے پتا نہیں کتنے سالوں سے نہیں بیٹھی۔'' سامنے ہی لال، ہری اور پیلی ڈولیوں سے سجا لکڑی کا جھولا دیکھ کر گل مینا تیزی سے جھولے کی جانب بڑھی تو سب اس کے پیچھے چل دیں۔ ڈولی میں اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر جاتے ہوئے بڑا مزا آرہا تھا۔ نہ جانے کتنے سال بعد وہ یہ مزے لے رہی تھی۔ جھولا جھول کر اس نے ٹھیلے سے ابا کے لیے عطر، اماں کے لیے ریشمی رومال خریدا پھر ان لوگوں نے چاٹ کھائی بڑے مزے کی آلو کی چاٹ تھی ساتھ ہی لیموں کا شربت پیا۔ یوں گھومتے گھومتے وقت کا احساس نہ ہوا تب جاتے ہوئے وہ رنگین چوڑیوں کے اسٹال پر آ گئیں۔ ساتھ ہی پراندوں کا اسٹال بھی تھا پہلے اس نے سنہری اور لال دھاگوں والا پراندہ خریدا، شہزاد ہمیشہ کہتا تھا۔

''گل تجھ پر لال رنگ بڑا سجتا ہے جب تو لال رنگ کے کپڑے پہنتی ہے ناں تو لگتا ہے ننھی سی بیر بہوٹی ہے نرم نازک اور ملائم سی دل کرتا ہے تجھے اٹھا کر سینے سے لگا لوں۔'' شہزاد کی بے باکی پر وہ شرم سے سرخ ہو جاتی اس بار شہزاد لال چنری لے کر آیا تھا سنہرے پھندنوں سے سجی لال چنری کے جیسا لال اور سنہری پراندہ لے کر وہ چوڑیوں کی جانب پلٹی تھی۔

''ہائے اللہ دیکھ تو رضیہ کتنی پیاری چوڑیاں ہیں نازک نازک اور چمکتی ہوئی۔'' اس نے رنگ برنگی چوڑیاں ہاتھوں میں اٹھا کر دیکھی تھیں۔

''یہ لے لے۔ یہ دھانی تیرے ہاتھوں میں خوب سجیں گی۔'' فاطمہ نے آگے بڑھ کر دھانی چوڑیاں اٹھائی تھیں۔

''نہیں ری...... میں تو سرخ اور سنہری چوڑیاں پہنوں گی۔ میرے شہزاد کو پسند ہیں۔'' وہ اٹھلا کر پلٹی اور فاطمہ سے مخاطب ہوئی تیزی سے پلٹنے سے چادر چہرے سے تھوڑا سا سرک کر نیچا آ گئی اور ہوا کے جھونکے سے بالوں کی شریر لٹ اس کے ماتھے پر آ گئی تھی۔ اس نے جلدی سے چادر کو کھینچ کر دوبارہ سے منہ چھپایا اور بالوں کو چادر کے اندر سمیٹا لیکن یہی چند لمحوں کی بھول نے ان دو آنکھوں کو مزید پھیلا دیا جو کافی دیر سے اس کے تعاقب میں تھیں، ایک لمحے کی خطا عمر بھر کی سزا بننے کو تھی۔ اس ایک لمحے میں جیسے کسی کا دل اچھل کر حلق میں آیا تھا۔ اتنا مکمل حسن، اتنی دلکشی، اتنی رعنائی، نزاکت اور شراب سی مستی لیے کٹورہ آنکھیں، نازک مخروطی انگلی میں سجا چاندی کا چھلا، گوری گوری نازک کلائیوں میں بجی لال اور سنہری چوڑیاں، جھیل سی گہری آنکھوں پر بالوں کی شریر لٹ اور لٹ کے پیچھے سے مسکراتے یاقوتی لب۔ وہ لڑکی تھی کہ قدرت کا شاہکار۔

''اف کیا چیز ہے؟'' بے ساختہ ملک ایاز کے لبوں سے نکلا تھا۔

''کیا ہوا یار!؟'' پاس بیٹھا ملک واحد چونک کر اس کی طرف دیکھ کر بولا تھا۔

''یار کیا مکمل حسن ہے۔ کیا بھرپور شاہکار ہے۔'' ملک ایاز جیسے خواب کی سی کیفیت میں بولا تھا۔

”کون ہے ملک صاب؟“ واحد نے ملک ایاز کی نظروں کے تعاقب میں نظر دوڑائی۔ وہ چاروں چوڑی والے کو پیسے دے کر پلٹ رہی تھیں، چہرے تو ڈھکے ہوئے تھے۔

”ملک جی خیر تو ہے۔ کیا ہوگیا ہے کہیں کوئی خواب تو نہیں دیکھ لیا؟“ واحد نے اس کے آگے ہاتھ نچایا۔ ادھر تو ساری نقابوں والیاں ہیں...... یار تو نے کیا دیکھ لیا ایسا۔“

”ابھی ابھی اس نقاب کے پیچھے سے چاند نکلا تھا یار۔ مکمل چاند۔ جسے چودھویں کا چاند۔ چمکتا اور حسین چاند۔ یار یہ کالی چادر والی کون ہے؟ پہلے تو گاؤں میں دکھائی نہیں دی۔ کون ہے، کہیں سے آئی ہیں؟“ ملک ایاز نے گل مینا کی جانب اشارہ کیا تھا۔

”وہ لال شلوار والی یار۔“ اس بار ملک ایاز جھلا کر بولا تھا۔

”اوئے ملک جی پریشان نہ ہوں۔ پتا کر کے بتا دوں گا کل۔“ ملک واحد نے تسلی دی اور سگریٹ کا آخری کش لگا کر ٹوٹا باہر کی طرف پھینک دیا تھا۔

”کل نہیں واحد آج...... آج ہی مجھے اس کا نام اور پتا چاہیے۔ آج ہی تو پتا کر کے مجھے بتا۔“ ملک ایاز کی بے تابی دیکھ کر واحد نے غور سے اسے دیکھا تھا۔

”لگتا ہے حسینہ کا جادو سر چڑھ گیا ہے سرکار کے، ویسے تو منہ چھپائے تھی مگر اس نے ایک لمحے میں ہمارے یار کو پاگل کر دیا ہے۔ پتا نہیں کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے اور ملک جی بے فضول پاگل ہوئے جا رہے ہو تسی۔“ واحد نے کہا تھا۔

”اوئے چپ کر۔ بکواس نہ کر وہ جو ہے جہاں سے بھی آئی ہے ہر قیمت پر میں اسے اپنانا چاہتا ہوں نجانے اس نے مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے یار۔“ ملک ایاز بے بسی سے بولا تھا۔

”اچھا اچھا فکر نہ کرو ملک۔ میں اس کا پتا کر کے بتاتا ہوں۔ اپنے گاؤں کی ہے تو فیر کوئی مسئلہ ای نہیں ہے جی۔“

”اپنے گاؤں کی ہو یا کہیں کی بھی ہو مجھے ہر حال میں چاہیے۔“ ملک ایاز جھنجلا کر سیٹ پر ہاتھ مار کر بولا تھا۔

”اچھا...... اچھا، ملک جی تسلی رکھو۔“ واحد گھبرا گیا وہ اپنے دوست کی ضدی فطرت سے اچھی طرح واقف تھا۔ جس چیز کی طرف دیکھ لیتا اسے حاصل کر کے ہی رہتا چاہے اس کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے۔ بچپن سے ہی وہ ایسا تھا ہر چیز اپنی مرضی اور پسند سے لیتا۔ جس چیز پر انگلی رکھ دیتا وہ ہر صورت اس کی دسترس میں ہوتی، وہ کوئی معمولی شخص تو تھا نہیں۔ ملک اعجاز کا بیٹا تھا اور ملک اعجاز سارے گاؤں کا مالک و سردار تھا، سب اس کے آگے ماتھا ٹیکتے تھے، ملک ایاز پڑھائی کے لیے شہر گیا ہوا تھا۔ وہاں کی رنگینیوں میں مست، مگن اور خوب عیاشیاں کر کے دو دن پہلے ہی گاؤں واپس آیا تھا۔ شہر میں بھی وہ اپنے روپے پیسے اور امارت کی وجہ سے بادشاہ بنا رہتا تھا، خوبصورتی اس کی کمزوری تھی یہی وجہ تھی کہ شہر میں بھی اس کے آگے پیچھے خوب صورت لڑکیوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ وہ پڑھائی کم اور عیاشیاں زیادہ کرتا تھا۔ ملک اعجاز نے بھی بیٹے کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی، بچپن سے ہی اس کی تربیت ان اصولوں پر کی گئی تھی کہ وہ مالک ہیں، ان غریبوں اور کمی کمینوں کی ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں، وہ محض کیڑے مکوڑے ہیں جن کو سر اٹھا کر جینے کا کوئی حق نہیں، اگر وہ سانس بھی لیتے ہیں تو ہماری اجازت سے لیتے ہیں، ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والے یہ لوگ ہمارے غلام ہیں اور یہی تربیت بھرپور انداز میں اس کے وجود میں رچ گئی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ملک ایاز مزید، مغرور، ضدی، ہٹ دھرم اور عیاش ہو گیا تھا۔ گاؤں میں میلہ لگا ہوا تھا اسے علم تھا کہ میلے میں گاؤں کی لڑکیاں ضرور آتی ہیں تب ہی وہ سہ پہر کو اپنے کزن اور دوست ملک واحد کے ساتھ جیپ میں سوار ہو کر میلے کی طرف آ گیا تھا۔ چار سال پہلے جب وہ یہاں سے گیا تھا تب گاؤں کی وہ تمام لڑکیاں جو آج دوشیزاؤں کا روپ ڈھال چکی تھیں، گیارہ اور بارہ برس کی تھیں۔ تب کی بچیوں اور آج کی دوشیزاؤں میں کافی فرق آ چکا تھا۔ ویسے تو چھوٹا سا

گاؤں تھا مگر اسے کون سا یاد تھا کہ گاؤں کے کس گھر میں کتنی بیٹیاں ہیں اور کون کس کی بیٹی ہے اور گل مینا تو ویسے بھی گھر سے کم ہی نکلتی تھی اور لوگ بھی اس کو مدتوں سے نہ دیکھ پائے تھے، اس لیے ملک واحد کو بھی علم نہ تھا کہ یہ حمید اور بختاں کی بیٹی گل مینا ہے۔

"دیکھ اوئے، میرا یہ کام تو نے ابھی کرنا ہے۔" ملک واحد کو جیپ سے اترتے ہوئے دوبارہ یاد دلایا تھا۔

"ہاں ہاں ملک جی فکر نہ کرو میں اسی کام کے لیے جا رہا ہوں۔" ملک واحد نے پر یقین لہجے میں کہا تھا۔ ملک ایاز سر ہلا کر تھکے تھکے قدموں سے حویلی کے اندر داخل ہوگیا تھا۔

"سلام ماں جی۔" سامنے ہی رنگین جھالروں والی نقشین چارپائی پر بیٹھی ملکانی کو دیکھ کر سلام کیا تھا۔

"آ گیا میرا پتر۔ کیسا لگا یہاں کا میلہ تجھے؟ شہر کی عادت ہوگئی ہے ناں پتر تجھے۔" ملکانی نے محبت سے کہا تو وہ خاموش سا ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"ہائے ربا، میرا پتر۔ کیسا کمزور ہو گیا ہے پڑھ پڑھ کر شہر میں تو خالص کھانا بھی نہیں ملتا۔ جا جا کر میرے پتر کے واسطے لسی بنا کر لا مکھن ڈال کر۔" ملکانی نے پیر دباتی ملازمہ کو پیر سے ہی دھکا دے کر حکم دیا تھا۔

"اچھا ملکانی جی ابھی لائی۔" ملازمہ سر پر دوپٹا جماتی جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ملک ایاز ماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا تھا۔

"کیا ہوا ماں صدقے۔ کچھ پریشان ہے کیا میرا پتر؟ ایسا اترا ہوا منہ لگ رہا ہے تیرا۔" ملکانی نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا تھا۔

"نہیں جی بس ایویں ہی، تھکن ہوگئی ہے۔" وہ نظریں چرا کر بولا تھا۔

"اے ہے...... ایویں کی ایویں؟ اچھا بھلا گیا تھا واپسی میں منہ لٹک گیا ہے میرے پتر کا، کہیں کسی جھپیٹے میں تو نہیں آ گیا۔ ہائے ربا۔" ملکانی نے ہول کر سینے پر ہاتھ مارا تھا۔

"اماں تو بھی پاگل ہوگئی ہے۔ خوامخواہ فضول کی باتیں سوچتی ہے کہہ جو دیا کچھ نہیں ہے۔" وہ جو پہلے ہی اجنبی حسینہ کی آنکھوں کے جنگل میں بھٹک رہا تھا اب ماں کی مسلسل تکرار پر بدتمیزی سے بولا۔ تب ہی ملازمہ لسی کا گلاس لے آئی تھی۔ ملک ایاز نے ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر کے ملازمہ کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔

"ماں تو ہوتی ہی پاگل ہے پتر۔ اولاد کی شکل دیکھ کر سمجھ جاتی ہے۔" ملکانی نے کہا تھا۔

"چاچی تیرا پتر کسی حسینہ کی محبت میں گرفتار ہوگیا ہے یہ کوئی جن بھوت کا یا جھپیٹے کا اثر نہیں بلکہ کسی حسینہ کی آنکھوں کا نشہ ہے جو اس کے دماغ پر چڑھ گیا ہے۔" اسی لمحے ملک واحد کمرے میں داخل ہوا تھا۔

"ہائے او میرے ربا۔ کہاں دل لگا لیا میرے پتر نے، میرے شیر نے؟" ملکانی نے سینے پر ہاتھ مارا تھا۔

"ہمارے یہاں کے مرد کسی زنانی کے پیچھے یوں گم صم نہیں ہو جاتے۔ جس کو چاہتے ہیں اسے حاصل کر لیتے ہیں، تو کیوں منہ لٹکا کر بیٹھا ہے۔" ملکانی نے پہلے تو ہول کر اور پھر رعونت سے کہا تھا۔

"ارے بھئی کیا ہوگیا ہے، کیا باتیں ہو رہی ہیں ماں بیٹے میں، کون منہ لٹکا کر بیٹھا ہے یہاں؟" ملک اعجاز کمرے میں داخل ہو کر بولا اور سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنی گھنی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا پہلے ملکانی اور پھر ملک ایاز کی طرف دیکھا تھا۔

"پتا نہیں کون ہے؟ اپنے گاؤں کی تھی بھی یا نہیں مگر جو بھی ہے دیکھنے کی چیز ہے بابا۔ تم دیکھتے تو تم بھی پاگل ہو جاتے۔" ملک ایاز کی بات پر ملکانی نے اسے گھور کر دیکھا جبکہ ملک اعجاز کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

"اوئے کون ہے، کہاں سے آئی ہے، یہ پتا کرنا تیرا کام ہے۔ تو بنا پتا لگائے گھر میں آیا کیسے؟ یہ مردوں والی بات تو نہیں کی تو نے تو ملک اعجاز کا پتر ہے...... ملک اعجاز کا۔" ملک اعجاز نے اپنے سینے کو ٹھونکتے ہوئے تکبرانہ لہجے میں کہا تھا۔

"اوئے چاچا، تو کیا سمجھتا ہے مجھے اپنے یار کی پروا نہیں، میں سب کچھ پتا کر کے آیا ہوں جی۔" ملک واحد نے ملک ایاز کے برابر بیٹھ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ مار کر آنکھ دبا کر شرارت سے کہا تھا۔

"ارے تو پھر بتا ناں، اتنی دیر سے چپ کیوں ہے تو، تو رے لے رہا ہے یہاں کھڑے ہو کر۔" ملک ایاز نے بے تابی سے کہتے ہوئے ملک واحد کے کاندھے پر ہاتھ مارا تھا۔

"وہ حمیدے کی دھی ہے۔"

"حمیدے اور بختاں کی......؟" ملک ایاز نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

"ہاں جی۔" واحد نے کہا۔ "وہ کل تک تو اتی سی تھی یار۔ اچانک سے ایسا رنگ روپ نکال لیا اس نے۔" وہ پھر سے اس کے حسن میں کھو گیا تھا۔

"اوئے فرتے کوئی گل ای نہیں ہے، اسے بھی لے آئیں گے تیرے لیے پتر لیکن یاد رکھنا کہ اصل بہو تو تیرے چاچے کی بیٹی ہی بنے گی وہ ہمارے ملازم ہیں ان کو صرف چند دن استعمال کرنا فر بھلے طلاق دے کر چلتا کر دینا۔" ملک اعجاز کے لہجے میں اطمینان اور رعونت تھی جیسے کہ سارا گاؤں ان کی جاگیر ہو اور وہ جس کو جیسے چاہے استعمال کر سکتے ہوں۔

"وہ کمی کمین اس گھر کی بہو بنے گی۔" ملکائن کو شاید یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔

"اوئے جھلی نہ ہو تو۔ کون سا ساری زندگی اس کو رکھنا ہے ہمیں۔ ہمارے بیٹے کی خوشی ہے۔ تو تھوڑے دن اس کو خوش کر دیں گے۔" ملک اعجاز نے مونچھوں کو سہلاتے ہوئے ملکانی کو دیکھ کر آنکھ دبا کر تسلی دی تو ملکانی سر ہلا کر چپ ہو گئی تھیں۔

"اوئے واحد تو کل جا کر حمیدے کو بول دینا کہ میرے پاس آئے میں نے کوئی بات کرنی ہے۔" ملک اعجاز نے پلٹ کر واحد کو مخاطب کیا تھا۔

"اچھا چاچا۔" ملک واحد بولا تھا۔

"اس کے تو بھاگ ہی کھل جائیں گے ملک صاحب۔" ملکانی کے لہجے میں غرور تھا۔

"ہنہ......" ملک اعجاز نے سر ہلا دیا تھا۔

آج صبح سے موسم بہت پیارا ہو رہا تھا ہلکی ہلکی بوندا باندی اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں نے اس خوب صورت سے گاؤں کی دلکشی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ گل بینا نے لمبی سانس لے کر کچے آنگن سے اٹھتی بارش کے پانی کے قطروں کی سوندھی خوشبو اندر اتاری۔ حمید صبح صبح کام پر چلا گیا تھا۔ اچانک گل بینا کو احساس ہوا کہ بکری کے بچے تو صحن میں بندھے ہیں اور ان کا چارہ بھی کھلے آسمان تلے پڑا ہے۔ دوپٹا سر پر ڈال کر وہ جلدی سے اٹھی دوپہر میں حمید کھانا کھانے آتا، کھانا کھا کر پھر واپس کام پر چلا جاتا تو وہ دونوں ماں بیٹی کچھ دیر کے لیے لیٹ جاتیں، صبح نمازوں کے وقت سے جاگی ہوئی ہوتی تھیں۔ بکری کے بچوں کو گود میں اٹھا کر صحن میں بنے بانس کے چھپر کے نیچے باندھ دیا۔ ساتھ ہی چارہ بھی اٹھا کر چھپر کے نیچے لا کر رکھ دیا۔ بختاں بھی اٹھ گئی تھی، بارش تو بہت ہلکی ہلکی تھی مگر موسم بہت اچھا ہو گیا تھا۔

"اماں تھوڑی دیر کے لیے سکینہ کے گھر چلی جاؤں اس کے ہاتھ کے پکوڑے کھانے کا دل کر رہا ہے۔" اس نے ماں سے اجازت چاہی تھی۔

"پاگل ہو گئی ہے؟ بادل سر پر کھڑے ہیں کہیں زیادہ برسنے لگے تو بیمار پڑ جائے گی۔ چل جا کر دودھ ابال لے پھر چائے کا پانی بھی رکھ دینا۔" بختاں نے سختی سے منع کر دیا تو وہ منہ بنا کر صحن کے کونے میں بنے چٹائی کی چھت والے چھوٹے سے باورچی خانے کی طرف آ گئی۔ لکڑیاں چولہے میں لگا کر آگ سلگانے لگی۔ دودھ ابال کر چائے کا پانی رکھا ہی تھا کہ حمید بھی آ گیا تھا۔

"لا دھیے جلدی سے چاء لا دے۔ مجھے ملک صاحب نے ڈیرے پر بلوایا ہے۔ وہاں بھی جانا ہے ابھی مجھے۔" حمید نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کاندھے پر پڑے رومال

سے اپنے چہرے کو صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔

”ہائے ربا...... ملک نے تجھے کیوں بلوالیا مینا کے بابا؟ کہیں تو نے کوئی غلطی تو نہیں کردی۔ ملکوں کے بارے میں کسی کے سامنے کوئی بات تو نہیں کہہ دی؟“ بختاں نے پریشان ہوکر کہا تھا۔

”ارے جھلی ہوئی ہے کیا؟ بھلا ہم ملکوں کو کچھ بول سکتے ہیں کیا؟ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ فکر نہ کر تو۔ ملک اعجاز نے فصل کے بارے میں کوئی گل کرنی ہوگی۔“ حمید نے سر جھٹک کر کہا تھا۔

”کیا ہوا بابا ملک نے کیوں بلوایا ہے؟ مجھے تو بڑا خوف آتا ہے بڑے ملک جی سے، کیسا رعب والا چہرہ ہے ان کا، بڑی بڑی سیاہ مونچھوں سے بڑا ہی ڈر لگتا ہے مجھے۔ ہنستے بھی نہیں وہ تو کبھی۔“ گل مینا بھی چائے لے کر آئی اور کٹورہ باپ کی جانب بڑھاتے ہوئے قدرے پریشان لہجے میں کہا تھا۔

”ارے دھیے، ہم سے بھلا کیا شکایت ہوگی ان وڈے لوگوں کو۔ ہم تو کل بھی ان کے نوکر تھے۔ آج بھی وہ ہمارے مالک ہیں۔ ان کے سامنے بھلا کون کوئی گل بات کرسکتا ہے۔ ہم نے ان کے حکم پر سر جھکانا ہے، بس جو بولیں گے سر جھکا کر مان لینا ہے۔ بھلا ہم سے کیا شکایت ہوگی ان لوگوں کو۔ ہم نے تو ان کا نمک کھایا ہے۔ نمک حلال کرنا ہمارے خون میں شامل ہے۔ تم لوگ فکر نہ کرو۔“ چائے کا کٹورہ گل مینا کے ہاتھ سے لے کر حمید نے ٹھہرے لہجے میں لمبی چوڑی بات کی، جلدی جلدی چائے کے گھونٹ لیے اور اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”اچھا بختاں ایک بات تو میں بھول ہی گیا، جمال دین آیا تھا کھیتوں پر وہ صغراں کے گھر گیا تھا کہہ رہا تھا صغراں ایک دو دن میں آکر گل کے ویاہ کی تاریخ لے لے گی۔ یہ لے کچھ پیسے ہیں۔ اس سے گل مینا کے لیے اچھا سا جوڑا لے کر آ جا تاریخ میں پہنانے کو۔“ جاتے ہوئے حمید پلٹا اور کچھ پیسے بختاں کی جانب بڑھا کر اطلاع دے کر پلٹ گیا۔ گل مینا کچھ لمحے پہلے کی پریشانی بھول کر شہزاد کے سپنوں میں کھو گئی تھی۔ حمید ڈیرے پر چلا گیا تھا۔

بختاں خاصی پریشان تھی۔ وہ جانتی تھی ملکوں کے پاس رحم نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ کسی سے بھی کوئی کوتاہی ہوجاتی یا وہ ملکوں کو کچھ کہہ دیتا تو سمجھو اس کی شامت آ جاتی، ملک اعجاز اور اس کے حالی موالی اس کو دل بھر کر مارتے اور طرح طرح کی سزائیں دیتے تھے۔ یہ سوچ کر بختاں کو ہول اٹھنے لگے تھے۔

”اماں، رات کو کھانے کے لیے کیا پکانا ہے؟“ بختاں کو چپ بیٹھا دیکھ کر گل مینا بھی سمجھ گئی کہ وہ پریشان ہے۔ تب ہی اس کا دھیان بٹانے کو پوچھ لیا تھا۔

”آلو کی بھجیا پکا لے ساتھ لہسن کی چٹنی بھی پیس لینا۔ تیرے ابا نے کل بولا تھا۔“ بختاں نے کہا تو گل مینا چولہے پر آلو ابالنے کے لیے رکھنے چلی گئی تھی۔

❁......❁......❁

ملک اعجاز کی بیٹھک پر حسب معمول اس کے رشتے دار اور خوشامدی جمع تھے۔ حمید بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔

”آؤ آؤ حمیدے۔“ حمید کو ہچکچاتا دیکھ کر ملک اعجاز نے آواز لگائی تھی۔

”سلام بڑے ملک صاحب۔ آپ نے مجھے بلوایا ہے جی۔“

”وعلیکم السلام، ہاں بھئی ہم نے تجھے بلوایا ہے، تجھ سے کام تھا ہمیں۔“ ملک اعجاز نے کہا اور زمین کی جانب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ حمید زمین پر ٹک گیا تھا۔

”جی ملک جی...... حکم کریں۔“ وہ ہاتھ جوڑے انکساری سے بولا تھا۔

”ہاہاہا، حکم تو دینا ہمارا حق ہے حمیدے۔ ہماری بات ہی حکم ہوتی ہے۔“ ملک اعجاز کی بات پر آس پاس کے لوگوں نے بھی تائید میں قہقہہ لگایا تھا۔

”جی مالک جی...... حکم۔“ حمید شش و پنج میں تھا کچھ گھبراہٹ اور ڈر بھی تھا۔

”سنا ہے تیری دھی، جوان ہوگئی ہے۔ اس کا ویاہ شیاہ نہیں کرنا تو نے۔“ ملک اعجاز کی بات پر حمید چونکا تھا۔

"جی مالک جی کرنا ہے ویاہ۔ بات لگادی ہے بیوی کے بھانجے کے ساتھ۔ ویاہ بھی ہونے والا ہے جی۔ آپ کی مدد اور آپ کا کرم چاہیے سرکار۔" حمید عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر بولا تھا۔

"ہنہ......" ملک اعجاز کے چہرے کا رنگ یکلخت بدلا، اس نے گھنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔ ایک بھرپور نظر حمید کے ناتواں وجود پر ڈالی تھی۔

"مدد تو کرنا چاہتے ہیں ہم تیری......" لہجے میں غرور نمایاں تھا۔

"جی سرکار، آپ لوگ ہمارے سائیں ہو، ہمارے مالک ہو، آپ لوگوں کی مدد اور دعا چاہیے ہم کو۔" حمید ہاتھ جوڑے کہہ رہا تھا۔

"کب کر رہے ہو اپنی دھی کا ویاہ؟" ملک اعجاز نے پوچھا تھا۔

"گھر والی کہہ رہی تھی اس بڑی عید کے چاند پر اس کی رخصتی کردیں گے مولا کے کرم سے۔" حمید بولا تھا۔

"ہنہ......" ملک اعجاز نے پہلو بدل کر ہنکارا بھرا۔ "دیکھ حمیدے، ہم تیرے بھاگ کھولنا چاہتے ہیں۔ تیرا نام اونچا کرنا چاہتے ہیں۔ تیری عزت بڑھانا چاہتے ہیں۔" ملک نے کہا تھا۔

"جی مائی باپ، میں سمجھا نہیں، آپ کیا کہہ رہے ہو؟ ہم تو کمی کمین لوگ ہیں ملک جی، آپ کے غلام، آپ کے پیروں کی جوتی۔" وہ گڑگڑایا تھا۔

"بات یہ ہے کہ ہمارے ملک ایاز کو تیری دھی بھا گئی ہے اور چھوٹا ملک تیری دھی سے ویاہ کرنا چاہتا ہے۔" ملک واحد نے لقمہ دیا تھا۔

"ہائیں ملک جی...... یہ کیا، یہ کیا کہہ رہے ہو آپ؟" بے ساختہ حمید کھڑا ہوگیا تھا۔ اسے لگا جیسے کسی نے اس کے سر پر بم دے مارا ہو۔ "ملک جی، ہم، چھوٹے لوگ ہیں جی، بھلا آپ کے قابل کہاں۔ ہماری دھیاں تو کچے آنگن اور ٹوٹے پھوٹے گھروں میں رہنے کی عادی ہیں ان سے آپ کی حویلی میں کہاں رہا جائے گا۔ ہمیں ایسے امتحان میں نہ ڈالو ملک جی، ہم اس قابل نہیں ہیں، ہم عاجز لوگ ہیں جی، جھونپڑے میں رہنے والے، روکھی سوکھی کھانے والے، ہمارے بچے بھی ان کے عادی ہیں جی اور پھر میری دھی کی تو بات بھی پکی ہوگئی ہے ویاہ کی۔ میری گھر والی تیاریاں کر رہی ہے جی۔ وہ بچپن کی منگ ہے اپنے خالہ کے گھر جانا ہے جی اس نے۔" ملک اعجاز کی بات کا مطلب ملک واحد کی زبانی سن کر حمید کے پیروں تلے زمین نکل گئی اور وہ اٹھ کر عاجزی سے گڑگڑایا تھا۔

"اوئے منگ...... کیسی منگ کی مطلب ہے تیرا۔ تو تو بڑے ملک صاحب کو انکاری ہے۔ تو یہ کیا بولے جارہا ہے حمیدے؟" اس بار پاس بیٹھے قدرے عمر رسیدہ کزن نے غصے سے حمید کو مخاطب کیا تھا۔

"جی نہ نہ توبہ توبہ۔ میں ایسا کیسے کرسکتا ہوں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ میری دھی کا ویاہ ہونے والا ہے۔" وہ گھگھیا رہا تھا۔

"اوئے چپ کر تو، ویاہ ہونے والا ہے، ہوا تے نئی ناں اور اگر ہو بھی جاتا تو ملک کے سامنے اس کی بھی کیا حیثیت تھی۔ چپ چاپ یہاں سے نکل اور جا کر اپنی بیٹی کی ویاہ کی تیاری کر کسی اور سے نہیں ہمارے بیٹے ملک ایاز سے آئی سمجھ یا سمجھاؤں تجھے اپنی زبان میں۔" اس بار ملک اعجاز بولا تو لہجے میں دھمکی واضح تھی۔

"جی جی بڑے ملک صاحب، سمجھ گیا، مائی باپ۔" حمید ہاتھ ملتے ہوئے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ سارے چہرے ایک جیسے تھے، غرور اور تکبر میں ڈوبے ہوئے، پیسے کے نشے میں دھت۔ کتنا بے بس اور مجبور تھا حمید اس وقت۔

"اوئے سن...... جس تریخ کو تو نے اس کی شادی رکھی تھی اسی تریخ کو اپنی بیٹی کو لے کر آجانا اس کا نکاح حویلی میں ہوگا۔ آئی سمجھ؟" وہ جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ ایک بار پھر ملک اعجاز کی بھاری آواز پر ایک لمحے کے لیے رکا، اثبات میں سر ہلا کر خاموشی سے باہر نکل آیا تھا۔ کاندھے پر پڑے میلے رومال سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور

لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے گھر کی سمت چل دیا تھا۔

"ہائے ربا...... تو نے مجھے کس مشکل میں ڈال دیا ہے۔ ملکوں نے کب کہاں اور کیسے دیکھ لیا گل مینا کو؟ وہ تو پردے میں رہتی ہے اور باہر بھی نہیں نکلتی۔ گل مینا اور شہزاد بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رہے۔ کتنا پیار ہے ان دونوں میں۔ وہ دونوں تو بچھڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتے اور جب دونوں کا بیاہ ہونے جارہا ہے تو یہ کیسا امتحان ہے میرے مالک؟ مجھے کیسے عذاب میں مبتلا کردیا ہے ملکوں نے۔ بات نہ مانوں تو زندگی اجیرن اور اگر بات مان لوں تو میری دھی کے ساتھ ظلم، لگتا تھا سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں ختم ہوچکی ہیں۔ دماغ ماؤف ہورہا تھا۔ سوچیں مفلوج ہورہی تھیں۔ وہ مری مری چال چلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ تب کسی نے پیچھے سے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو حمید خیالات سے چونکا۔ جمال دین تھا۔

"کیا ہوا حمیدے؟ پریشان لگ رہا ہے۔ میں نے آواز بھی دی تو نے سنی نہیں۔ سب خیر تو ہے ناں؟ کہاں سے آرہا ہے اس وقت؟" جمال دین نے ایک سانس میں کئی سوال کردیے اور اس کے حواس باختہ چہرے کو غور سے دیکھا۔

جمال دین حمیدے کا بچپن کا یار تھا وہ اکیلا رہتا تھا، اس کے ماں باپ فوت ہوچکے تھے تب حمید کے ماں باپ نے اس کا خیال رکھا تھا، وہ حمید کا بھائی کی طرح خیال رکھتا تھ۔ شادی بھی نہیں کی تھی اور اس کے پڑوس میں ہی رہتا تھا۔ کچھ عرصے وہ شہر بھی گیا تھا مگر پھر گاؤں لوٹ آیا تھا۔ حمید نے ملکوں کی ساری بات اس کو بتادی تھی۔

"یہ تو بہت مشکل ہوجائے گی حمیدے۔ ادھر صغراں بھی تیاری کررہی ہے، شہزاد بھی اس بار کہہ کر گیا ہے کہ مہینہ دو مہینہ بعد آئے گا، شادی کے لیے پیسے جمع کررہا ہے۔"

"یہی تو سوچ رہا ہوں جمالے کہ کیسے سامنا کروں گا بختاں، گل مینا اور صغراں کا۔ کیا بتاؤں گا ان کو کہ ملک نے کیا کہا ہے مجھے۔" وہ جمالے کے سامنے رو دیا تھا۔

"چل گھر چل کچھ سوچتے ہیں۔ تو ابھی گھر جا کر آرام کر تیرا چہرہ دیکھ کر بہت دکھ ہورہا ہے حمیدے۔" جمال کو اس پر ترس آرہا تھا، گھر آگیا تھا حمید گھر میں داخل ہوگیا تھا۔

"ابا تو کہاں چلا گیا تھا میں نے روٹیاں بھی پکالیں۔ بجیا بھی ٹھنڈی ہوگئی۔" اسے دیکھ کر گل مینا نے کہا اور اس کے پاس آگئی تھی۔

"کیا ہوا حمیدے خیر تو ہے...... کیا ملکوں نے مارا ہے تجھے؟" حمید کا ہونق چہرہ دیکھ کر بختاں بھی پریشان ہوکر قریب آگئی تھی۔

"ایک گلاس پانی پلادے مینا کی ماں۔" وہ تھکا تھکا سا چارپائی پر ڈھے گیا تھا۔ اس کی پیشانی عرق آلود تھی۔ چہرے پر بے چینی نمایاں تھی۔ اس کی آنکھوں میں اداسی تھی۔ گل مینا بھاگ کر مٹکے سے کٹورہ بھر کر پانی لے آئی تھی۔

"یہ لے پی لے۔ حمیدے کچھ تو بول۔ کیا ہوا ہے کیوں پریشان ہورہا ہے تو۔ میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا ہے۔ سب خیر تو ہے ناں؟" پانی کا کٹورہ حمید کے کانپتے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے بختاں مسلسل بول رہی تھی۔

"مینا کی ماں، بڑے ملک جی نے ہمیں بڑے امتحان میں ڈال دیا ہے۔ کاش، وہ میری جان لے لیتا۔ میری ہڈیاں توڑ دیتا، مجھے چوراہے پر کھڑا کرکے جوتوں کے ہار پہنا دیتا مگر...... مگر اس نے تو میری دھی کی خواہشات کی قیمت لگادی، میری دھی کے ارمانوں کو اپنی دولت کے ترازو میں تولنے لگا ہے۔ اس نے قیمت لگائی بھی تو کیا لگائی۔ اس نے اپنے بیٹے کا نکاح گل مینا سے کرنے کی بات کی ہے۔" حمید کہتے ہوئے رو پڑا تھا۔

"ہائیں حمیدے۔ یہ کیا کہہ رہا ہے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے، اس نے ہماری گل مینا کو کہاں دیکھ لیا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔" بختاں سینے پر ہاتھ مار کر باقاعدہ بین کرنے لگی تھی۔

"ہائے ربا یہ کیا ہوگیا؟" گل مینا بری طرح لڑکھڑائی اور پلنگ پر گرنے کے انداز سے بیٹھ گئی۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تونے...... تونے بتانا تھا کہ اس کا دیاہ ہونے والا ہے۔ وہ کسی اور کی منگ ہے۔" بختاں قدرے سنبھل کر بولی تھی۔

"بولا تھا میں نے مگر......" وہ بیچارگی سے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا تھا۔

"مگر...... مگر کیا ابا؟" گل مینا تیزی سے اٹھ کر حمید کے پاس آئی تھی۔ اس کی نظروں میں شہزادکا سراپا گھوم گیا تھا۔

"مگر...... مگر یہ بڑے لوگ بھلا جواب کہاں مانگتے ہیں دھیے۔ یہ تو حکم دیتے ہیں بس۔ اس نے بھی مجھے حکم دیا ہے۔" حمید بے چارگی سے بولا تھا۔

"نہیں ابا...... ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ میں نے کسی اور سے ویاہ نہیں کرنا۔" مینا تڑپ کر بولی تھی۔

"حمیدے تو جانتا ہے ان کو۔ یہ لوگ ہمیں عزت دے سکتے ہیں کیا؟ چار دن کا شوق ہوگا، پھر ہماری گل مینا کو نوکرانی سے بدتر حالت میں چھوڑ دیں گے اس پر زندگی تنگ کردی جائے گی۔ ہماری بچی ہم سے بھی نہیں مل سکے گی۔ حمیدے۔" بختاں باقاعدہ رونے لگی تھی۔

"سب جانتا ہوں نیک بخت مگر کیا کروں تو بتا کہ میں کیا کروں؟ بوڑھا کمزور اور ناتواں انسان اکیلا کس طرح سے ان کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ ان سے مقابلہ کرسکتا ہوں کیا میں؟ وہ لوگ ہم پر زندگی تنگ کردیں گے۔ ہماری بیٹی کی عزت محفوظ نہ رہ سکے گی۔ ان سے ٹکر لینا ہمارے بس میں نہیں ہے گل مینا کی ماں۔ میں کیا کروں؟ تو بتادے۔"

"مگر شہزادکا کیا ہوگا حمیدے، وہ تو جلدی لوٹے گا بھی نہیں۔ وہ تو مر جائے گا۔ اتنا پیار کرتا ہے ہماری گل مینا سے وہ۔ گل مینا بھی مر جائے گی۔ حمیدے۔" بختاں مسلسل رو رہی تھی۔

"ابا میں مر جاؤں گی مگر ملک سے شادی نہیں کروں گی۔" گل مینا روتے ہوئے فیصلہ سنا کر اندر کمرے کی طرف بھاگ گئی تھی۔ بختاں اسے دیکھ کر ایک بار پھر رو پڑی۔

"ہائے ربا...... یہ کیا ہوگیا، کس کی نظر لگ گئی ہماری دھی کی خوشیوں کو۔ یہ آگ لگانے کون آگیا۔ ہم بے بس مجبور لوگ کریں بھی تو کیا کریں؟ قانون بھی ان کا، فیصلے بھی ان کے، عدالتیں بھی ان کی، سب کچھ ان بڑے لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ غریبوں کے ہاتھ میں تو سوائے عزت کے اور کچھ بھی نہ ہوتا ہے اس عزت کو بچانے کے لیے سو سو جتن کرتے رہتے ہیں۔" تب ہی دروازے پر دستک ہوئی اور جمال دین آگیا، اندر کا ماحول اس کی سوچوں کے عین مطابق تھا۔ وہ سلام کر کے وہیں چارپائی پر ٹک گیا تھا۔

"جمال دین میرے ویر، ہم کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔" بختاں نے دوپٹے سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے جمال دین کو مخاطب کیا تھا۔ جمال دین نے سر ہلایا وہ خود بھی اس افتاد سے پریشان تھا۔

"میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے حمیدے اگر تو بولے تو بتاؤں۔" کچھ دیر بعد جمال دین نے کہا تھا۔

"بول جمالے، میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ کیا کروں۔ کیا نہ کروں۔" حمیدے نے سر پکڑ کر کہا تھا۔

"حمیدے تو بھابی اور گل مینا کو لے کر رات کو چپکے سے شہر نکل جا۔" جمالے کی بات پر حمید سمیت بختاں بھی اچھل پڑی تھی۔

"پاگل ہوگیا ہے تو۔ یہ کیا بک رہا ہے، یہاں گھر بار ہے، کام ہے میرا۔ شہر میں کون ہے ہمارا کہ یوں جوان جہان بیٹی کو لے کر نکل جائیں۔ ہم چلے جائیں گے تو پیچھے صغراں اور ستارہ رہ جائیں گے ابھی شہزادکا بھی آنے کا کوئی پتا نہیں۔ یوں اسے ملے بنا، بتائے بنا کیسے بات بن سکتی ہے۔ جمالے تو نے بھی بچوں والی بات بولی ہے۔" حمیدے جو پہلے ہی بہت پریشان تھا جمالے کی بات پر اسے غصہ آگیا تھا۔

"میں نے سوچ سمجھ کر ای گل کی اے حمیدے۔ مجھے بھی تیرے سب حالات کا پتا ہے، تو کیا سمجھتا ہے میں انجان ہوں تیری پریشانیوں سے۔" جمالے کی آنکھوں

میں آنسو آ گئے۔ ”اللہ بڑا سائیں ہے، مجھے یاد آیا کہ میں جب شہر رہتا تھا تو میرا یار تھا رفیق احمد اس کا پتا کہیں رکھا ہوگا میں جا کر ڈھونڈتا ہوں۔ وہاں اس سے مل لینا وہ تیرے کام آ جائے گا بڑا بھلا بندہ ہے وہ۔“ جمال دین نے کہا۔

”ارے تو فرو ہی بول رہا ہے، ہم چلے جائیں گے تو پیچھے صغراں کا کیا ہوگا۔“ اس بار بختاں بولی تھی۔

”میں ہوں ناں یہاں پر۔ میں خیال رکھوں گا بختاں، جیسے تو میری بھابی ہے صغراں بھی میری بہن جیسی ہے۔ جب شہزادآئے گا تو۔ فر وہ لوگ تو شہر جانے ای والے تھے ناں ہماری گل مینا کے ویاہ کے بعد۔ وہ لوگ تجھ سے وہیں مل لیں گے۔“

”مگر...... مگر جمالے یہ ملک کے لوگ بہت برے ہیں۔ ان کو پتا چل گیا تو شہر تک ہمارا پیچھا نہ چھوڑیں گے۔“ بختاں نے ہول کر کہا تھا۔

”شہر بہت بڑا ہے بھرجائی، ہر کسی کو اپنے اندر چھپا لیتا ہے وہاں کسی کو ڈھونڈنا اتنا آسان نہیں ہوتا فر رفیق احمد ہے ناں، وہ تم لوگوں کی مدد کردے گا۔ وہ یاروں کا یار، بڑا چنگا بندہ ہے جی۔ تم لوگ بس دل وڈا کر کے تیاری کرو، رب سب اچھا کرے گا۔“

”میں نے ایک گل سوچی ہے حمیدے۔“ بختاں نے کچھ دیر بعد حمیدے کو مخاطب کیا تھا۔

”کیا؟“ حمیدے نے سر اٹھا کر اس کو دیکھا۔

”دیکھ میں جا کر ملکانی جی سے بات کرتی ہوں۔ وہ بھی ماں ہے ماں کے دل کی حالت جان سکدی ہے۔ میں اس سے عاجزی کروں گی۔ اس کے پاؤں پکڑ کر منتیں کروں گی کہ رب کے واسطے ہمیں معاف کردے۔ ہمیں بخش دے، ہم لوگ یہ گاؤں چھوڑ کر دوسرے گاؤں جا بسیں گے۔ ہمارے حالوں پر رحم کردے۔ ہم غریب لوگ ہیں۔ شاید وہ میری بات سمجھ لے اور اپنے پتر کو سمجھا لے۔“

”اوئے جھلی ہوگئی ہے تو، وہ لوگ سمجھنے والے نہیں ہیں۔ ضدی اور حاکم لوگ ہیں وہ۔“ حمیدے نے اس کی بات کو قطعی رد کرتے ہوئے کہا تھا۔

”حمیدے، بھرجائی ٹھیک کہتی ہے، وہ جا کر ملکوں سے نہیں ایک بار ملکانی سے بات کرلے۔ شاید رب کوئی حل نکال دے۔“ جمال دین نے کہا تو حمیدے سر ہلا کر رہ گیا، اس کی آنکھوں میں حد درجہ مایوسی تھی۔

”اچھا میں چلتا ہوں۔“ جمال دین حمیدے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اٹھتا ہوا بولا۔

”چل تو بھی روٹی کھا لے۔ یوں نہ کھانے پینے اور سوچتے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا حمیدے، رب پر بھروسہ رکھ اس نے مشکل کردی ہے وہی نکالے گا۔ دیکھ ہماری گل مینا کیسی چپ ہو کر رہ گئی ہے۔“ جمال دین کی بات پر حمید نے ٹھنڈی سانس لے کر سر ہلا کر کمرے کی طرف دیکھا جہاں گل مینا بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔

”تجھے کتنی بار کہا تھا، کمبخت کہ باہر مت نکلا کر مگر سمجھ نہ آئی تھی ناں میری بات۔ میں ماں تھی تیری۔ میرا دل کانپتا تھا، ڈرتا تھا، تجھ کو لے کر، کتنی پریشان رہتی تھی میں، کتنا سمجھایا تھا تجھے۔ بڑا شوق تھا تجھے باہر نکلنے کا۔ کہتی بھی تھی کہ جن بھوت چمٹ جائیں گے۔ دیکھ آ گئی ناں مصیبت۔ لگ گئی ناں بلا، چمٹ گیا ناں جن تجھے۔ اری اصل جن بھوت کا تو کاٹ بھی ہے مگر ایسے لوگوں سے کیسے بچے گی؟ کون چھٹکارا دلائے گا ان بلاؤں سے تجھے؟“ بختاں کو کچھ نہ سوجھی تو کمرے میں جا کر گل مینا کو کوسنے دینا شروع کر دیئے تھے۔

”اری نیک بخت۔ کیوں مارتی ہے اس کو۔ وہ خود مر رہی ہے۔ یہ تو رب سائیں کی مرضی کہ کسی کو حسن دے کر آزماتا ہے، کسی کو دولت، غرور اور حاکم بنا دیتا ہے۔“ گل مینا چادر میں منہ چھپا کر سسکنے لگی تھی۔

”اماں...... شہزاد کو کون بتائے گا؟ وہ تو ابھی آئے گا بھی نہیں۔ اس کا کیا حال ہوگا؟ اماں میں مر جاؤں گی۔“ گل مینا کا لہجہ دردناک تھا، بختاں اس کو سینے سے بھینچ کر خود بھی رونے لگی تھی۔
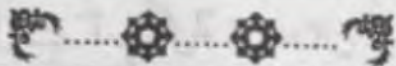
”اے مائی، کون ہے تو۔ کہاں جارہی ہے؟“ بلند و بالا حویلی کے دروازے پر پہنچی تو بختاں کو دیکھ کر ایک بڑی بڑی مونچھوں والے آدمی نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”مجھے ملکائن سے ملنا ہے۔“ بختاں نے کہا تھا۔

”اچھا جا۔ اندر چلی جا۔“ آدمی نے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے اجازت دی وہ اندر آ گئی اور ایک نوکرانی کی معیت میں ملکانی تک پہنچی، اونچی مسہری پر ملکانی بیٹھی تھی، اس کے پیروں کی مالش کرنے والی بوڑھی عورت اس کے قدموں میں بیٹھی تھی۔ ملکانی نے اسے دیکھا تو سوالیہ نظروں سے ساتھ لانے والی نوکرانی کو دیکھا۔

”سلام ملکانی جی۔“ بختاں نے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام، یہ کون ہے نموا اور ایسے کیوں چلی آئی؟“ ملکانی نوکرانی سے مخاطب تھیں۔

”ملکانی جی میں۔ میں حمیدے کی گھر والی ہوں جی۔ گل مینا کی ماں۔“ بختاں نے تعارف کروایا حالانکہ ملکانی اس کو جانتی بھی تھی مگر کافی دنوں سے سامنا نہیں ہوا تھا۔

”اواچھا...... اچھا تو ہے گل مینا کی ماں۔“

”بول کیسے آئی ہے؟ پیسوں کی ضرورت ہے ویاہ کے لیے؟“ ملکانی کے لہجے میں غرور ٹپک رہا تھا۔

”نا جی نا...... بڑی مہربانی ہے جی۔ آپ لوگ تو ہمارے ان داتا ہو جی۔ میں تو آپ سے ایک فریاد کرنے آئی ہوں جی۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر عاجزانہ لہجے میں بولی اور مسہری کے نیچے بیٹھ گئی۔

”اب کیا فریاد کرنی ہے تجھے۔ تیری بیٹی کے لیے حویلی کا دروازہ کھل گیا۔ اس کو اپنے برابر کی جگہ دے دی۔ اب کیا فریاد باقی ہے۔ ہیں تو بھی حویلی میں پناہ چاہتی ہے کیا؟ تو سن لے یہ تیری بھول ہے اگر تیری بیٹی کا حسن یوں میرے پتر پر جادو نہ کرتا تو وہ بھی وہیں پڑی ہوتی۔“

”نا جی نا...... ایسی بات نہیں ہے سرکار، رب دا واسطہ ہے میری دھی کو بخش دو جی۔ وہ کسی اور کی منگ ہے۔ وہ مر جائے گی سرکار۔ میری اکی اک دھی ہے سرکار۔ بڑی منتوں والی ہے۔ آپ بھی تو ماں ہو ناں جی۔ اپ تو دھی دے دکھاں جانتی ہو۔ رب دا واسطہ ملکانی جی۔ ہم یہ گاؤں چھوڑ کر دور چلے جائیں گے جی۔ بہت دور۔ ہمیں معافی دے دو ملکانی جی۔“ بختاں دونوں ہاتھ جوڑے ملکانی کے سامنے گڑگڑا رہی تھی۔

”یہ...... یہ کیا بک رہی ہے تو۔ کیا بکے جا رہی ہے، تیری یہ اوقات کہ تو ملکوں کو سمجھائے۔“ یکایک ملکانی کے چہرے کا رنگ بدلا، وہ شدت جذبات سے کھڑی ہوئی اور گرج کر بولی تھی۔

”نا جی نا...... میری توبہ توبہ جی میں، ایسا نہیں کر رہی۔ میں تو فریاد لے کر آئی ہوں جی۔ ملکانی قسم رب دی۔“ بختاں کا پورا وجود ڈر کے مارے لرزنے لگا، وہ بھی کھڑی ہوگئی اور ہاتھ بدستور جوڑ کر ملکانی کے قریب آ گئی تھی۔

”تیری یہ اوقات۔ تیری یہ حیثیت کہ تو ہمارے سامنے بولے۔ ملکانی کے سامنے بک بک کرے...... ارے تم گندی نالے کے کیڑے مکوڑوں، تمہیں تو ہمارے پیروں میں سر رکھ کر جینا چاہیے کہ تیری دھی کو نکاح کر کے لا رہے ہیں، ورنہ تیری اوقات تھی کیا کہ میرا پتر اسے اٹھا کر لاتا۔ اس کی عزت پامال کر دیتا۔ تیری ہمت کیسے ہوئی کہ ایسی بات کرے ہمارے سامنے، ملکوں کے سامنے انکاری ہو اب تو بھی دیکھ۔ سب کے سامنے تیری دھی کا وہ حشر کرواؤں گی کہ تیرے سات جنم یاد رکھیں گے۔ اکی اک دھی ہے ناں تیری۔ روتی رہنا ساری جند اس کی زندہ لاش پر۔ نہ تو زمانے میں جینے کے قابل رہے گی نہ تیری دھی۔ بہت مان ہے ناں تجھے۔ بہت بھاؤ دکھا رہی ہے ناں۔ دھی کی خوبصورتی کی۔ دیکھ لینا۔ کیسے اس خوبصورتی کو بدصورتی میں بدلواتی ہوں۔ تم لوگ اس قابل تھے ہی نہیں کہ شرافت کی بات سمجھتے۔ بختاں تو نے یہ بات کر کے ملکانی کو ہی نہیں ملکوں کو بھی بے عزت کر دیا ہے اور ملک اپنی عزت کے پیچھے جان لیتے بھی ہیں اور نسلیں تباہ بھی کر دیتے ہیں۔ اب تو بھی دیکھ کہ ملک کیا کرتے ہیں تیرے خاندان کے ساتھ۔“ ملکانی کا چہرہ غم و غصے کی شدت سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا اس کی زبان سے شعلے نکل رہے

تھے اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بختاں کے ٹکڑے ٹکڑے کردے۔

"رب دا واسطہ ملکانی جی۔ مجھے معاف کردو۔ آپ لوگ ہمارے سرکار ہو جی۔ ہمارے مائی باپ۔ میری توبہ۔ میرے باپ کی توبہ۔ غلطی ہوگئی سرکار۔ معاف کردو۔ سرکار ہم۔ ہمارے ماں باپ، آپ لوگوں کے نوکر ہیں جی۔ آپ لوگوں کا دیا کھانے والے۔ بہت بڑی غلطی ہوگئی جی۔ آپ جو کریں، جیسا کریں ہمیں منظور ہے جی۔ ہم ادنیٰ، ہم بھلا آپ سے ٹکر کیسے لے سکتے ہیں۔ مجھے معاف کردو ملکانی، مجھے معاف کردو۔" بختاں ملکانی کے قدموں میں گر کر رو رو کر دہائیاں دینے لگی۔ ملکانی کا غیض وغضب اور غصہ اس وقت عروج پر تھا اور بختاں قدموں میں پڑی گڑگڑا رہی تھی ہاتھ جوڑ کر اپنی غلطی کی معافی مانگ رہی تھی۔

"اگر اس وقت ملک اعجاز ہوتا تو تیری ہڈیاں توڑ کر رکھ دیتا۔ جانتی ہے ناں اس کے غصے کو۔" ملکانی نے بختاں کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا تھا۔

"جی...... رب دا واسطہ ملکانی، بڑے ملک جی کو کچھ نہ بولنا جی۔ مجھے معافی دے دو۔" بختاں سر اٹھا کر دوبارہ گڑگڑائی۔ ایک نوکرانی دوڑ کر ٹھنڈے پانی سے بھرا کٹورہ لے آئی اور ملکانی کی طرف بڑھایا۔ ملکانی نے نفرت بھری نگاہ بختاں پر ڈالی اور مسہری پر بیٹھ کر پانی پینے لگی۔ بختاں بدستور کانپتی ہوئی ہاتھ جوڑے سر جھکائے قدموں میں بیٹھی تھی۔

"سن......" ملکانی نے پانی پی کر پیر سے ٹھوکر مار کر بختاں کو مخاطب کیا تھا۔

"جی...... جی حکم ملکانی۔" بختاں دوپٹے سے آنکھیں صاف کرکے جلدی سے بولی تھی۔

"پہلے تو تجھے وقت دیا تھا ناں اب یہ سن لے کہ کل ہی، کل ہی تیری دھی کو حویلی میں لے آؤں گی۔" اور وہ ایک لمحے کو رکی۔

"اور...... اور۔" بختاں نے آنکھیں کھول کر اس کی جانب دیکھا۔

"اور...... اس کا نکاح کروں گی۔ وہ یہیں رہے گی اور کل کے بعد نہ تو اپنی دھی سے مل پائے گی اور نہ تیرا گھر والا۔ اس سے رشتہ ختم ہوجائے گا۔ اگر وہ میرے پتر کی ضد نہ ہوتی تو اس کا انجام زمانہ دیکھتا مگر تیری سزا یہی ہے کہ تیرا رشتہ اس سے ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گا۔ جا اور جاکر اپنے گھر والے کو بتادے یہ ہمارا فیصلہ ہے۔" ملکانی کے فیصلے پر بختاں تڑپ اٹھی تھی۔

"ملکانی رحم۔"

"اگر ایک لفظ بھی نکالا تو ہم سے برا کوئی نہ ہوگا۔ اپنی منحوس شکل لے کر یہاں سے نکل جا اور کبھی مجھے نظر مت آنا۔ نذیراں اس کو باہر نکالو اور ابھی میرے کمرے میں کوئی نہ آئے۔" ملکانی نے فیصلہ سنایا تھا۔ بختاں تڑپتی، بلکتی اور سسکتی گھر لوٹ آئی تھی۔

"اماں...... اماں کیا ہوا، کیا کہا ملکانی نے؟" گل مینا جو بے چینی سے اس کی منتظر تھی دوڑ کر پاس آئی تھی۔

بختاں نے گل مینا کو ایک لمحہ غور سے دیکھا اور اسے سینے سے بھینچ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ یہ کیسا انصاف تھا؟ یہ کیسا فیصلہ تھا؟ غریب اور بے بس لوگ ہی کیوں عتاب کا نشانہ بنتے ہیں؟ بااختیار اور صاحب حیثیت لوگ جیسے اور جس طرح چاہیں اپنے اختیارات اور اپنے نام کا استعمال کرلیتے ہیں، پستے ہمیشہ غریب ہی ہیں۔ یہ کیسا فیصلہ تھا۔ وہ کیسی ماں تھی جو اولاد اور ماں کو جدا کرنے کا فیصلہ سنا کر مطمئن تھی۔

"ربا ہم غریبوں پر رحم کھا۔ ہم تیرے عاجز مسکین بندے ہیں، نا ہم طاقتور ہیں نا ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ ہے۔ ہمارے حال پر رحم کر میرے ربا۔" دونوں ماں بیٹی حالات سے شکوہ کناں تھے۔ تب ہی حمید بھی آ گیا تھا اس کے ساتھ جمال دین بھی تھا۔ حمید نے سنا تو وہ بھی مزید پریشان ہوگیا تھا۔

"میں نے تجھے منع بھی کیا تھا بختاں نہ جاؤ ہاں پر، دیکھ لی ان کی مہربانی تو نے۔" وہ الٹا بختاں پر برس پڑا تھا۔

بختاں بے چاری تو فریادی بن کر گئی تھی کہ شاید ایک عورت کو عورت پر رحم آجائے مگر اس حویلی کی اونچی اونچی دیواروں کے درمیان بسنے والے لوگوں میں نا ممتا کا جذبہ تھا اور نا انسانیت وہ تو دولت کے نشے میں، غرور میں ڈوبے ہوئے لوگ تھے۔ اللہ کے عذاب اور اس کی پکڑ سے نا آشنا۔ ان کا حکم تھا کہ وہ جو کہیں اس پر سر جھکا کر عمل کرنا ہے۔

گل مینا خود اس منحوس گھڑی کو کوس رہی تھی کہ جب ملک ایاز کی آوارہ نظروں کی زد میں آئی تھی، ادھر شہزاد کے بارے میں سوچ سوچ کر اس کا دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ بس آج، آج کی رات تھی۔ کل اس کے نصیب کا فیصلہ ہونے جا رہا تھا۔ شہزاد میلوں دور بیٹھا تھا اس کو تو حالات کا پتا ہی نہ تھا۔ ادھر صغراں الگ پریشان تھی۔ اسے بھی سارے حالات کا علم ہو چکا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے ننھی ستارہ بالکل گم صم ہوگئی تھی وہ تو اپنے ویر کی شادی کو لے کر کتنی خوش تھی۔

”دیکھ حمیدے، میں نے صغراں سے بات کر لی ہے۔ اس کو سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تو رات کو یہاں سے نکل جا آج رات کو ویسے بھی حویلی میں ملک واحد کے ہاں پتر ہونے کی خوشی میں ناچ گانے کی محفل ہوگی سارے لوگ وہاں پر مست ہوں گے۔ اس لیے تم لوگوں کو نکلنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ خاموشی سے ضروری سامان سمیت کر تیاری کر لے میں نے رفیق احمد کا پتا ڈھونڈ کر نکال لیا ہے یہ لے۔“ جمال دین نے جیب سے ایک تڑا مڑا کاغذ حمید کی جانب بڑھا کر کہا تھا۔

”جمالے...... ایسے کیسے نکل جائیں ہم۔ اگر ملک اعجاز کو خبر ہوگئی تو وہ ہمیں کتوں کے آگے ڈال دے گا۔“ حمید نے کاغذ ہاتھ میں لیتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں کہا تھا۔

”سوچ لے حمیدے تیرے لیے میں ہر طرح کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔ تیرا نمک کھایا ہے یار۔ تیری ماں نے سدا مجھے بیٹا بنا کر رکھا تھا۔ میں تیرے بھلے کی ہی سوچوں گا۔ آگے تیری مرضی جو تو کرے گا میں ساتھ رہوں گا تیرے، جو مجھ سے ہو سکے گا کروں گا۔“ جمال دین نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پر یقین لہجے میں کہا تھا۔

”یارا...... میں جانتا ہوں تو میرے بھائی جیسا ہے جمالے مگر شہزادا آنے والا ہے اور پیچھے صغراں کیسے کلی رہے گی؟“ حمید پریشان سے لہجے میں بولا۔

”تو فکر نہ کر تو بس اس پتے پر پہنچ جا۔ میں یہاں دیکھ لوں گا۔ بہن صغراں کا خیال رکھوں گا۔ جیسے ہی شہزادا آئے گا۔ اسے سب کچھ سمجھا کر تیرے پاس شہر بھیج دوں گا تو فکر نہ کر حمیدے، شہزاد تو شہر کے راستے جانتا ہے، کیا پتا کہ وہ رفیق احمد جس محلے میں رہتا ہے وہ بھی دیکھ رکھا ہو۔“ جمال دین نے سمجھانے والے انداز میں کہا تو حمید نے بختاں کی جانب دیکھا تھا۔

”ابا...... رب دا واسطہ ہے۔ یہاں سے نکل چل ورنہ میں مر جاؤں گی اب۔ ویسے بھی اگر بھاگتے ہوئے مری تو بھی ماری جاؤں گی اور نہیں تو کل حویلی میں قید ہو کر تم سب سے بچھڑ کر مر جاؤں گی۔ ابا میں شہزاد کے سوا کسی سے ویاہ نہیں کر سکتی۔ ابا میں مر جاؤں گی۔ مر جاؤں گی۔“ گل مینا جو ابھی تک صرف رو رہی تھی حمید کے قدموں میں بیٹھ کر ہذیانی انداز میں اس کے پیر تھام کر بری طرح رو پڑی۔ حمیدے نے آگے بڑھ کر گل مینا کو اٹھایا اور سینے سے لگا کر خود بھی سسک پڑا تھا۔

⁂

رات بے حد خوفناک اور اندھیری تھی۔ رات کے سائے پوری طرح پھیل چکے تھے۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ بس حویلی میں آج جشن منایا جا رہا تھا، ملک واحد کے ہاں شادی کے چار سال بعد بیٹا پیدا ہوا تھا، حویلی میں شراب اور شباب کی محفل عروج پر تھی، شہر سے ناچنے گانے والیاں آئی ہوئی تھیں۔

گھر میں تھا ہی کیا دو چار پائیاں، چند برتن، ایک صندوق اور چند جوڑے کپڑوں کے علاوہ بختاں نے کپڑوں کی گٹھڑی باندھی، جمال دین نے کچھ روپے حمید کو

تھمادیئے تھے۔ بختاں کو بے تحاشہ رونا آرہا تھا۔ یہ چھوٹا سا گھر، جس کو بختاں نے اپنی حیثیت کے مطابق سجا سنوار کر رکھا تھا، چھوٹا سا صحن اور صحن میں گل مینا نے چلنا سیکھا، چھپر کے نیچے بندھے بکری کے بچے۔ اس گاؤں میں بختاں نے بچپن گزارا تھا۔ یہیں شادی ہوکر حمیدے کے گھر آئی۔ سوچا بھی نہ تھا کہ محبت سے بسایا ہوا ہنستا بستا گھر یوں اجاڑ کر راتوں رات چوروں کی طرح بھاگنا پڑے گا۔

جب رات گہری ہوئی اور چھوٹے چھوٹے گھروں میں روشنیاں اندھیرے میں تبدیل ہوگئیں۔ گاؤں کے محنت کش اور دن بھر کام کرنے والے تھک کر نیند کی آغوش میں چلے گئے تب ہاتھوں میں ایک ایک گٹھڑی سنبھالے یہ تین نفوس دبے پاؤں گھر سے نکلے۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازوں سے ماحول میں کچھ دیر کے لیے عجیب خوف زدہ احساس ہوتا پھر خاموشی ہوجاتی۔

"اماں...... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ ہم خیر سے نکل جائیں گے ناں؟" گل مینا کا ننھا سا دل خوف سے بری طرح دھڑک رہا تھا۔ یہی حال بختاں اور حمیدے کا تھا۔

"اماں ابا اندھیرا بہت ہے، ہم کیسے جائیں گے؟" گل مینا وسوسوں کا شکار تھی۔

"تیرے ابے کو سارے راستے پتا ہیں پتر۔ فکر نہ کر بس خاموش رہنا اب آگے کچھ نہ بولنا۔ خاموشی کے ساتھ چلتی رہنا۔" بختاں نے خوف زدہ لہجے میں اسے تنبیہہ کی اور پہلے حمیدے، اس کے پیچھے بختاں اور بختاں کا ہاتھ تھامے گل مینا خاموشی سے گلی عبور کرکے پگڈنڈی تک آگئے۔ کوئی آدم یا آدم زاد نہ تھا، وہ لوگ گو کے خوف زدہ تھے مگر یہ اطمینان تھا کہ کھیتوں میں چلے گئے تو نکلنے میں آسانی ہوجائے گی، لمبی لمبی فصلوں کا سہارا لے کر آگے بڑھتے جائیں گے، وہاں سے سیدھی طرف لمبا چل کر پکی سڑک آجاتی تو پھر آگے بھاگنے میں آسانی ہوجاتی۔

سیاہ رات، پرہول سناٹا اور خوف زدہ نفوس۔ وہ لوگ کھیتوں میں داخل ہوچکے تھے مگر ابھی بھی کافی لمبا راستہ طے کرنا تھا۔ سو دبے پاؤں چلتے چلتے ایسے محسوس ہورہا تھا کہ جیسے سانس کی آواز بھی بھاری ہو۔ کہیں سانس کی آواز سن کر آس پاس سے کوئی نہ نکل آئے۔ کھیتوں کے دوسری طرف قبرستان بھی پڑتا تھا۔ گل مینا خوف سے کانپنے لگی تھی۔ غیر معمولی تاریکی میں چلتے چلتے کافی دیر ہوچکی تھی۔

تب حمیدے کو احساس ہوا کہ شاید وہ غلط راستے پر چل پڑا ہے۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہوگئے جتنا چل چکے تھے اس طرح سے تو کھیت پار ہوجانے چاہیے تھے لیکن یہ قبرستان کا پچھلا حصہ تھا جہاں ملکوں کے کچھ ملازمین راتوں کو نشہ کرتے تھے۔ اچانک حمید رک گیا۔ اس کے پیر لرزنے لگے، اس کے ساتھ ہی بختاں اور گل مینا کے قدم بھی جام ہوگئے تھے۔ قبرستان کی ٹوٹی ہوئی دیوار کے پاس سگریٹ کی ہلکی روشنی بتارہی تھی کہ وہاں پر وہی نشئی موجود ہیں۔ حمید کے قدم من من کے ہورہے تھے۔ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آگے جائے یا پیچھے واپس مڑ جائے۔

"کون ہے ادھر۔ اوئے فیکے دیکھ تو۔ کوئی کتا تو نہیں آگیا کھیتوں میں۔ سالا گند مچادے گا۔" ایک آواز آئی تھی۔ حمید، بختاں اور گل مینا کی آنکھیں خوف سے پھٹنے لگی تھیں۔

"ارے چھوڑ، کتا کیا کرلے گا۔" یہ دوسری آواز تھی۔

"اوئے یاد ہے۔ دینو کو ملک صاحب نے اس بات پر کتنا مارا تھا جب اس کی گائے نے یہاں گندم مچائی تھی۔ گولی چلادے۔ جو ہوگا ڈر کر بھاگ جائے گا۔" پہلی آواز دوبارہ آئی تھی۔ اف تینوں کو لگا جیسے ان کا آخری وقت آگیا ہو۔ خوف و دہشت سے تینوں کانپنے لگے۔

"چل اوئے جھلے۔ ایسے گولی نہ چلا۔" یہ تیسری آواز تھی۔ تینوں موت کی دہلیز پر کھڑے تھے، کسی بھی وقت سنسناتی ہوئی گولی ان کے جسموں کے پار ہوسکتی تھی۔

"اماں......" گل مینا بختاں سے چمٹ گئی تھی۔ خوف اور دہشت سے اس کی آواز سلب ہوگئی تھی۔ اسی لمحے کسی نے ٹارچ جلائی تھی۔

"ربا رحم۔" بختاں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ تینوں پر خوف سے لرزہ طاری تھا۔ چھپنا یا چھپنے کی کوشش کرنا

سراسر حماقت تھی۔ وہ تینوں اور خاص طور پر آگے کھڑا حمیدے ٹارچ کی مکمل زد میں تھے۔

"اوئے گامے، شیدے ادھر آ۔ کھیتاں وچ کوئی اے۔" ٹارچ والے نے پلٹ کر ساتھیوں کو آواز دی۔

"اوئے یہ۔ یہ تو حمیدے چاچا ہے اور یہ اوئے یہ کیا کر رہے ہیں ادھر؟" تینوں قریب آ گئے تھے۔ حمیدے خوف و دہشت سے تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ زبان گنگ ہو گئی تھی۔

"اوئے...... یہ لوگاں بھاگ رہے ہیں۔ پکڑ سالے کو دیکھ تو پیچھے زنانیاں بھی ہیں۔" نشے میں دھت بدمست ہاتھی کی طرح شیدا گل مینا کی طرف بڑھا تھا۔

"اوئے ہاتھ نہ لگانا۔" نا جانے کہاں سے کمزور اور ناتواں حمید میں اتنی طاقت آ گئی تھی کہ اس نے پوری قوت سے شیدا کو دھکا دیا اور شیدا لڑکھڑا کر سنبھل نہ پایا اور گر گیا تھا۔

"اوئے...... تیری یہ ہمت اک تو راتوں رات بھاگ رہا ہے اوپر سے بدمعاشی بھی۔" دوسری طرف سے گامے نے حمید کو پکڑ کر اس کے منہ پر چانٹا دے مارا۔

"ہائے ربا۔" بختاں ایک قدم آگے بڑھی، ٹارچ کی روشنی میں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"ان کو پکڑ کر ملک صاحب کے پاس لے جاؤ۔" کسی نے آواز لگائی اتنی دیر میں شیدا اٹھا اور ڈنڈا لے کر حمیدے پر پل پڑا۔ بختاں مدد کو آگے بڑھی۔ گل مینا دہشت سے کانپنے لگی تھی کسی نے فائر کر دیا۔ رات کی ہولناک تاریکی میں نہ جانے کہاں سے آگ کا شعلہ بلند ہوا ایک اور پھر دوبار، ساتھ ہی پہلے حمید اور پھر بختاں کی دل دہلا دینے والی چیخ بلند ہوئی تھی۔

"ابا...... اماں۔" گل مینا بدحواس ہو کر آگے بڑھی تھی۔

"مینے...... مینے گل بھا...... گ...... جا...... بھاگ جا دھیے۔ یہ کتے تجھے نہیں چھوڑیں گے۔ بھاگ...... بھاگ۔" حمیدے کی لڑکھڑاتی ہوئی آواز ابھری تھی۔ وہ زمین پر گرنے لگا تھا۔

اک لمحے کو گل مینا کے قدم پتھر کے ہو گئے تھے، ٹارچ کی روشنی میں اسے ماں اور باپ کے خون آلود جسم نظر آ رہے تھے، بختاں شاید ختم ہو چکی اور حمیدے۔

"جا گل مینا تجھے تیری ماں کی قسم جا بھاگ جا۔" بہ مشکل حمید پوری قوت سے چیخا تھا۔

گل مینا کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔ ماں، باپ کی لاشیں پڑی تھیں، سامنے بھوکے درندے تھے۔ وہ پلٹی اور پوری رفتار سے اندھیرے کی سمت دوڑنا شروع کر دیا تھا۔

"بھاگ...... ادھر دیکھ...... ادھر گئی ہے۔" آوازیں تعاقب میں تھیں۔ گل مینا کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا بس وہ بے تحاشہ بھاگ رہی تھی۔ دیوانہ وار۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دھیرے دھیرے آوازیں کم ہونے لگی تھیں۔ ٹارچ کی ادھر ادھر بکھرتی روشنی نے بالآخر نقطے کی شکل اختیار کر لی اور نظروں سے وہ نقطہ بھی غائب ہو گیا۔ اس وقت گل مینا کو صرف اور صرف اپنی عزت بچانی تھی۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو چکی تھیں۔ آنکھوں کے سامنے ماں باپ کی خون میں لت پت لاشیں تھیں اور بنا سوچے سمجھے بھاگ رہی تھی۔ نا منزل کا پتا تھا نا کسی راستے کا علم تھا۔ انجانے راستے اور نامعلوم منزل کی طرف دوڑتے دوڑتے نہ جانے کتنے گھنٹے ہو گئے تھے۔ اس کا ذہن خالی ہو چکا تھا۔ کہاں جانا ہے؟ کیا منزل ہے، کس سے ملنا ہے۔ کسی بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ رفیق احمد کا پتا تو حمید کے پاس تھا، نہ جانے کہاں خون میں سنا پڑا ہوگا وہ معمولی سا کاغذ۔ بھاگتے بھاگتے پیروں میں سوجن آ گئی تھی۔ ایڑیاں پھوڑے کی طرح دکھنے لگی تھیں۔ سر چکرانے لگا تھا۔ وہ گاؤں سے دور نکل آئی تھی۔ نہ وقت کا احساس ہو رہا تھا نہ منزل کا تعین۔ پیر بے جان ہونے لگے تھے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ وہ لڑکھڑائی تھی۔ ساری ہمتیں جمع کر کے قدم آگے بڑھانے کی ناکام کوشش کی۔ چند قدم مزید وہ آگے بڑھی۔ بھاگتے بھاگتے حلق میں کانٹے پڑنے لگے تھے۔

"ربا......" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

آسمان کی طرف سر اٹھایا۔ اسے لگا جیسے زمین کے ساتھ ساتھ۔ آسمان بھی گھومنے لگا ہو۔ لڑکھڑاتے قدم زمین پر جمانے کی ناکام کوشش کرتے کرتے وہ ایک جانب لڑھکتی چلی گئی تھی۔

صبح ہو بھی نہ پھٹی تھی کہ سارے گاؤں میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ کھیتوں میں حمید اور بختاں کی لاشیں پڑی تھیں اور ملک اعجاز اور ملک ایاز شیدے، گامے اور فیکے کی کلاس لے رہے تھے۔

"اوئے خبیثوں، پاگل کی اولادوں یہ کیا کر دیا تم لوگوں نے، ان کو کیوں مار دیا اور وہ ان کی دھی کو بھاگنے دیا۔" ملک اعجاز نے شیدے کو لات ماری۔ وہ غصے سے بے قابو ہو رہا تھا یہی حالت ملک ایاز کی تھی۔

"معاف کر دو سرکار۔ مجھے غصہ آ گیا تھا۔ اس نے بہت زور سے مارا تھا اور میں نشے میں تھا جی۔ پتا نہیں کیسے مجھ سے گولیاں چل گئیں، میں نے جان کر نہیں ماری۔" ملک ایاز پاگلوں کی طرح ہنٹر چلانے لگا۔

"جس کو پکڑنا تھا اس کو روکا نہیں اور یہ۔ مرداروں کو مار دیا۔ نمک حراموں۔ حرام زادو، اب اتارتا ہوں نشہ سب کا۔"

"ہائے ہائے سرکار ہم اس کے پیچھے بھاگے۔ بہت دور تک مگر نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ قسم اللہ پاک کی سائیں۔ ہمیں معاف کر دو۔ ہمیں معاف کر دو۔" وہ تینوں گڑگڑا رہے تھے ان کے کپڑے پھٹ چکے تھے۔ گاؤں کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ سب لوگ آنکھیں پھاڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ راتوں رات کیا ہو گیا تھا۔

"ملک ایاز بس کر دے مر جائیں گے۔" تینوں کے جسموں پر ہنٹروں کی ضرب سے خون نکل آیا تھا مگر ملک ایاز پر جنون سوار تھا۔

ان لوگوں کی یہ جرأت کہ راتوں رات بھاگ رہے تھے اور جس کے لیے وہ پاگل ہو رہا تھا وہ تو چکمہ دے کر پتا نہیں کہاں نکل گئی تھی۔ یہ بات مشہور کر دی گئی کہ راتوں رات یہ لوگ شادی کے لیے ملک اعجاز سے پیسے لے کر فرار ہو رہے تھے تو کھیتوں کی حفاظت کرنے والے تین بندوں نے چور اچکے سمجھ کر گولی چلا دی۔ بھلا گاؤں میں کس کی مجال تھی کہ وہ صحیح اور غلط کی تحقیقات کرتا جمال دین اور صغراں کو پتا چلا، صغراں چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی تھی۔

یہ کیا ہو گیا تھا، اس کی بہن اور بہنوئی کا قتل ہو گیا تھا اور ہونے والی بہو لاپتا تھی۔ جمال دین بھی اپنے حواسوں میں نہ تھا ایک تو بھائی بھاوج جیسے حمیدے اور بختاں کی اس طرح کی موت اور اوپر سے گل مینا کا یوں لاپتا ہو جانا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا تھا کہ گل مینا اکیلی کہاں پر ہوگی؟ وہ تو سیدھی سادی معصوم ہے اس کی خوب صورتی جو اس کے لیے سزا بن گئی تھی۔ یا اللہ تو اس بچی کی حفاظت کرنا۔ وہ بے آسرا۔ بے بس اور تنہا کیسے مقابلہ کر پائے گی، اس دنیا کے لوگ بہت ظالم ہیں، میرے مولا وہ بری طرح رو رہا تھا۔ حمیدے اور بختاں کا کفن دفن کا انتظام جمال دین اور صغراں نے مل کر کیا تھا، ملک اعجاز نے بریانی بھیجی تھی۔ جمال دین پھٹی پھٹی آنکھوں سے گرم گرم بریانی کو دیکھ رہا تھا۔ یہ کیسا کھانا تھا؟ کس کے بے بس موت پر خوشیاں منائی جا رہی تھیں یا غریب کی بے بسی کا مذاق اڑایا جا رہا تھا، جمال دین قبرستان میں بیٹھ کر دیر تلک آنسو بہاتا رہا گاؤں کے چند لوگ تدفین میں شریک تھے سب اپنے اپنے لفظوں میں تسلی دے رہے تھے۔ سارے گاؤں کو اصل بات کا علم ہی نہیں تھا کہ سارا معاملہ در اصل تھا کیا؟ ستارہ کا رو رو کر برا حال تھا۔ وہ صغراں سے لپٹی تھی۔ خالہ اور خالو کو اس طرح دیکھ کر اس کی حالت بری ہو گئی تھی، اوپر سے گل مینا۔ گل مینا کو لے کر صغراں اور جمال دین بھی بے حد پریشان تھے۔

دوپہر ڈھلنے لگی تھی، جمال دین قبرستان میں حمیدے کی قبر کے سرہانے بیٹھا تھا، اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو رواں تھے اسے بچپن سے لے کر آج تک کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی، حمیدے نے کبھی بھی اس کو غیر نہ جانا تھا۔ اس ماں نے جمال دین کو شادی کرنے کے لیے

بہت زور دیا مگر جمال دین کو شادی نہ کرنی تھی۔

''نہ ماسی میں کلا بھی بھلا ہوں۔'' وہ ہر بار یہی جواب دیتا اور آج۔ وہ واقعی اکیلا رہ گیا تھا۔ عجیب سوگواریت چھائی ہوئی تھی ایسے میں قبرستان میں بیٹھنا بھلا لگ رہا تھا، وہ حمید سے باتیں کررہا تھا۔

''حمیدے تو، تو چلا گیا یار مگر ہماری دھی۔ دھی نہ جانے کہاں بھٹک رہی ہوگی۔ وہ تو نادان ہے، جھلی ہے، نہ جانے کہاں ہوگی؟ شہر اتنی دور ہے، اکیلی کیسے جائے گی؟ اور ملک اعجاز کے کتے اس کو ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ میرے مولا تو اس معصوم کی حفاظت کرنا۔''

''اوئے جمال دین تو یہاں بیٹھا ہے۔ تجھے بڑے ملک صاحب بلارہے ہیں۔ چل اٹھ وہ ڈیرے پر راہ دیکھ رہے ہیں تیری۔'' ملک اعجاز کے پلے ہوئے نوکروں میں سے کوئی نوکر تھا۔ آواز پر جمال دین نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔

''مجھے...... مجھے کیوں بلایا ہے جی؟'' گھبرا کر سوال کیا۔

''مینوں کی پتا اے؟ جا کر پتا کرلے خودی۔'' جمال دین ٹھنڈی سانس لے کر مٹی کی ڈھیری پر ایک نظر ڈال کر اٹھا۔ آنکھوں کو کاندھے پر پڑے ملگجے رومال سے صاف کرتے ہوئے ڈیرے کی سمت چل دیا۔ ڈیرے پر ملک اعجاز، ملک ایاز اور دو تین لوگ بیٹھے تھے۔

''سلام ملک جی۔'' جمال دین نے سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام۔'' ملک اعجاز نے جواب دیا اور سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

''جی ملک صاحب، آپ نے یاد کیا۔'' جمال دین نے آنکھوں کو صاف کرتے ہوئی کھڑے کھڑے قدرے جھک کر ملک اعجاز کو غور سے دیکھا تھا۔

''ہاں یہ بتا حمیدے تیرا بھائی تھا؟'' ملک اعجاز کے سوال پر جمال دین تھوڑا سا چونکا۔

''نہیں صاحب بھائی نہیں تھا پڑوسی تھا بھائی جیسا۔'' جمال دین نے کہا تھا۔

''مگر لوگ کہتے ہیں کہ تو بھائی تھا اس کا۔'' ملک ایاز نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کرسی پر پہلو بدل کر کہا تھا۔

''نہ جی نہ...... میرا پیو اور اس کا پیو یار تھے اور ساتھ ساتھ گھروں میں رہتے تھے، بھائیوں جیسا یارانہ تھا فر میں اور حمیدے بھی ایسے ہی بچپن سے ساتھ رہے ہے، میرے ماں باپ فوت ہوئے تو حمیدے کی ماں نے مجھے بہت سہارا دیا جی۔ بس ہم میں کوئی خونی رشتہ نہیں۔ یارانہ تھا اور بس۔'' جمال دین کا لہجہ آزردہ تھا۔

''مطلب کہ تو گھر جیسا ہی بندہ تھا ناں اس کا؟''

''جی...... جی ملک جی۔'' وہ عاجزی سے بولا تھا۔

''تو شرافت نال یہ بتادے کہ وہ لوگ کہاں بھاگے جارہے تھے۔ کس کے پاس بھیج رہا تھا تو ان کو۔ دوسرے گاؤں یا شہر۔ کس رشتے دار کے پاس کا کہہ کر وہ گھر سے نکلے تھے۔'' اس بار وہاں پر بیٹھے تیسرے کالے اور بڑی بڑی مونچھوں اور گھنی داڑھی والے نے سوال کیا، وہ شکل سے ہی کوئی اشتہاری مجرم لگ رہا تھا۔

''نہ جی نہ...... مینوں تو کچھ وی نہیں معلوم، مجھے بھی خبر نہیں تھی کہ وہ لوگ بھاگنے والے ہیں۔ میں تو اپنے گھر میں سو رہا تھا۔ مجھے تو سویرے خبر ملی۔'' جمال دین ایک لمحے کے لیے گڑبڑایا اور فوراً ہی خود پر قابو پاکر بولا یہ تو اس نے عقل مندی کی تھی کہ سب سے پہلے حمیدے کی جیب سے رفیق احمد کے پتے والی پرچی نکال کر پھینک دی تھی ورنہ۔ یہ ملک تو رفیق بیچارے کو بھی دھر لیتے۔

''دیکھ جمالے، ہم سے ہوشیاری کی تو بہت برا ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ سچ سچ بتادے تو تیری خلاصی ہے۔ اگر تو نے جھوٹ بولا تو، تو جانتا ہے ملک کسی کو چھوڑتا نہیں۔'' پھر وہی مکروہ شکل والا آدمی بولا تھا۔

''قسم لے لو صاحب۔ مینوں پتا ہے کہ ملک لوگ ہمارے مائی باپ ہیں اور ان کے غضب کا بھی پتا ہے جی۔ اگر مجھے پتا ہوتا تو میں خود بھی ان کے ساتھ جاتا ناں کیونکہ پیچھے میں ہی ہوں جس سے ملک اعجاز نے پوچھ تاچھ کرنی

ہے۔ میں جان بوجھ کر یہاں تھوڑی بیچ رہتا۔ مجھے تو خود نہیں پتا اور مجھے تو یہ بھی اچھی طرح معلوم ہے جی کہ حمید کا شہر میں کوئی یار بھی نہیں تھا۔ وہ تو شہر جاتا ای نہیں تھا جی۔ وہ تو یہیں پیدا ہوا اور یہیں اسی گاؤں میں بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس کا کوئی دور پرے کا رشتے دار بھی نہیں تھا بس وہ اس کی گھر والی، گھر والی کی بہن اس کے بچے بیٹی اور پھر میں اس کا بچن۔ بس اس سے آگے تو کوئی تھا بھی نہیں اور گل مینا تو گھر سے بھی نہیں نکلی تھی جی۔ وہ کہاں جائے گی۔ اسے تو گاؤں کی دو تین گلیوں کے علاوہ کچھ راستہ پتا ای نہیں۔ وہ تو اپنی ماسی کے گھر بھی نہیں جاتی تھی۔ مجھے نہیں پتا جی۔ قسم لے لو۔" وہ ہاتھ جوڑے بول رہا تھا۔

"ہنہ......" ملک اعجاز نے سر ہلایا۔

"گل مینا کے پیچھے تو لوگ لگا دیے ہیں، وہ بھاگ کر کہاں جائے گی۔" جمال دین کے چہرے پر پسینا آ گیا۔

"یہ بتا حمید کا ہونے والا جمائی کہاں رہتا ہے شہر میں؟"

"وہ بھی نہیں پتا جی۔ اس کا پتا تو کسی کو بھی نہیں معلوم، وہ پندرہ دن میں ایک دن کے لیے آتا ہے۔ سنا ہے کسی فیکٹری میں کام کرتا ہے، اس بار اس نے دیر سے آنا تھا اپنے ویاہ کی تیاری کر رہا تھا جی۔" جمال دین کا لہجہ دھیما تھا۔

"اوئے بکواس کرتا ہے۔ ایسے کیسے اس کا پتا نہیں معلوم کسی کو۔" اس بار ملک ایاز نے آگے بڑھ کر قدرے غصے سے کہا تھا۔

"سچ کہہ رہا ہوں چھوٹے ملک جی، میرے ماں باپ کی قسم اس کو تو کچھ پتا وی نہیں جی۔ آپ کسی کی بھی قسم لے لو۔ میں جھوٹ نہیں کہہ رہا۔ میں بھی یہیں ہوں گاؤں میں۔ وہ آنے والا ہے۔ آپ خودی پوچھ لینا اس سے سرکار۔" جمال دین ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔

"سوچ لے جمالے اگر کہیں سے بھی کوئی سراغ لگا اور تو جھوٹا نکلا تو نا تیری اس سفید داڑھی کا خیال کروں گا نہ تیری بوڑھی ہڈیوں کا اتنی کٹ لگاؤں گا کہ تیری ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔ الٹا لٹکا کر مرچوں کی دھونی لگاؤں گا۔ اب بھی وقت ہے سچ اگل دے اگر تجھے گل مینا کا پتا ہے تو بتا دے ورنہ بہت پچھتائے گا تو۔" ملک ایاز غصے سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"نہیں جی چھوٹے ملک جی۔ میری توبہ جی۔ مینوں کچھ وی نئی ملوم۔ وہ کہاں ہے، کس حال میں کس کے پاس ہے۔ مجھے کچھ نہیں ملوم جی۔ مجھے پتا ہوتا تو میں ضرور بتاتا۔" جمال دین گڑگڑایا تھا۔

"بڑے ملک جی، ہم نے آس پاس کے گاؤں چھان مارے، کہیں بھی چھوری کا پتا نہ لگا، شہر تک کے راستے دیکھ آئے۔ کہیں بھی کوئی پتا نہ لگا جی، پتا نہیں کہاں چلی گئی وہ۔" اسی لمحے دو اونچے قد کے گھنی داڑھی اور مونچھوں والے آدمی اندر آئے اور ملک اعجاز کو مخاطب کیا تھا۔

"تم سب کے سب ناکارہ اور نمک حرام ہو۔ ایک چھوری کو نہ ڈھونڈ سکے اور وہ تم سب کو چکمہ دے کر کہاں مر کھپ گئی۔ کسی کو پتا ہی نہیں ہے۔" ملک اعجاز غصے سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"یہ کمی کمین اور نیچ ذات کے لوگ ہیں ملک جی، اچھا ہوتا کہ جیسے چھوٹے ملک کو وہ بھائی تھی تب ہی اس کو اٹھا لاتا۔ کیا ضرورت تھی یہ سب کرنے کی۔ وہ اس قابل نہیں تھے، اپنی اوقات دکھا دی ناں کنجروں نے۔" ملکانی جو پردے کے پیچھے تھی، وہیں سے بولی تھی۔

"اگر گاؤں کی نہ ہوتی تو اٹھوا لیتا اس کو۔ شہر میں کئی ایک لڑکیاں آئی گئیں میرے آگے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ کم ذات۔ کم حیثیت اور حرام زادی یہ سب کرے گی۔" ملک ایاز غصے سے پھنکارا تھا۔

"اوئے میرے پتر......دل خراب نہ کر، گولی مار اسے اور تجھے کیا کمی ہے لائن لگا دوں گی تیرے واسطے کیوں جھلا ہوتا ہے اس کمینی کے پیچھے۔" ملکائن پھر بولی تھی۔

"اماں میں پاگل اس کے لیے نہیں ہوں۔ اب وہ میری ضد بن گئی ہے، اس کو گھسیٹ کر سارے گاؤں کی سامنے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کروں گا۔ اس کی محبت گئی بھاڑ میں۔ ایک بار وہ مل گئی تو ایسا حشر کروں گا کہ سات

پشتیں یاد رکھیں گی۔" ملک ایاز کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ جمال دین کانپ رہا تھا۔

"اللہ پاک رحم کرنا۔" وہ دل ہی دل میں دعا کررہا تھا۔

"جا جما لے تو جا لیکن کان کھول کر سن لے کہ اگر تو نے اس حرام زادی کے لیے کچھ کیا یا کچھ غلط بولا۔ اس کا ساتھ دیا تو تجھے کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔" ملک اعجاز نے جمال دین کو مخاطب کرکے غضب ناک لہجے میں کہا تھا۔

"جی سرکار جی۔" جمال دین تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ اس کا دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔ انجانا خوف آس پاس منڈلا رہا تھا، خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ دو موت ہوچکی تھیں ہنستا بستا گھر اجڑ چکا تھا مگر اب بھی ملکوں کے کلیجے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ نہ جانے اب کون سی قیامت آنے والی تھی۔ اب کون سا طوفان آنے والا تھا۔ جمال دین دل ہی دل میں ڈرتا ہوا اپنے گھر کی سمت چل دیا تھا۔

❀......❀......❀
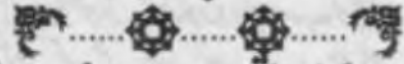
یہ خانہ بدوشوں کی بستی تھی، شہر سے کافی دور زیر تعمیر پل کے نیچے، خانہ بدوشوں نے عرصہ سے ڈیرہ ڈال رکھا تھا بستی کے کچھ لوگ چھوٹی موٹی چیزیں مثلاً گاڑی صاف کرنے کے ڈسٹر، ٹشو پیپر، رنگ برنگی ٹافیاں، کاغذ کے رنگین کھلونے بیچ کر گزارا کرتے اور کچھ لوگ روڈ پر جاکر بھیک مانگ کر گزارا کرتے تھے۔ بانس کی تیلیوں اور چٹائیوں سے بنا یہ عارضی ٹھکانہ تھا، ایک عرصہ ہوگیا تھا کہ پل کا کام یونہی ادھورا پڑا تھا۔ شہروں سے ملحقہ ایریا اور شہروں کا یہی وطیرہ تھا خاص طور پر کراچی میں تو تعمیراتی کام کے سلسلے برس ہا برس جاری رہتے، کئی بار تو ایسا ہوتا کہ جو کام مستری اور مزدور شروع کرتے وہ ان کی وفات کے دس دس سال بعد جاکر مکمل ہوتا، کچھ حکومت کی نااہلی اور کچھ اداروں کی لاپروائی اور کھاتوں نے سارا نظام درہم برہم کرکے رکھ دیا تھا۔ یہی حال اس پل کا بھی تھا جس نے کام شروع کروایا تھا وہ انجینئر تو حکومت کے بدلی ہونے پر معطل ہوکر بیٹھ گیا تھا اور کام بھی اس کی معطلی کے ساتھ کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ اس بستی میں شریفاں بھی رہتی تھی۔

شریفاں اور اس کا شوہر بشیرا دھیڑ عمر کے تھے اولاد کی نعمت سے محروم، یہ لوگ رنگین کاغذوں سے کھلونے بنا کر فروخت کرتے تھے، کھلونے خریدنے کے لیے آس پاس بچوں کا ہجوم جمع ہوجاتا یہ شریفاں کو بھلا لگتا تھا۔ وہ بچوں سے بہت پیار کرتی تھی۔ اس روز بھی حسب معمول صبح صبح شریفاں جاگی، چولھا جلانے کے لیے آئی تو لکڑیاں کم تھیں۔

"کل بشیر کو بولا تھا کہ لکڑیاں لے آ مگر بھول گیا ہوگا۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی جھونپڑے سے باہر نکلی تاکہ آس پاس کی سوکھی جھاڑیوں سے کم از کم چائے بنانے کو کچھ لکڑیاں مل جائیں۔ ابھی چند قدم چلی تھی کہ اچانک اس کی نظر جھاڑیوں میں پڑی کالی چھوٹی سی گٹھڑی پر پڑی۔ ہائے وہ ڈر گئی۔ شہر میں آئے دن بم پھٹتے رہتے تھے ڈرتے ڈرتے گٹھڑی کی طرف آئی تو اسے بڑی سی سیاہ چادر کے اندر سے سفید نازک پیر نظر آئے چپلوں سے بے نیاز زخمی اور مٹی میں اٹے پیر دیکھ کر وہ ڈر کے مارے واپس جھونپڑے کی طرف دوڑی۔

"بشیرے......بشیرے اٹھ دیکھ تو جھاڑی میں لڑکی کی لاش پڑی ہے۔" مارے گھبراہٹ کے آواز اس کے حلق میں پھنس رہی تھی۔

"پگلا گئی ہے کیا، صبح صبح کیا بکے ہے۔" بشیرا جو ابھی ابھی جاگا تھا جھنجلا کر بولا اور مندی مندی آنکھوں سے شریفاں کے خوف زدہ چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

"اٹھ بشیرے تو خود چل کر دیکھ لے۔ سچی میں لڑکی کی لاش پڑی ہے۔ زخمی ہے، بہت۔ اس کے پاؤں نظر آرہے ہیں۔ چادر میں لپٹی پڑی ہے۔ جا جاکر اقبال کو اٹھا وہ پولیس کو خبر کرے۔ پتا نہیں کس نے اس کو مارا ہے۔ میرا تو جی گھبرا رہا ہے بشیرے۔ پتا نہیں کون ہے بے چاری۔ ہماری بستی کی تو نہیں لگے ہے۔ شہر میں تو ایسے ہوتا ہے ناں۔ ہائے ربا رحم کرنا۔" شریفاں خوف سے کانپنے لگی تھی۔

"اری چپ کر، بولے جاتی ہے ریل کی طرح، رک جا

ذرا میں دیکھ تو لوں۔" بشیرا نے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔
"میں کہتی ہوں بالے کو بلا لے اکیلے مت جا۔" شریفاں بدستور ڈری ہوئی تھی۔
"چپ کر۔" بشیرا نے اسے بری طرح گھر کا اور جھونپڑی کے دروازے سے باہر نکل آیا۔ ابھی تو پوری طرح سے روشنی بھی نہیں ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر کو تو بشیرا کو بھی خوف محسوس ہوا لیکن وہ اللہ کا نام لے کر آگے بڑھا۔ ڈرتے ڈرتے شریفاں بھی پیچھے ہولی۔ صبح کی ہلکی ہلکی خنکی اور ہلکی ہلکی ہوا نے اس کے چہرے کی طرف سے چادر سرکا دی تھی۔
"یہ...... یہ تو سوہنی سی کڑی ہے شریفاں دیکھ تو۔" بشیرا نے اس کی جانب جھکتے ہوئے کہا۔ گٹھڑی میں ہلکی سی جنبش ہوئی تھی۔
"اوئے یہ زندہ ہے شریفاں، یہ کڑی زخمی ہے، بہت، جلدی سے آ اسے اٹھا۔" بشیرا زور سے چلایا تو شریفاں آگے آئی۔ شریفاں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔
"یہ بہت زخمی لگتی ہے بشیرے دیکھ تو۔ اس کے منہ پر بھی زخم لگے ہیں۔ یہ جھاڑیوں میں کانٹوں سے زخمی ہوئی ہے۔ بشیرے آ جا اسے اٹھا میرے ساتھ۔" بشیرا مٹی کے کٹورے میں مٹکے سے پانی لے آیا اور گل مینا کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ ایک بار دو بار اور تیسری بار گل مینا نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ دفعتاً خود پر شریفاں کو جھکا ہوا دیکھا، ایک لمحے کو آنکھیں پٹپٹا کر موقع کی نزاکت اور جگہ کا تعین کیا، تب اچانک ذہن میں گاؤں کی کل رات کی ہولناک اور خوفناک رات گھوم گئی۔ خوف زدہ دہشت کے مارے تین نفوس۔ ملک کے پالتو نوکر، کھیت اور فائر کی تیز آواز ساتھ ہی۔ خون میں لت پت۔
"اف نہیں اماں...... ابا۔ مجھے جانے دو۔ تم کون ہو؟ معاف کردو۔ مجھے معاف کردو۔" گل مینا بجلی کی سی تیزی سے اٹھی اور خوف زدہ ہو کر دونوں ہاتھ چلاتی ہوئی اٹھنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ وہ بھاگنا چاہتی تھی۔
"اف......" تکلیف کی شدت سے ایڑی سے خون نکل آیا تھا۔
"بچی۔ یوں پریشان نہ ہو۔ تو کہاں سے آئی ہے؟ زخم کیسے لگے تجھے؟ ہم تجھے ماریں گے نہیں تو پریشان نہ ہو بیٹی، تو بہت زخمی ہے۔ ہم سے ڈر نہیں۔ ہم غریب لوگ ہیں۔" شریفاں اس کی ہذیانی حالت دیکھ کر پیار سے سمجھانے والے انداز میں بولی۔ وہ سمجھ گئی کہ یقیناً کوئی مظلوم لڑکی ہے کسی کے ظلم کا شکار ہو کر آئی ہے۔ گل مینا جو گھٹنوں میں منہ دے کر سہمی بیٹھی تھی۔ آہستہ سے سر اٹھایا ایک بے بس سی نظر شریفاں پر ڈالی اور پھر بے ہوش ہوگئی تھی۔ شریفاں نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ اس کے سرخ و سفید چہرے پر آنسوؤں کے نشانات واضح تھے۔ خوب صورت آنکھوں کے پپوٹے مسلسل رونے کی وجہ سے سوج گئے تھے۔ چہرے پر جھاڑی میں لگے کانٹوں سے جگہ جگہ زخم تھے۔ اس کے لمبے سیاہ بالوں کی چوٹی مٹی میں اٹی ہوئی تھی۔ پیروں میں چپل نہ تھی اس کے کپڑوں میں بھی کانٹوں سے سوراخ ہو گئے تھے سیاہ چادر مٹی اور دھول سے میلی ہو گئی تھی۔
"ہائے پتا نہیں کون ہے، بے چاری کس صدمے کے مارے ایسی ہو گئی ہے، نہ جانے کیا ہوا ہے اس کے ساتھ شیرے، اس کو جھونپڑے میں لے کر چلتے ہیں۔" شریفاں کو اس سے ہمدردی ہو رہی تھی۔
"او پاگل ہو گئی ہے کیا، پتا نہیں کون ہے، کیا کر کے آئی ہے؟ میں پولیس کو اطلاع دے دوں گا پڑا رہنے دے یہاں اس کو۔" بشیرا نے شریفاں کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش کی تھی۔
"بشیرے جوان جہان لڑکی ہے۔ کیا پتا کس مشکل میں ہو۔ ہم اس کو ایسے کیسے چھوڑ دیں۔ کس ماں کی بیٹی ہے یہ بھی۔ اس کو ہوش میں آنے تک تو رک جا۔ ہم اس سے پتا کریں پھر چاہے پولیس کو بتا دو مگر تھوڑا صبر رکھ لے بشیرے۔ اتنی جلدی نہ مچا۔ ابھی تک کوئی جاگا بھی نہیں چل اس کو لے کر چلتے ہیں اندر۔ بے چاری پتا نہیں کب سے اس حالت میں پڑی ہے۔ اتنی خوب صورت بھی

ہے۔ ایسے ویسے ہاتھوں میں لگ گئی تو......" شریفاں کا دل ہول گیا تھا۔

"اچھا...... اچھا چل۔" بشیرا نے اس کو سہارا دیا اور اپنے جھونپڑے میں لے آیا، ساتھ ہی باہر لگا ہوا ٹاٹ کا پردہ بھی ڈال دیا۔ روشنی ہونے لگی تھی اب سب نے ہی اٹھنا تھا۔ جھونپڑے میں آئی تو ایک بار پھر گل مینا نے آنکھیں کھولیں وہی مہربان چہرہ سامنے تھا۔

"میں کہاں ہوں، تم کون ہو اور وہ لوگ کہاں ہیں؟" وہ دوبارہ گھبرائے لہجے میں مخاطب ہوئی اور آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہی تھی یہ ماحول اس ماحول سے یکسر مختلف تھا جو اس کے ذہن میں آسیب کی طرح چمٹا ہوا تھا۔

"ہم لوگ یہاں ڈیرے میں رہنے والے لوگ ہیں، غریب ہیں مگر سب ہمدرد اور محبت کرنے والے ہیں۔ میں صبح جھونپڑے سے نکلی تو تجھے جھاڑیوں میں بے ہوش دیکھا۔ میں سمجھی کہ کوئی لاش ہے پھر میں نے اپنے گھر والے کو جگایا۔ ہم نے تجھے پانی ڈالا۔ تو ہوش میں آئی تو، تو ڈر کے پتا نہیں کیا کیا بول کے پھر بے ہوش ہوگئی تھی۔ تو کون ہے، کہاں سے آئی ہے اور کہاں جانا ہے؟ اور ایسے یہاں بے ہوش کیسے ہوئی؟ کسی کی تلاش ہے تجھے؟ ہمیں بتا تو شاید ہم تیری مدد کرسکیں۔"

"مجھے کہاں جانا ہے"؟ وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"ہائے ربا پتا تو ابا کے پاس تھا...... ہائے ربا۔" وہ رونے لگی۔ "ابا کو تو انہوں نے مار دیا۔ اماں ہائے میری اماں۔ اس کی چیخ، ہائے کتنی زور سے چیخی تھی وہ اور پھر مرگئے دونوں۔ میں بھاگی، میں رونے لگی اور بھاگی۔ ہائے کتے ظالم کتے۔ وہ شیطان ہیں وہاں۔" وہ زاروقطار رونے لگی تھی۔

"مار دیا...... میرے ابا اور اماں کو مار دیا۔ وہ بھیڑیے......" دیوانوں کی طرح ایک بات دہراتے ہوئے وہ زاروقطار رو رہی تھی۔ شریفاں ہمدردی سے اسے دیکھ رہی تھی، اسے ترس آرہا تھا۔

"یہ لے پانی پی لے اور آرام سے تھوڑی دیر سانس لے لے۔ پریشان نہ ہو۔ یہاں تو محفوظ ہے۔ کوئی نہیں آئے گا یہاں تو آرام سے ہمیں سب کچھ صحیح صحیح بتادے۔" بشیرا جو باہر ہی کھڑا تھا اندر آکر پانی کا کٹورہ اس کی طرف بڑھا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ملائمت سے بولا تو گل مینا نے کٹورہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور ایک ہی سانس میں غٹاغٹ سارا پانی پی گئی۔ پانی پی کر اس کے حواس بحال ہوئے اور شریفاں اور بشیرا کے ہمدردانہ رویے نے کچھ ہمت بندھائی۔ گل مینا نے آہوں اور سسکیوں کے ساتھ سارا قصہ لفظ بہ لفظ سنا دیا تھا کہ گزشتہ رات وہ کس عذاب کی منزلوں کو طے کرکے یہاں تک پہنچی تھی۔ اس کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا بنا راستے کا تعین کیے وہ بس اندھا دھند اندھیرے میں بھاگی چلی جارہی تھی اور کب گری یہ بھی پتا نہیں چلا اور وہ تو اپنے چاچا کے کسی دوست کے گھر جانے والی تھی اور وہ پتا بھی حمیدے کی جیب میں تھا۔ وہ لوگ بھوکے بھیڑیے ہیں۔ وہ مجھے بھی ماردیں گے۔" وہ مسلسل رو رہی تھی۔ شریفاں اس کی داستان سن کر خود بھی رونے لگی تھی جبکہ بشیرا چپ چاپ سن رہا تھا، وہ کچھ کچھ شاکی بھی تھا۔ آج کل کے حالات بھی ایسے نہ تھے کہ کسی پر بھروسہ کرلیا جاتا۔ وہ جوان تھی، حسین تھی، نہ جانے اصل کہانی کیا تھی؟ وہ سوچوں میں غلطاں تھا۔

"کیا ہوا بشیرے؟" شریفاں اسے دیکھ رہی تھی۔

"شیرفاں اس کو ناشتہ دے پتا نہیں کب سے بھوکی ہوگی۔ منہ دھلوا دے اس کا۔ میں نے لکڑیاں باہر رکھ دی ہیں چولھا جلا کر چائے بنا لے میں پاپے لے کر آتا ہوں۔" بشیرا نے کہا اور پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا تھا۔

"تو ادھر ہی منہ دھولے۔ یہیں بیٹھ میں چائے لے کر آتی ہوں۔" شریفاں نے اس کو مگے میں تھوڑا سا پانی دے کر کہا اور خود چھوٹے سے صحن کی طرف بڑھ گئی جہاں مٹی کا چولھا رکھا ہوا تھا۔ ساتھ ہی سلور کے کچھ کالے برتن پڑے تھے۔ گل مینا نے منہ پر پانی مارا، ہاتھوں کو اچھی طرح سے رگڑ کر دھویا اور چادر سے ہاتھ منہ صاف کرکے

چھلنگا سی چارپائی پر بیٹھ گئی اور چھوٹے سے کمرے کا جائزہ لیا، چٹائی اور سرکنڈوں سے بنا یہ عارضی کمرہ جس کو موٹے سے کپڑے سے کور کردیا گیا تھا۔ دروازے کی جگہ لکڑی کی جالی تھی جس پر ٹاٹ کا میلہ پردہ لٹکا ہوا تھا۔ ایک جھلنگا چارپائی جس کی بان جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی تھی۔ ایک میلہ سا گدا، لحاف اور دو تکیے، پرانا زنگ آلود ٹین کا صندوق اور کونے میں ڈھیر سارے رنگین کاغذ چھوٹی چھوٹی لکڑیاں، ماچس کی ڈبیاں اور ایک ٹوٹے ہوئے سلور کے ٹیڑھے برتن میں غالباً آٹے کی لئی تھی۔ جو سوکھ کر پپڑی ہوگئی تھی۔ وہیں پر چھوٹی سی پھٹی ہوئی دری بچھی تھی جس پر بہ مشکل دو افراد بیٹھ سکتے تھے۔ کونے میں پانی کا مٹکا اور اس پر مٹی کا کٹورہ دھرا تھا۔

”یا اللہ، میں کیسے رہوں گی۔؟ رفیق چاچا کا پتا کیسے ملے گا؟ اتنے بڑے شہر میں، میں اکیلی کہاں کہاں پھروں گی۔ شہزاد......“ اس کے لبوں سے آہ کی صورت نکلا۔ ”ہائے شہزاد تو کہاں ہے۔ دیکھ تو تیری مینے کا کیا حال ہوگیا ہے۔“ اسے پھر سے رونا آیا۔

”چل یہ کھالے اور پریشان نہ ہو رب کچھ نہ کچھ بھلا کرے گا۔“ سلور کی ٹیڑھی میڑھی تھالی پر دو گول چھوٹے سائز کے پاپے اور مٹی کے کپ میں چائے لاکر شریفاں نے سامنے رکھ دی تھی۔

”اے گل مینا چل میری دھی اٹھ جا دیکھ تیرا ابا تیرا انتظار کررہا ہے میں نے پراٹھے بنا دیئے ہیں ٹھنڈے ہورہے ہیں۔“ اس کے کانوں میں بختاں کی ملائم آواز گونجی۔ اس کی آنکھوں کے آگے آنسو ایک بار پھر مچل اٹھے بھوک سے برا حال تھا کل سے کچھ کھایا پیا بھی نہ تھا اوپر سے شدید تھکن اور اتنا بڑا صدمہ۔

”کھالے پتر۔“ شریفاں نے دوبارہ کہا تو اس نے پاپا اٹھا کر چائے میں ڈبویا اور بہ مشکل حلق سے اتارنے لگی۔ آنسوؤں کے ساتھ ساتھ وہ ناشتے کو زہر مار کرتی رہی۔ شریفاں برتن سمیٹ کر باہر نکلی۔

”دیکھ شریفاں اب اس کو بول تیار ہوجا میں اور تو تھانے چل کر اسے پولیس کے حوالے کرآتے ہیں میں کوئی رکشہ وکشہ دیکھتا ہوں۔ واپسی میں کاغذ بھی لیتے آئیں گے ختم ہونے لگا ہے۔“ بشیرا کی آواز اندر تک آگی تھی۔ پتا نہیں شریفاں نے آہستہ سے کیا کہا تھا۔

”پاگل ہوئی ہے تو۔ بچوں کی طرح سے بات کرتی ہے۔ تجھے کیا پتا وہ سچی ہے کہ جھوٹی۔ پتا نہیں اسے تجھے کیا ہمدردی بہت مہنگی پڑ جاتی ہے۔ کبھی ہم پہ کوئی مصیبت آجاوے نہ جانے کہاں سے بھاگ کر آئی ہے۔ چوری کرکے بھاگی کہ قتل کرکے بھاگی ہے۔ اتی خب صورت تو......“ آگے نہ جانے کیا کہا تھا آواز دھیمی پڑگئی تھی۔

”اف......“ گل مینا کا دل کسی نے مٹھی میں لے کر جکڑا تھا۔ اس کے کردار پر شک کیا جارہا تھا۔ اس کو مشکوک سمجھ کر باتیں ہورہی تھیں۔ اس کی برداشت جواب دینے لگی وہ پردہ اٹھا کر باہر آگئی اور بشیرا کے پیروں کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔

”چاچا تو میرے باپ کی جگہ ہے، میرے باپ جیسا ہے۔ میں اپنے مرے ہوئے باپ کی قسم کھاتی ہوں۔ اپنی ماں کی تڑپتی ہوئی لاش کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ مجھے۔ ایسا ویسا نہ سمجھنا۔ میں شریف لڑکی ہوں۔ میں نے جو کچھ سنایا ایک ایک لفظ سچ ہے تو چاہے تو مجھ سے قرآن اٹھوالے۔ میری تو شادی ہونے والی تھی۔ میرا شہزاد تو یہیں رہتا ہے شہر میں کام کرتا ہے وہ۔ وہ تو شادی کے لیے آنے والا تھا کہ یہ سب کچھ ہوگیا۔ اللہ کی قسم ہے چاچا۔ میں مرجاؤں گی۔ کہیں جاکر خودکشی کرلوں گی مجھے پولیس میں نہ دے۔ ملک لوگ مجھے لے جائیں گے۔ میں خود یہاں سے چلی جاؤں گی۔ میرے کو بری لڑکی نہ سمجھ چاچا۔ میرے مرے ہوئے ماں باپ کی روح تڑپ جائے گی۔“ وہ بلک رہی تھی۔ بشیرا جو پہلے ہی پیروں کو سمیٹ چکا تھا اس کی ساری باتیں خاموشی سے سن رہا تھا۔ بشیرا کی آنکھوں میں بھی نمی آگئی تھی۔ اس کو بھی گل مینا کی باتوں میں سچائی لگی تھی۔ کوئی بھی لڑکی یوں ماں باپ کی قسم کیسے کھا سکتی ہے۔ اس کا بلکنا، تڑپنا اور یوں رو رو کر ہلکان ہونا اس کی شرافت اور

سچائی کی گواہی تھے۔ شریفاں نے آگے بڑھ کر اسے کاندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور سینے سے لگا لیا تھا۔

''بشیرا...... اللہ کا واسطہ ہے تجھے۔ اس کو پولیس میں نہ دے۔ سچ کہتی ہے یہ اگر ان لوگوں نے اسے دیکھ لیا تو مار دیں گے۔''

''شریفاں تو کیا اس کو ہم رکھ لیں گے؟ اگر اس کو پولیس میں نہ دیں تو پھر۔ اس کے پاس تو کسی کا پتا بھی نہیں۔ گاؤں یہ جا سکتی نہیں تو پھر کیا حل ہوگا؟'' بشیرا نے شریفاں کو غور سے دیکھ کر کہا تھا۔

''بشیرے دیکھ...... بشیرے رب نے ہمارے لیے یہ تحفہ بھیجا ہے۔ سمجھ لے اس نے ہمیں اولاد دی ہے۔ میرا دل کہتا ہے یہ اچھی اور نیک لڑکی ہے۔ ہم اس کو اپنے پاس رکھ لیں گے بشیرے۔ اس کو بیٹی بنالیں گے۔'' شریفاں کے لہجے میں یاسیت تھی۔ اولاد نہ ہونے کی کمی کا احساس جو ہر وقت اسے تڑپاتا رہتا تھا۔

''پاگل ہوگئی ہے۔ جوان بیٹی یوں اچانک سے لوگ کیا بولیں گے۔ سب لوگ شک کریں گے ہم پر۔'' بشیرا نے اس کی بات مسترد کردی تھی۔

''دیکھ بشیرے تو ٹھنڈے ہو کر میری بات غور سے سن۔ میں یہاں بستی میں کہہ دوں گی کہ یہ میری بہن کی کڑی ہے۔ بہن مرگئی تو یہ میرے پاس آگئی۔ یہاں پر بھلا کون ہمارے رشتے داروں کو جانتا ہے اور یہ ویسے بھی پردہ کرتی ہے۔ اسے کوئی دیکھ بھی نہ پائے گا بس۔ تو ہاں کردے بشیرے، یہ میری خواہش مان لے۔'' شریفاں نے عاجزی سے بشیرا کے ہاتھ تھام کر التجائیہ انداز میں کہا۔ بشیرے نے کچھ دیر سوچا پھر ہار مانتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ یہ ہماری بیٹی بن کر یہاں رہے گی مگر......''

''مگر کیا؟'' شریفاں کے ساتھ ساتھ گل مینا نے بھی اس کی طرف دیکھا تھا۔

''مگر...... گل مینا یہ بات اچھی طرح ذہن میں بٹھالے کہ تجھے اللہ کے نام پر ہم اپنی بیٹی بنا کر رکھیں گے اور تو کبھی بھی ہمیں اپنے فیصلے پر شرمندہ ہونے کا موقع نہ دینا۔ ایسا نہ ہو کہ ہمیں کل کو تجھے لے کر افسوس ہو کہ ہم نے غلطی کی تھی۔'' بشیرا نے گل مینا کو مخاطب کیا تھا۔

''میں خود مجبور ہے بس اور غم کی ماری ہوں میں بھلا کیا کروں گی۔ بس مجھے شہزاد کو ڈھونڈنا ہے۔ اس میں میری مدد کردینا۔ ابھی مجھے صرف پناہ چاہیے۔ ایسی پناہ جہاں مجھے ڈر نہ ہو۔'' گل مینا کا لہجہ مایوس کن تھا۔

''اب تو فکر نہ کر، ہم نے تجھے بیٹی بولا ہے تو اللہ کی قسم بیٹی ہی سمجھیں گے، تیرا ہونے والا گھر والا تجھے مل جائے دعا بھی کریں گے اور کوشش بھی۔ بس تو بے فکر ہو کر رہ اور ہاں۔ یہاں پر میں سب سے یہی بولوں گی کہ تو میری مری بہن کی بیٹی ہے۔ تجھے کسی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' شریفاں نے اس کے پاس آ کر ملائمت سے کہا تو بشیرا نے بھی آگے بڑھ کر اس کے سر پر دونوں ہاتھ رکھ دیے تھے۔

''پتر تجھے بیٹی بولا ہی نہیں دل سے مانوں گا بھی تو بالکل فکر نہ کرنا۔ اپنا گھر سمجھ کر جہاں ہم رہیں ہمارے ساتھ رہنا۔'' شریفاں اور بشیرا کی آنکھیں بھی بے ساختہ بھیگ گئی تھیں۔

کہتے ہیں اللہ پاک ایک در بند کرتا ہے تو دوسرا کھول دیتا ہے۔ وہ جن حالات سے گزر کر یہاں تک آئی تھی اور آگے کا سوچ کر پریشان ہو رہی تھی اللہ کی طرف سے وہ مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا مگر وہ باہر نکلنے کا سوچ کر خوف زدہ ہو رہی تھی تو گھبراتی کیوں ہے یہ کپڑے اتار کر میرے کپڑے پہن لے اور سر پر چادر کو ہمیشہ لپیٹے رکھنا کہ منہ بھی چھپا رہے۔ یہاں پر کوئی کسی پر دھیان نہیں دیتا۔ سب لوگ اپنے اپنے روٹی پانی کے چکر میں لگے رہتے ہیں۔ آج یہاں تو کل وہاں۔ ہمارا تو کام ہی گھومتے رہنا ہے۔'' شریفاں نے کہا تو گل مینا سر ہلا کر رہ گئی۔

''اس بار تو یہاں پر لمبا پڑاؤ ہو گیا ہمارا۔'' بشیرا بھی بولا تھا۔

"اچھا شریفاں میں ذرا کاغذ لے آؤں۔" بشیرا نے قمیص کی آستین سے چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا تو شریفاں نے اثبات میں سر ہلایا۔ بشیرا باہر کی طرف چل دیا تب شریفاں نے اس کو بتایا کہ اس کی شادی کو بہت سال ہوگئے ہیں اللہ نے بے اولاد رکھا ہے اور وہ لوگ رنگین کاغذوں سے مختلف چیزیں بناتے ہیں اور دونوں میاں بیوی وہ کھلونے لے کر بڑی روڈ کی طرف جاتے ہیں وہاں پر ایک چھوٹا سا بازار تھا اور گاڑیاں بھی آتی جاتی تھیں روڈ کے دوسری طرف سوسائٹی تھی جبکہ روڈ کے اس طرف پان کے کھوکھے، چائے کے ہوٹل، چھوٹا سا بازار اور بڑا سا میدان تھا، وہیں جاکر بستی کے بیشتر لوگ تھوڑا بہت روپیہ کما لیتے، بازار سے کھانے پینے کی چیزیں لے کر شام ڈھلنے سے پہلے لوٹ آتے۔ گل مینا نے بھی شریفاں اور بشیرا کے ساتھ رنگین کاغذ کے ہاتھ کے پنکھے، پھرکیاں، بچوں کے ہوا سے چلنے والے پنکھے اور مختلف چیزیں بنانا سیکھ گئی تھیں۔ صبح صبح ناشتے سے فارغ ہوکر وہ تینوں گھر سے نکل جاتے۔ اپنے آپ کو پوری طرح سے رنگین چادر میں چھپائے صرف سوراخوں کے ذریعے آنکھیں کھولے گل مینا ہر طرف، ہر راستے پر بس شہزاد کو ڈھونڈتی تھی۔ اس کا دل چاہتا کہ کبھی روڈ کے اس طرف سے، کبھی بازار کے اندر سے، کسی رکشے کے پاس، کسی بس کے اندر کہیں بھی شہزاد کی ایک جھلک نظر آجائے۔ وہ ہر صبح امید لے کر گھر سے نکلتی اور سہ پہر کو ٹوٹی ہوئی امید کے ساتھ لوٹ آتی۔ کبھی کبھی اس کو شدت سے اماں، ابا، صغرا خالہ اور ستارہ، جمال چاچا کی یاد آجاتی ان کے ساتھ گزارے وقت کی خوب صورت یادوں میں کھو جاتی۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے تب شریفاں اسے سمجھاتی، وہ خود بھی دکھی ہوجاتی۔ تقدیر اسے کہاں سے کہاں لے آئی تھی۔ رنگین کاغذوں کے درمیان بیٹھی جب وہ آنسو بہاتی تو گرنے والے آنسو بھی کاغذ کے ساتھ رنگین ہوجاتے مگر زندگی ویسی ہی تھی بے رنگ پھیکی اور امید اور آس پر گزارے جارہی تھی۔

❀……❀……❀

شہزاد گاڑی سے اترا آج وہ بہت خوش تھا۔ وہ گل مینا کے ساتھ ساتھ ستارہ کے لیے بھی بہت ساری چیزیں لے کر آیا تھا۔ وہ اچانک سے آیا تھا۔ گل مینا سے ملنے کو بے چین تھا۔ پہلی بار وہ ایک ماہ بعد لوٹا تھا اور اس ایک ماہ میں کتنی بار دل کی تمام تر شدتوں سے مینا کو یاد کیا مگر یہ سوچ کر آپ ہی آپ مسکرا دیتا کہ اب کی بار تو گل مینا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے پاس آنے والی تھی۔ کبھی نہ جانے کے لیے اور پھر بہت جلد وہ سب لوگ شہر لوٹ جاتے۔ کتنے ڈھیر سارے ارمان لیے، آنکھوں میں خوب صورت خوابوں کو سجائے وہ گھر کی سمت جارہا تھا۔

"بس اماں اور ستارہ سے ملتے ہی گل مینا کے پاس جاؤں گا۔ وہ یقیناً مجھ سے ناراض ہوگی پھر اسے مناؤں گا۔" وہ آپ ہی آپ مسکراتے ہوئے گھر میں داخل ہوا۔ حسب معمول ستارہ صحن کے اس کونے میں نظر نہیں آئی جہاں ہمیشہ شام کے اس وقت باورچی خانے کے پاس بنے مٹی کے چبوترے پر بیٹھی اپنی گڑیا سے کھیل رہی ہوتی اس کے سامنے چائے کا کٹورہ ہوتا اور وہ اماں کے ساتھ باتیں بھی کرتی ہوئی اور شرارتوں کے ساتھ ہنستی کھلکھلاتی نظر آتی مگر آج صحن میں خاموشی تھی۔ چولہا بند تھا۔

"اماں...... اماں۔" وہ آوازیں دیتا ہوا اندر آیا تب سامنے کے کمرے سے صغراں باہر نکلی۔ غیر متوقع اور اچانک سے شہزاد کو سامنے دیکھا۔ کچھ دیر تک صغراں اسے دیکھتی رہی پھر دیوانہ وار اس کی سمت دوڑی اور اس کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"کیا ہوا اماں، خیریت تو ہے، ستارہ کہاں ہے؟ اماں گل مینا، ماسی۔ سب ٹھیک ہیں ناں۔ کیا ہوا اماں بتا تو سہی؟" شہزاد کا دل اچھل کر حلق میں آرہا تھا۔ صغراں کا یہ غیر متوقع طور پر استقبال کرنا۔ اس کے لیے نہایت تکلیف دے تھا کہ وہ بری طرح گھبرا گیا تھا۔

"سب کچھ ختم ہوگیا شہزاد۔ تو نے اتنی دیر لگادی۔ سب ختم ہوگیا۔" صغراں پاگلوں کی طرح بول رہی تھی،

شہزاد کو سمجھ نہیں آرہا تھا اس ہوا کیا ہے؟ اس نے مٹکے سے پانی نکال کر اماں کی طرف بڑھایا۔ صغراں نے جب بات بتائی تو شہزاد شدت غم سے پاگل ہوگیا۔ اس کی کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں۔ آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

''یہ سب ہوگیا اماں۔ میں، میں وہاں پر تھا اماں، میں ملکوں کا خون پی جاؤں گا۔ اس نے اتنا ظلم کیا ہے۔ ہم انسان ہیں، کوئی جانور نہیں ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ ایسا کرے۔ میں جان سے ماردوں گا۔ تباہ کرکے رکھ دوں گا۔'' شہزاد مٹھیاں بھینچے غصے میں آپے سے باہر ہورہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی ملکوں کی بوٹیاں کردے۔

''تو کیا ان کا حشر کرے گا پتر۔ رب سائیں نے ان کو خود سزا دے ڈالی ہے۔ دیکھ تو میرا رب بھی کیسا انصاف کرتا ہے کتنی جلدی فیصلہ کرلیا۔ میری معصوم گل مینے کی بددعا نے کیسا رنگ دکھایا۔ اس واقعے کے دس پندرہ دن ہوئے ہوں گے، ملک ایاز اور ملک اعجاز شہر جارہے تھے کہ ایسا برا ایکسیڈنٹ ہوا کہ ملک اعجاز تو موقع پر ہی ختم ہوگیا اور ملک ایاز مردوں سے بھی بدتر اپاہج ہوکر بے ہوش اسپتال میں پڑا ہے۔ دیکھ لے اللہ پاک نے کیسا بدلہ دیا ہے ان ظالموں کو۔ وہ ملکانی جو کبھی پلنگ پر بیٹھی حکومت کرتی تھی آج حویلی میں فقیرنیوں کی طرح جی رہی ہے اس کے رشتے داروں نے حویلی پر قبضہ کرلیا ہے۔ اک ہی تو بیٹا تھا۔ اس کا سارا غرور، سارا نشہ اور ظلم خاک میں ملا گیا ہے۔ سر کا سائیں چھن گیا، جوان بیٹا موت کے سامنے کھڑا ہے، تو کیا سزا دے گا پتر۔'' صغراں نے کہا تو شہزاد نے ہتھیلی پر مکا مارا۔

''مگر اماں ہمارا خاندان تو اجڑ گیا ناں۔ میری گل بینا...... اماں گل بینا کہاں چلی گئی، کہاں ہوگی، کس حال میں ہوگی، یا اللہ یہ کیا ہوگیا؟ ستارہ...... ستارہ کہاں ہے اماں؟ وہ ابھی تک نظر نہیں آئی؟'' اچانک شہزاد کو ستارہ کا خیال آیا۔

''ادھر آ......'' صغراں نے اشارہ کیا وہ کمرے میں داخل ہوا۔ سامنے دری پر ستارہ خاموش لیٹی تھی۔ چپ چاپ آنکھیں کھولے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ نہ آنکھوں میں کوئی چمک تھی نہ چہرے پر وہ تاثر جو شہزاد کو دیکھ کر ابھرتا تھا۔ پارہ تیرہ برس کی وہ کھلکھلاتی اور ہرنی کی طرح اچھلتی کودتی ستارہ۔ یوں چپ پڑی تھی جیسے آس پاس کی کوئی خبر نہ ہو۔

''کیا ہوا ہے اماں اسے، اس کی طبیعت خراب ہے کیا؟'' شہزاد تڑپ کر ستارہ کے پاس پہنچا اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''پتا نہیں کیا ہوا پتر؟ اتنا بڑا دکھ دیکھ کر پہلے تو خوب روئی۔ پھر ڈر گئی۔ ہمیشہ میرے ساتھ چمٹی رہتی اور پھر یوں چپ ہوگئی۔ نہ بولتی ہے، نہ پہلے کی طرح بھاگتی دوڑتی ہے، نہ شرارتیں اور نہ وہ پیاری پیاری باتیں کرتی ہے۔'' صغراں کہتے کہتے رو پڑی تھی۔

''کسی کو دکھایا تو نے؟''

''ہاں پتر حکیم، ڈاکٹر کو عامل کو سب کو ہی دکھایا۔ جمال دین بھائی اس کو لے کر سب جگہ گئے مگر سب کہتے ہیں ڈر گئی ہے۔ خود ہی ٹھیک ہوجائے گی۔''

''یا اللہ...... ستارہ میری چندا، میری گڑیا دیکھ تو تیرا بھائی آیا ہے؟ تیرے لیے بہت ساری چیزیں لایا ہوں، بول میری لاڈو۔ سلام بھی نہیں کرے گی اپنے بھایا کو۔'' شہزاد ستارہ کو گود میں لے کر اسے زور زور سے ہلانے لگا۔ ستارہ بس ٹپ ٹپ اسے دیکھ رہی تھی۔

(جاری ہے)

من کے سچے

مدیحہ کنول سرور

"ارے آپا..... اب میں کس کس دکھ کا رونا روؤں آپ کے سامنے۔ اب خود ہی دیکھ لیں صبح سے کپڑے سکھا کر اتار کر رکھے ہوئے ہیں کسی نے یہ تک نہیں سوچا کہ چلو تہہ کر کے ہی رکھ دیں۔" صباحت شوں شوں کرتے ہوئے دوپٹے سے ناک صاف کر کے بولی۔ اب یہ الگ بات تھی کہ ایسے موقع پر آنسو آنکھ میں ایک بھی نہ ہوتا۔

"اچھا چپ تو کرو صباحت، یہ کیا تم ذرا ذرا سی بات پر رونا دھونا شروع کر دیتی ہو۔" بری قسمت بڑی آپا یعنی ندرت زہرہ کی جس کی زبان سے یہ لفظ نکل چکے تھے جیسے تیر کمان سے۔

"کیا کہا آپا؟ ذرا سی بات ہے یہ، لو بھلا بتاؤ ہڈیاں ٹوٹ گئیں میری صبح سے، پہلے کپڑے دھوئے پھر چھت پہ سوکھنے کے لیے ڈالے، اتار کر بھی میں ہی لائی، اوپر نیچے کے چکر لگا لگا کر ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔" صباحت بیگم آگ بگولہ ہو کر ندرت آپا پہ برس ہی پڑی۔ نوشی حیرت سے آنکھیں پھاڑے ان کے صاف جھوٹ پر حیران تھی۔ کپڑے تو اس نے دھلائی کیے تھے، چھت پہ بھی خود ہی پھیلا کر آئی تھی۔ اب قسمت بری تھی کہ آخری تین سوٹ بھابی کو تھما دیے کہ آپ پھیلا دیں، میں تب تک مشین دھولوں، روزینہ نے بڑی دلچسپی سے سارا ڈرامہ دیکھا اور شرارتی نظروں سے نوشی کو دیکھا جو آنکھوں آنکھوں میں اسے چپ رہنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ وہ مسکراہٹ دبا کر منظر سے غائب ہو گئی۔

"ارے نانہجارو، اب چائے تو پلا دو مارے تھکن کے برا حال ہے مگر مجال ہے جو کسی کو رتی برابر بھی پرواہ ہو۔ کوئی اپنی آپا کو بھی چائے پانی کا پوچھ لے، مجال ہے جو میرے بغیر کوئی تنکا بھی اٹھا لے۔" اسے گھنٹے بھر سے اپنی

مصروفیت اور تھکن کا رونا رونے کے بعد آخر کار خیال آ ہی گیا تھا کہ آپا مہمان ہیں۔ نوشی کچن میں آ کر چائے کا انتظام کرنے لگی۔ روزینہ چھت پہ چڑھ کر ساتھ والے گھر کے کبوتر تاڑنے لگی۔ اس کی ایک ہی خواہش تھی کہ کسی طرح کوئی کبوتر اس کے ہاتھ لگ جائے مگر کبوتر ہمیشہ اس سے چار ہاتھ آگے ہی رہتے تھے اور اس کی یہ خواہش کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو پائی، یہ الگ بات تھی کہ جب وہ ٹکٹکی باندھ کر کبوتروں کو دیکھتی تو نوید کو ہمیشہ یہ محسوس ہوتا کہ وہ شاید اسے دیکھ رہی ہے۔ وہ شرماتا، لجاتا وقفے وقفے سے اسے تکتا پر روزینہ کا دھیان اس پر ہوتا تو تف بھیج کر نیچے آ جاتی۔

❀ ❀ ❀

"اب یہ پتا نہیں کس کمبخت نے مشورہ دیا تھا کہ بوگن ویل صحن میں لگالو، سارا دن ان پھول پتوں کو اکھٹا کرتے ہی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ یہ بھی مجھ سے کوئی دشمنی نکالتے ہیں۔ دس اکھٹے کرتی ہوں، بیس اور گر جاتے ہیں۔" ہاتھ میں جھاڑو پکڑے حسب معمول بڑبڑاہٹ کے ساتھ وہ بکھرے ہوئے پھول پتے اکھٹے کررہی تھی۔ روزینہ کو پھولوں سے عشق تھا۔ چھوٹے سے صحن کو طرح طرح کے پودوں سے سجا رکھا تھا۔ بظاہر صحن میں جگہ کم تھی مگر وہ کوئی بھی پودا کاٹنے کے حق میں نہ تھی اور صباحت کو پودوں سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ اس کی بڑبڑاہٹ سن کر سیڑھیوں میں بیٹھے سلمان کو شرارت سوجھی۔

"ارے واہ بیگم...... ہمارے پیار کی کوئی قدر ہی نہیں۔ ہم نے تو یہ بیل اس لیے لگائی تھی کہ پھول ہمیشہ آپ کے قدموں تلے بچھی رہیں۔ اب دیکھو تو ننھے منے پھول سارا دن ٹوٹ ٹوٹ کر آپ کے قدموں تلے اپنی جان قربان کرتے رہتے ہیں۔" سلمان کی رگ شرارت پھڑکی، اس کی بڑبڑاہٹ سے وہ خوب لطف اندوز ہوتا۔

"بھاڑ میں گیا آپ کا پیار، جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں اور شوق پال رکھے ہیں نوابوں والے۔" اس بار ان کی بڑبڑاہٹ قدرے آہستہ تھی۔ روزینہ حسب معمول اس "روزنامہ بڑبڑاہٹ" سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"صباحت...... کیوں خود کو ہر وقت جلاتی رہتی ہو، پھول پودے تو گھر کی رونق ہوتے ہیں۔ چھوٹا سا صحن دیکھو تو کیسا سجتا ہے؟" ندرت آپا سلمان کی شرٹ کے بٹن کھینچ کھینچ کر دیکھتے ہوئے بولیں۔ وہ جب بھی چکر لگاتی بھائی کے سارے قمیص کے بٹن ضرور پکے کر کے لگا جاتیں کہ اگر کوئی ٹوٹ گیا تو صباحت مہینہ بھر تو لگا کر نہیں دے گی۔

"آپا...... بس اب تو قسمت میں ہی یہی لکھا ہے، خود کو جلاؤں اور جل جل کر راکھ ہو جاؤں۔ کتنا ارمان تھا مجھے کہ جب شادی ہو تو مسہری اصلی گلاب کی ہو، مگر کہاں ایسی قسمت، جب کمرے میں داخل ہوئی تو وہی کاغذ کے نقلی پھول بوٹوں نے میرا استقبال کیا۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے جب پنکھا چلتا تو وہ کھڑکھڑاہٹ ہوتی کہ اللہ کی پناہ...... اٹھ کر اتار پھینکے تو سکون کی نیند نصیب ہوئی۔" وہ ہزاروں بار سنایا جانے والا قصہ پھر زور و شور سے دہرا رہی تھیں۔ معمولی تنخواہ پہ گزارہ کرنے والے سلمان نے بچت کے پیش نظر زندگی کی سب سے بڑی غلطی یہ کی تھی کہ مسہری اصلی گلاب کی نہ بنوائی...... اب صباحت اسی غلطی کو روز دوہراتی اور اسے اپنی حق تلفی تصور کرتی۔

"صباحت چھوڑو بھی پرانی باتیں، اب تو ماشاء اللہ تم ایک بیٹے کی ماں بن گئی ہو۔ اچھا خاصا گزارہ کررہی ہو، گھر میں سلمان ساری ضرورتیں پوری کرتا ہے تو یوں شکوے شکایات کیوں کرتی ہو؟ اللہ کا شکر ادا کیا کرو۔" ندرت آپا اسے بازو کے حصار میں لیتے ہوئے بولیں۔

"آپا...... اب آپ کیا جانیں کہ نقلی کاغذ کے پھول بوٹے دیکھ کر میرے دل پہ کیا قیامت گزری تھی، یقین مانیں میرے تو سارے ارمان ہی سو گئے تھے۔" اس کی سوئی اب بھی نقلی پھولوں کی مسہری پہ اٹکی ہوئی تھی۔ ندرت آپا نے ماتھا پیٹ لیا۔ روزینہ مسکراہٹ دبانے کے چکر میں دوہری ہو رہی تھی کہ بھابی کی بات پہ ہنسنا بھی جرم تھا اور

اس جرم کی سزا کے طور پر اس کو مسلسل جلی کٹی باتیں صبر و تحمل سے سننی پڑتیں اور یہ سزا تب تک جاری رہتی جب تک بھابی کی زبان تھک نہ جاتی۔
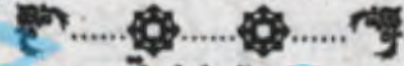
ندرت نوشین اور روزینہ تین بہنیں تھیں اور سلمان ان کا اکلوتا بھائی۔ ماں، باپ اللہ کو پیارے ہوگئے تھے۔ سلمان نے بھائی ہونے کا فرض ادا کرتے ہوئے بہن کی شادی کا فرض بھی ساتھ ہی ادا کردیا تھا۔ بہن کو رخصت کیا اور صباحت کو دلہن بنا کر گھر لے آئے۔ صباحت بھی یتیم لڑکی تھی۔ ماں نے لڑکا شریف دیکھ کر ہاں کردی۔ پیا گھر جانے کی خوشی میں صباحت دن انگلیوں پر گننے لگی اور جب وہ دن آیا تو دل گھنگرو پہن کر محو رقصاں ہوگیا۔ سلمان نے بھی کوئی کمی نہ چھوڑی تھی۔ بہنوں نے جی بھر کر ارمان پورے کیے تھے مگر وائے قسمت کہ مسہری والی غلطی کا تاوان ساری عمر بھرنا پڑا۔ نوشین اور روزینہ بالترتیب سترہ اور اٹھارہ سال میں قدم رکھ چکی تھیں۔ ندرت آپا اپنی عمر سے بڑا کردار ادا کرتیں۔ صباحت کی نوک جھونک کو بڑی خوش اسلوبی سے سلجھا دیتیں اور یوں بات بس نوک جھونک تک ہی محدود رہتی، کبھی لڑائی جھگڑے کی نوبت نہ آئی۔ یوں بھی نوشی اور روزینہ تو بھابی کو پلٹ کر جواب بھی نہ دیتیں اس لیے گھر خوش اسلوبی سے چلتا رہتا۔

اس روز بات بگڑی تیز آندھی سے۔ ساتھ والے گھروں کی کچی چھتوں سے مٹی اڑ اڑ کر ان کے گھر میں گھسنے لگی۔ رہی سہی کسر بوگن ویل کے پھول پتوں نے پوری کردی۔ نوشی، روزینہ نے بڑے محنت سے کمرے، کچن برآمدے کو چمکایا تھا۔ صحن کا کام بھابی کو سونپ کر خود دوپہر کے کھانے کا انتظام کرنے لگیں۔ اگر صباحت انکار کردیتی تو وہ بھی خود ہی کرلیتیں۔ ویسے بھی صرف جھاڑو ہی تو لگانی تھی، صباحت نے بڑبڑاتے ہوئے جھاڑو پھینکی، پرس اٹھایا دو سالہ حماد کو گود میں لیا اور ماں کے گھر آ بیٹھی۔ ندرت آپا کو خبر ہوئی تو وہ بھاگم بھاگ پہنچی۔ بہنوں سے ساری بات سنی، بھائی سے معاملے کی بابت گفتگو شنید کی۔

باحت کو لانے پہ اصرار کیا۔ سلمان نے پہلو تہی کیا تو
یں۔
"جہاں ذرا سا جھکنے سے گھر ٹوٹنے سے بچتے ہوں
اں صحیح ہونے کے باوجود مصلحت کے پیش نظر، اپنی انا
ب طرف رکھ کر جھک جانا چاہیے۔ گھر تو بسانے کے لیے
تے ہیں اجاڑنے کے لیے نہیں۔" بہن کی بات سلمان
ے دل کو لگی...... معاملہ افہام و تفہیم سے نپٹانے کی تلقین
ے ساتھ بھائی کو سسرال روانہ کیا۔ نوشی، روزینہ کو ساتھ لگایا
ر کمر کس لی۔ کپڑے دھوئے، سارا گھر چمکایا، اپنے دیور کو
ن کر کے بلایا۔ وہ پھول اور سجاوٹ کا سامان لے کر اپنے
ام میں لگ گیا۔ آپا نے سندھی بریانی کو دم پہ لگایا، روزینہ
نے قورمہ پکایا اور نوشین نے چپاتیاں ڈال کر ہاٹ پاٹ بند
کر دیا اور خود اپنا حلیہ درست کرنے چل دی۔

"ویلکم ہوم مائی ڈیئر وائف۔" سلمان گھر کا دروازہ
کھول کر پہلے خود اندر داخل ہوا اور جھک کر تعظیم پیش کرتے
وئے صباحت کا ہاتھ تھام کر اسے گھر میں داخل کیا۔
صاف ستھرا، چمکتا گھر نظروں کے سامنے تھا۔ آپا نے بھائی
کو اشارہ کیا، وہ یونہی صباحت کا ہاتھ تھامے اسے لے کر
اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ کھولتے ہی
ڈھیروں پھول صباحت پہ آ گرے۔ کمرہ گلابوں سے
مہک رہا تھا۔ وہ مارے خوشی کے جھوم اٹھی، گھوم گھوم کر جائزہ
لینے لگی۔ اسے اتنا خوش دیکھ کر سلمان سرشار ہو گیا۔ سلمان
کو اپنی جانب محویت سے تکتا دیکھ کر وہ شرما کر باہر نکلی۔
نوشی، روزینہ کو آوازیں دے کر اپنے پاس بلایا اور خود سے
لپٹا کر چٹاچٹ منہ چوم لیا۔ دل میں چھپی پھانس نکلی تو
دھندلا منظر صاف نظر آیا۔ غصہ ایک منٹ میں کافور ہو گیا۔
"تم دونوں مجھے معاف کر دو بڑا دل دکھایا میں نے
تمہارا، مگر اللہ گواہ ہے کہ دونوں کے لیے کبھی بھی دل میں
میل نہیں آیا۔ ذرا زبان کی کڑوی ہوں مگر سگی بہنوں کی
طرح سمجھتی ہوں تمہیں۔" وہ دونوں بھابی سے دائیں
بائیں لپٹی ہوئی تھیں۔ یہ بھی تو سچ تھا کہ وہ بھی بھابی کی
نوک جھونک سے کبھی تنگ نہ آئی تھیں۔ بس ہنستے
مسکراتے، ماتھے پہ بغیر بل ڈالے بڑبڑاہٹ سنتی رہتی اور
یوں دل صاف تھے اور گھر آباد تھا۔ ذرا سی محنت سے منظر
صاف شفاف تھا، بس ذرا سی محنت ہی تو کی تھی، بوگن ویل
کو کاٹنے کے بجائے اونچا کر کے باندھ دیا تھا۔ کچھ گملے
اٹھا کر چھت پہ رکھ دیئے تھے۔ صحن ذرا کھلا ہو گیا تھا۔
گلابوں سے کمرہ سجایا تو صباحت کا شوق بھی پورا ہو گیا۔ وہ
بھی خوش اور گھر والے مسرور۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر
انداز کرنے سے کبھی بھی لڑائی جھگڑے نہیں ہوتے اور
نوک جھونک کو ہنس کر سننے سے دلوں میں کدورتیں نہیں
آتیں۔ من صاف ہو تو سارا جگ شیشے جیسا اور اگر من میں
ہی میل آ جائے تو نفرتوں اور بدگمانیوں کی کائی جم جاتی ہے
جو پھر لاکھ کھرچ کھرچ کر صاف کرلو تب بھی کہیں نہ کہیں
جمی رہ جاتی ہے۔ بات ساری گنجائش کی ہوتی ہے۔ دلوں
میں جتنی گنجائش ہوتی ہے، گھروں میں اتنی ہی خوشیاں
ہوتی ہیں اور ایک اہم اور بڑی خوشی تو ابھی باقی ہے۔
ندرت آپا نے اپنے دیور کے لیے نوشی کا ہاتھ مانگ لیا
جو جانے کب سے چپکے چپکے نوشی کو چاہتا تھا۔ وہ شرمائی تو
صباحت بھابی نے اسے ساتھ لگا کر چوم لیا اور تشکر بھری
نظروں سے ندرت آپا کی طرف دیکھا۔ وہی تو تھیں جو اس
کا ہر مسئلہ بڑی سمجھ داری سے حل کرنے میں پیش پیش
ہوتیں۔ سلمان نے احترام سے بڑی بہن کو دیکھا۔ اس
کے دل میں آپا کا مقام اور بلند ہو گیا تھا، دلوں پہ حکومت
کرنے کے لیے اپنی انا کو کچلنا پڑتا ہے، صباحت نے یہ
بات پلو سے باندھ لی تھی۔

دشوار راستوں کی منزل

نظیر فاطمہ

باہر شام کی سیاہی دھیرے دھیرے گہری ہو رہی تھی اور اندر خولہ ایزل پر اپنے برش سے خوب صورت رنگ بکھیر رہی تھی۔ وہ تصویر بنانے میں اتنی مگن تھی کہ اسے احساس ہی نہ ہوا کہ اپنے بالوں کی لٹ کان کے پیچھے اڑستے ہوئے اس کے گال پر رنگ کا ہلکا سا دھبہ لگ گیا تھا۔ اپنے کام اور اردگرد سے بے نیاز ہو کر اس حد تک مصروف تھی کہ اسے وقت کا احساس ہی نہ رہا تھا۔ تب ہی احتشام کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آیا۔

”خولہ جان میں تمہیں کہہ کر گیا تھا کہ تیار رہنا شام کو ہمیں ایک ڈنر میں جانا ہے۔“ احتشام نے اسے تصویر بنانے میں منہمک دیکھ کر ٹوکا۔

”بس احتشام یہ لو، میرا کام ختم ہو گیا ہے۔“ تصویر مکمل ہو چکی تھی اور اس کی آواز میں اطمینان اتر آیا تھا۔ احتشام نے تصویر کو توصیفی نگاہوں سے دیکھا۔ بہار کا بھرپور منظر کشید کیا گیا تھا اس نے، یوں جیسے اصل منظر سامنے ہو۔ وہ احتشام کی طرف مڑی اور چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ احتشام نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑیں، چند قدم بڑھا کر اس کے مقابل آیا، اس کا چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اونچا کیا، اپنی جیب سے رومال نکالا اور اس کے چہرے پر لگا ہوا رنگ صاف کرنے لگا۔

”تمہیں پتا ہے ناں مجھے بے داغ چیزیں پسند ہیں...... صاف، نکھری اور چمکتی ہوئی، بالکل تمہارے جیسی۔“ اس نے نرمی سے اس کے چہرے سے رنگ کے دھبے صاف کیے اور اس کا چہرہ چھوڑ دیا۔

”آپ بھی ناں احتشام...... بندے کو اتنا کاملیت پسند بھی نہیں ہونا چاہیے۔“ خولہ نے اس کے بازو پر ہلکی سی چپت لگائی۔

"کیا...... کیا نہیں ہونا چاہیے؟" لفظ "کاملیت پسند" احتشام کے سر کے اوپر سے گزر گیا تھا۔

"پرفیکشنٹ۔" خولہ نے انگریزی میں بتا کر اس کی مشکل آسان کی۔

"وہ تو خیر میں ہوں۔ تم جلدی سے تیار ہو جاؤ، میں بھی اپنی تیاری ہو جاتا ہوں۔" خولہ سر ہلا کر وارڈ روب کی طرف مڑی اور احتشام واش روم کی طرف چلا گیا۔

سرخ اور سیاہ رنگ کے امتزاج کی شارٹ شرٹ اور بیل باٹم ٹراوزر میں ملبوس نک سک سے تیار خولہ کمرے میں داخل ہوئی تو احتشام ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا پرفیوم اسپرے کر رہا تھا۔ آئینے میں نظر آتے خولہ کے عکس کو دیکھ کر احتشام کا پرفیوم کی بوتل پکڑا ہاتھ جہاں کا تہاں رہ گیا تھا۔ اس کی شہد اور گلاب ملی سفید رنگت، سیاہ اور سرخ رنگ میں یوں دمک رہی تھی کہ نظریں خیرہ ہو رہی تھیں۔ احتشام اس کی خوب صورتی کا ہی تو دیوانہ تھا۔ اس کے چہرے کا ایک ایک نقش بولتا تھا۔ اس کی خوب صورتی کا اعلان کرتا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر احتشام کے بائیں جانب آ کھڑی ہوئی۔ اسے مسکراتی نظروں سے دیکھا اور بھوئیں اچکا کر تھوڑا سا دائیں بائیں ہو کر اشارے سے اس نے احتشام سے پوچھا کہ وہ کیسی لگ رہی ہے۔ احتشام نے اس کے اس سوال کو پوری جزیات سے سمجھا تھا۔

"ونڈر فل...... ویری پریٹی...... مائی لائف...... ہمیشہ چاند کی طرح چمکتی ہو تم۔" احتشام نے اس کو کندھوں سے تھام کر اس کے روشن چہرے کو نظروں کے ذریعے دل میں اتارا۔

"مگر چاند میں تو داغ ہوتا ہے۔" خولہ ناز سے اٹھلائی۔

"ہوتا ہوگا مگر میرا چاند بے داغ ہے۔" احتشام نے مخمور لہجے میں کہا۔

"اچھا اب چلیں ہر وقت شاعر بننے کو تیار رہتے ہیں۔" خولہ نے باہر کی طرف قدم بڑھائے تو احتشام بھی کوٹ اٹھا کر اس کے پیچھے چل دیا تھا۔

❀......❀......❀

دونوں تقریب میں پہنچے تو ساتھ ساتھ چلتے ہال میں داخل ہوئے۔ ہال کے داخلی دروازے کے سامنے قد آدم آئینہ نصب تھا کہ اندر آنے والا خود کو سر سے پیر تک دیکھ سکتا تھا۔ دونوں نے آئینے میں ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر مسکرا کر آگے بڑھ گئے۔ انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، ہر کوئی ان کی اس قدر مکمل جوڑی کو رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔

"چاند سورج کی جوڑی ہے۔"

"ایک ساتھ کھڑے ہوتے ہو تو ایک دوسرے کو مکمل کر دیتے ہو۔ ایک کے بغیر دوسرا ادھورا لگتا ہے۔"

"کیا شاندار جوڑی ہے...... نہ کمی نہ زیادتی...... بالکل پرفیکٹ۔"

"ہر سو روشنی سی بکھر جاتی ہے۔" ان کے لیے دلوں میں محبت رکھنے والے آپس میں رشک سے سرگوشیاں کر رہے تھے اور حسد رکھنے والے دل ہی دل میں جل کر راکھ ہو رہے تھے۔ ان کا حسد ان کے خوب صورت چہروں پر سیاہی بن کر جھلکنے لگا تھا۔

خولہ سراپا حسن تھی تو احتشام بھی مردانہ وجاہت کا منہ بولتا نمونہ...... خولہ احتشام خان کی چچازاد تھی اور اب اس کی بیوی کے درجے پر فائز تھی۔ اس کی لو پلس ارینج میرج تھی۔ وہ گھر بھر کی لاڈلی اب اس کی منظور نظر بن کر اس کے ساتھ ساتھ تھی۔

❀......❀......❀
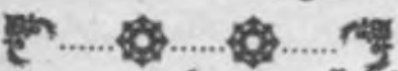
موسم میں خنکی تھی خولہ اپنے گھر کے باہر واک کر رہی تھی۔ سرمئی رنگ آہستہ آہستہ سیاہی میں بدل رہا تھا۔ خولہ نے گہرا سانس لے کر خوشگوار ہوا کو اپنے اندر اتارا۔ بڑا پسند تھا اسے یہ ہلکا ہلکا خوشگوار موسم...... وہ کافی دیر واک کرتی رہی۔ ابھی وہ اندر جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ سامنے سے ایک لڑکی واک کرتے ہوئے آئی اور وہ خولہ کے قریب پہنچ کر رک گئی۔

"ہیلو میں زہرا...... اور آپ؟" اس نے گرم جوشی سے ہاتھ آگے بڑھایا جسے خولہ نے تھام لیا۔ لڑکی تقریباً خولہ کی ہم عمر ہی تھی۔

"خولہ......"

"میں وہ سامنے والے گھر میں رہتی ہوں...... ممی پاپا کے ساتھ رہتی، یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں، اکثر آپ کو آتے جاتے دیکھا ہے، خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" زہرا نے پورے خلوص سے کہا۔ خولہ کو بھی یہ پرخلوص سی لڑکی پسند آئی۔ دو تین ملاقاتوں میں ان میں اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔ خولہ دن میں اکیلی ہوتی تو اکثر زہرا اس کے پاس آجاتی تھی۔ خولہ کو معلوم ہی نہیں تھا کہ قدرت نے زہرا کی صورت میں اسے ایک ان مول دوست عطا کردیا تھا۔

❀......❀......❀......❀

"خولہ بابا جان کا فون آیا تھا، بلارہے ہیں اس ویک اینڈ پر۔" دونوں ناشتے کی ٹیبل پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

"ٹھیک ہے چلتے ہیں۔" خولہ نے جوس گلاس میں انڈیل کر اپنے سامنے رکھا۔

"تم تیاری کرلینا۔" احتشام نے بات مکمل کرکے ابلے انڈے کا ٹکڑا کانٹے میں پھنسا کر نفاست سے منہ میں رکھا۔

احتشام اور خولہ کے والدین کی بلوچستان کے ایک گاؤں میں بہت سی زرخیز زمینیں تھیں اور اسی حوالے سے ان کا کاروبار بھی تھا جو کہ کافی پھیلا ہوا تھا۔ اسی کاروبار کے سلسلے میں خولہ اور احتشام کراچی میں مقیم تھے۔ یہاں کے سارے کاروبار کی دیکھ بھال اور انتظام احتشام کے ہاتھ میں تھی۔ خولہ کو پینٹنگ کا شوق تھا جسے وہ فارغ وقت میں سرانجام دیا کرتی تھی۔ خولہ صبح میں یونیورسٹی جاتی تھی جہاں ایم بی اے میں اس کا ایڈمیشن ہوچکا تھا۔ وہ بہت خوش تھی احتشام خان کی زندگی میں شامل ہوکر جو اسے دیوانہ وار چاہتا تھا۔

"اور ہاں ایک بات اور......" احتشام نے کانٹا پلیٹ میں رکھ کر اسے دیکھا۔ خولہ نے جوس کا گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"سب جتنا مرضی زور ڈالیں تم وہاں رکو گی نہیں...... میرے ساتھ ہی واپس آؤ گی۔" احتشام نے نیپکن سے ہاتھ صاف کیے۔

"اب اگر سب کہیں گے تو میں انکار تو نہیں کرسکوں گی ناں۔" خولہ نے شرارتی نظروں سے دیکھا۔

"تمہارے اچھے بھی کریں گے انکار...... تم جانتی ہو میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"ہاں جانتی تو ہوں مگر بڑوں کی بات بھی ٹالی تو نہیں جاسکتی ناں۔" وہ اسے مسلسل تنگ کررہی تھی۔

"کرنا انکار...... پھر سب کے سامنے اٹھا کر گاڑی میں ڈالوں گا تو اچھا لگے گا ناں۔" احتشام نے اسے دھمکایا تو وہ کھلکھلائی۔

"آپ ایسا ہرگز نہیں کریں گے۔"

"میں بالکل ایسا ہی کروں گا۔" احتشام اس کی اس کمزوری سے واقف تھا۔ وہ بڑوں کے سامنے حد ادب میں رہنے کی قائل تھی۔ بڑوں کی موجودگی میں میاں بیوی کے چونچلے اسے سخت ناپسند تھے۔

"اچھا...... اچھا ٹھیک ہے جو آپ کہیں گے ویسا ہی ہوگا۔"

"اب کے ناں اچھی بیویوں والی بات۔" وہ ڈائننگ ٹیبل سے اٹھا۔ خولہ بھی اٹھ کر اس کے ساتھ باہر تک آئی۔

"شام کو تیار رہنا میں واپس آؤں گا تو کہیں گھومنے چلیں گے۔" وہ پھر پلٹ کر اس کے قریب آیا۔

"آپ ابھی جائیں گے تو شام کو آئیں گے ناں۔" خولہ نے اسے باہر کی طرف راہ دکھائی۔ احتشام کے جانے کے بعد خولہ نے وہیں کھڑے کھڑے کچھ سوچا اور پھر پیکنگ کرنے کے لیے سامنے والی سیڑھیاں چڑھنے لگی جو کسی نازک حسینہ کی طرح بل کھائے ہوئی تھیں۔

"فضل داد تیار رہنا، کل صبح ہم لوگوں کو گاؤں کے لیے نکلنا ہے۔" احتشام دفتر سے واپس آیا تو اس نے اپنے ڈرائیور سے کہا۔ احتشام عموماً گاڑی خود ہی ڈرائیو کرتا تھا مگر جس دن اسے لانگ ڈرائیو پر جانا ہوتا تھا اس دن ڈرائیور ساتھ جاتا تھا۔ ورنہ زیادہ تر وہ گھر پر پایا جاتا تھا اور اس کی ڈیوٹی خولہ کو لانے لے جانے تک ہی محدود تھی یا پھر جب بھی انہیں گاؤں جانا ہوتا تو ڈرائیور کو ساتھ لے کر جاتے کہ کافی لمبا سفر ہوتا تھا۔

"کل صاحب جی؟" فضل داد نے سوال کیا۔ احتشام نے اسے دیکھا وہ بڑا محنتی اور فرض شناس تھا۔ کام کے حوالے سے کبھی بہانے بازی نہیں کرتا تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر قدرے پریشانی تھی۔ پریشانی میں وہ اپنے ہاتھ مسل رہا تھا۔

"ہاں کیوں؟" احتشام نے پوچھا تو فضل داد تذبذب کا شکار ہوا کہ بتائے یا نہ بتائے۔

"فضل داد کوئی پریشانی ہے تو بتاؤ، خاموش رہنے سے مسئلہ تو حل نہیں ہوگا۔" احتشام خان نے قدرے جھنجلا کر خاموش کھڑے فضل داد کو دیکھا۔ وہ ایسا ہی تھا اس کا ضبط بہت کم تھا۔ بہت جلد اکتا جانے والی طبیعت پائی تھی، فضل داد اپنے مالک کے مزاج سے واقف تھا۔ جانتا تھا کہ اب اسے ہر صورت اپنا مسئلہ بتانا ہوگا کہ صاحب کی برداشت بس یہی تک تھی۔

"صاحب جی وہ میری اماں آئی ہوئی ہیں گاؤں سے۔"

"تو؟"

"وہ بیمار ہیں کافی، کل مجھے اپنی اماں کو ہسپتال لے کر جانا تھا۔ وقت لیا ہوا ہے جی ڈاکٹر صاحب سے۔ اماں کی طبیعت بہت ہی خراب رہنے لگی ہے۔ اس لیے میں پریشان ہوں کہ کل اگر میں چلا گیا تو اماں کو ہسپتال کون لے کر جائے گا؟ گاؤں سے بار بار آنا ان کے لیے ممکن نہیں اور شہر میں رہنا ان کے لیے ناممکن ہے۔" فضل داد نے جواب دیا۔

"اوہ...... چلو کوئی بات نہیں، تم رہنے دو میں خود ڈرائیو کرلوں گا۔ تم اماں کو ہسپتال لے جاؤ اور یہ رکھ لو کام آئیں گے۔" احتشام نے پانچ ہزار روپے اس کی طرف بڑھائے۔ اس نے انہیں تھام لیا اور شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔

"چلو، بھئی خولہ آجاؤ...... میں سامان گاڑی میں رکھ رہا ہوں۔" صبح صادق کا وقت تھا۔ گاؤں جانے کے لیے وہ لوگ یوں ہی علی الصباح روانہ ہوتے تھے۔ احتشام خان سامان اٹھا کر کمرے سے باہر آیا۔ خولہ نے بڑی سی چادر اوڑھی کہ اس کا صرف چہرہ نظر آرہا تھا۔ ان کے گاؤں کی روایت تھی کہ وہاں خواتین خود کو بڑی سی چادر میں لپیٹ کر باہر نکلتی تھیں۔ خولہ بھی جب گاؤں جاتی تو اس ہی طرح چادر لے کر جاتی تھی۔ کمرا لاک کر کے وہ باہر آئی اور لاؤنج میں لگے آئینے میں دیکھ کر اپنے سر پہ چادر درست کی۔ باہر نکل کر لاؤنج کو تالا لگایا اور پورچ کی طرف بڑھی۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا۔

خولہ گاڑی کے قریب آئی تو ڈرائیور کی سیٹ پر احتشام خان کو بیٹھتے دیکھ کر حیران ہوئی۔ اس نے گاڑی کے دروازے کے شیشے پر ہلکے سے دستک دی تو اس نے شیشہ نیچے کر کے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ خود ڈرائیو کریں گے، فضل داد کہاں ہے؟" خولہ نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

"اس کی ماں کی طبیعت خراب ہے کہہ رہا تھا انہیں اسپتال لے کر جانا ہے تو میں نے کہہ دیا کہ وہ اپنی ماں کو ہسپتال لے جائے۔" احتشام نے اس کے لیے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔

"اتنا لمبا سفر ہے آپ کیسے ڈرائیو کریں گے؟" خولہ اس کی تھکن کا سوچ کر پریشان ہوئی۔

"او...... کچھ نہیں ہوتا یار آجاؤ۔ ویسے بھی من چاہا اور خوب صورت ہم سفر ساتھ ہو تو سفر کتنا بھی لمبا کیوں نہ ہو

جلدی کٹ جاتا ہے۔" اختشام نے گاڑی کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کر کے اسے بیٹھنے کا اشارا کیا تو وہ گھوم کر دوسری طرف آئی اور بیٹھ کر دروازہ بند کرلیا۔ چہرے پر اب بھی پریشانی تھی۔

"چلو اب موڈ ٹھیک کرو، کچھ نہیں ہوتا...... اس سفر کو انجوائے کرو۔" اختشام نے اس کی فکر مند شکل دیکھ کر کہا۔

"موڈ ٹھیک ہے بس آپ کی طرف سے فکر مند ہو رہی تھی۔" خولہ نے لہجے میں بشاشت پیدا کی۔

❀ ❀ ❀
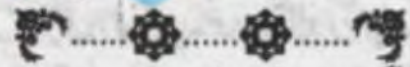
وہ پانچ چھ گھنٹے کا سفر کر چکے تھے۔ راستے میں وہ دو جگہ رکے تھے۔ اب مزید ایک گھنٹے کا سفر باقی تھا جس کے بعد وہ گاؤں پہنچ جاتے۔ گھاٹیوں اور کھائیوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ سو اب اختشام بڑے محتاط انداز میں گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار بھی درمیانی تھی۔ اب تھوڑی سی اترائی شروع ہو چکی تھی۔ اترائی جہاں سے ختم ہوتی تھی وہاں سے ایک موڑ مڑتا تھا جو کہ کافی خطرناک تھا اور جس کے نیچے قریباً بیس فٹ گہری کھائی تھی۔ اترائی اترتے ہوئے نہ جانے کیا ہوا کہ گاڑی کے بریک نے کام کرنا چھوڑ دیا اور گاڑی لحہ بہ لحہ اس موڑ کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ اگر گاڑی کی اسپیڈ اس موڑ پر کم نہ ہوتی تو گاڑی مڑنے کی بجائے سیدھا کھائی میں جا گرتی۔ اختشام نے اپنی پوری طاقت صرف کر دی مگر گاڑی کی رفتار کم ہونے میں نہ آئی۔

"اف یہ کیا ہو رہا ہے؟" اختشام کی پریشان آواز گاڑی میں گونجی۔

"کیا ہوا؟" خولہ نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

"گاڑی کے بریکس کام نہیں کر رہے۔" اختشام نے گاڑی کو کنٹرول کرنے کی پوری کوشش کی اور خولہ کا چہرہ خوف سے زرد ہو گیا۔ اس نے ایک نظر قریب آتی کھائی کو دیکھا اور اختشام کی طرف مڑی۔

"اختشام اب کیا ہوگا؟" خولہ کے خوف سے خشک ہوتے گلے سے بمشکل آواز نکلی۔ اس نے اپنا ہاتھ اختشام کے کندھے پر رکھ دیا۔ موت لحہ بہ لحہ قریب آ رہی تھی۔ اختشام نے چند لمحے سوچا اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹایا، اپنی سیٹ بیلٹ کھولی اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا دی اور گاڑی خطرناک انداز میں آگے بڑھی خولہ سمیت، خوف سے چیختی ہوئی اور اختشام اختشام پکارتی ہوئی خولہ سمیت...... آنسو اس کے گالوں پر لڑھک رہے تھے، بے یقینی، مان کا ٹوٹ جانا، موت کا خوف سب کچھ خولہ کے چہرے پر نظر آنے لگا تھا۔ بس چند لمحے تھے اور گاڑی کھائی میں جا گرتی۔ خولہ نے پلٹ کر اختشام کو دیکھنے کی کوشش کی یوں جیسے کوئی ڈوبنے والا کنارے کو آخری بار دیکھتا ہے۔

"ہم دونوں کا جینا مرنا ایک ہے اب...... اختشام ہم کبھی جدا نہیں ہوں گے۔" خولہ کے کانوں میں چند ماہ پہلے کی اپنی ہی آواز گونجی جب اس نے اختشام کی محبت میں سرشار ہو کر کہا تھا۔

"نہ بابا جینا اکٹھے...... مگر مرنا اپنا اپنا۔" اختشام نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"تو اختشام نے اپنا کہا سچ کر دکھایا اور مرنے کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔" یہ آخری سوچ تھی جو خولہ کے ذہن میں آئی اور پھر گاڑی ڈگمگاتی ہوئی سیدھا کھائی میں جا گری تھی۔ نیچے کھائی میں اتنا اندھیرا تھا جیسے قبر کے شگاف کو بند کر کے اس پر پتھر کی سلیں چن دی جائیں۔ خولہ کا ذہن بھی اس تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ اندھیرا ہی اندھیرا تھا ہر طرف۔ اللہ کے سوا کوئی مددگار نہ تھا۔

❀ ❀ ❀
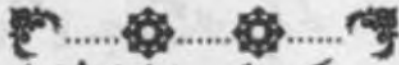
خولہ نے اپنی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ اسے اپنے پپوٹوں پر بے تحاشا وزن محسوس ہو رہا تھا کہ وہ انہیں ہلانے میں بھی مشکل محسوس کر رہی تھی۔ بڑی دقتوں سے اس نے انہیں حرکت دی اور آہستہ آہستہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ بڑی تگ و دو کے ساتھ وہ اپنی پوری آنکھیں کھولنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ اس کی نظریں سب سے پہلے سفید رنگ سے ٹکرائیں۔

"کیا میں مرگئی ہوں؟" اس کے دل میں سوال ابھرا پھر وہ سفید رنگ کسی کمرے کی چھت میں تبدیل ہوگیا تھا۔ اس نے اپنی گردن موڑنے کی کوشش کی جس میں وہ کامیاب تو نہ ہوسکی مگر اس کی گردن میں درد کی ایک شدید لہر اٹھی کہ اس کے منہ سے سسکی نکل گئی۔ اس نے نظریں گھما کر کمرے کا جائزہ لیا وہ کسی اسپتال کا کمرہ تھا۔ اسے اپنا پورا وجود جکڑا ہوا اور کسی بوجھ کے نیچے دبا ہوا محسوس ہوا پھر کسی چیز کی تیز سی بو اسے محسوس ہوئی۔ اس کی حسیات جاگ رہی تھیں۔ وہ زندہ تھی...... زندہ تھی وہ مگر کہاں تھی اس کے سب اپنے کہاں تھے؟

کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک نرس کمرے سے میں داخل ہوئی۔ اس پر نظر پڑی تو آگے آکر اس پر جھکی اور اسے ہوش میں دیکھ کر الٹے قدموں واپس لوٹ گئی۔ وہی نرس تھوڑی دیر کے بعد ایک ڈاکٹر کے ساتھ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر نے اس کی آنکھیں اپنی دو انگلیوں کی مدد سے کھول کر ان کا معائنہ کیا پھر قدرے جھک کر اسے آواز دی۔

"بی بی آپ کا نام کیا ہے؟" اسے ڈاکٹر کی آواز تو سنائی دی مگر اس نے پوچھا کیا تھا وہ اسے سمجھ نہیں آیا۔ ڈاکٹر نے دو تین بار یہی سوال کیا مگر وہ جواب نہ دے سکی۔ پپوٹوں پر دھرا وزن بڑھنے لگا اور اس کی آنکھیں دوبارہ بند ہونے لگیں۔

"ان کا ذہن ابھی غنودگی میں ہے مگر اللہ کا شکر ہے کہ انہیں ہوش آگیا ہے۔ صبح ان کے گھر والوں کو اطلاع کریں۔" وہ دوبارہ نیند میں جانے لگی۔

"اس کے گھر والوں کو اطلاع دے دی گئی ہے۔"

"خولہ میری بچی۔" خولہ کے کانوں میں کسی کے سسکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو اس پر ایک جھکا چہرہ شناسا تو لگا مگر وہ اسے پہچان نہ سکی۔

"ڈاکٹر صاحب یہ آنکھیں کھول رہی ہے۔" اس پر جھکا وجود پلٹ کر ڈاکٹر کو پکارنے لگا۔ ڈاکٹر اور نرسیں دوڑ کر واپس آئے۔

"ہیلو ہیلو...... آپ ہماری آواز سن رہی ہیں؟" ڈاکٹر نے خولہ پر جھک کر کہا جس کی نظریں سامنے کھلی کھڑکی پر تھیں جہاں باہر دھوپ پھیلی تھی۔

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"خ...... خ...... خول...... ہ۔" وہ ٹوٹے لہجے میں بولنے کی کوشش کرنے لگی۔ کمرے میں موجود عورت اس کے اس طرح بولنے پر رونے لگی۔

"پلیز مسز علی احمد آپ خود پر قابو رکھیں۔ سسٹر انہیں باہر لے جائیں آپ۔"

"ام...... ام...... ی...... امی۔" اس نے آواز دی تو کشور رک کر اس کی طرف پلٹیں اور اس کا ماتھا چومنے لگیں۔ اس کے حواس مکمل طور پر جاگ گئے تھے۔

"خولہ اب پوری طرح سے ہوش میں ہے آپ ان سے مل لیں باری باری مگر پلیز اس کے سامنے رویئے گا مت۔" ڈاکٹر نے علی احمد اور احتشام سے کہا۔

"میری بچی۔" کشور بے بسی سے آنسو بہا رہی تھیں اور خولہ کو ان کا چہرہ نا جانے کیوں اجنبی اجنبی سا لگ رہا تھا کچھ مختلف۔

"خولہ میری لاڈلی تم نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا تھا۔ پورے ایک مہینے کے بعد ہوش میں آئی ہو۔" علی احمد نے نم آواز میں کہا تو اس نے مسکرانے کی کوشش کی مگر اس کے جبڑے میں شدید درد ہوا جو اس کی گردن کے پیچھے تک گیا۔ وہ کراہ کر رہ گئی۔

"کیا ہوا ڈاکٹر کو بلایئے۔" کشور نے علی احمد کو باہر دوڑایا خولہ کشور کے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی کہ جیسے اس تبدیلی کا پتا لگانا چاہ رہی ہو پھر جیسے وہ تبدیلی اس پر پوری طرح سے آشکار ہوگئی۔ اس کی ماں کا چہرہ بوڑھا اور نقاہت زدہ لگ رہا تھا۔ اس کی ماں بوڑھی ہوگئی تھی ان ایک مہینے میں اس نے سالوں کا سفر طے کرلیا تھا۔ جوان بیٹی کا دکھ اسے کھا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"درد ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر بس ابھی آتے ہیں...... گھبرانا نہیں میری بچی۔" اس کی ماں نے محبت سے کہا۔

"ن...... ہ...... ی...... ں بیٹھ جائیں۔ اح...... احت...... احتشام۔" خولہ نے ٹوٹ ٹوٹ کر احتشام کا نام لیا۔

"باہر ہے بلاتی ہوں۔" کشور اٹھی اور احتشام کو لیے اندر داخل ہوئیں۔ احتشام نے ایک نظر خولہ پر ڈالی اور قدرے فاصلے پر نظریں جھکا کر کھڑا ہوگیا۔ خولہ کے سارے چہرے پر نشان تھے پورا وجود پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا وہ پرفیکشنسٹ اس ادھورے اور ٹوٹے ہوئے وجود کو دیکھنے کی تاب نہ لاسکا اور پلٹ کر کمرے سے باہر چلا گیا خولہ کا دل لرزنے لگا۔ کسی انہونی کا احساس دلانے لگا۔ اس کا یوں کمرے سے نکل جانا اس کے دل پر پڑا بوجھ کئی گنا بڑھا گیا تھا۔ اس کی ہر رگ میں محشر بپا تھا مگر لب ساکت تھے، چہرہ سپاٹ اور جسم بے حس وحرکت تھا۔

❁ ❁
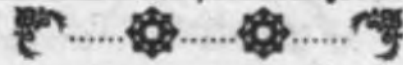
زہرا کو خولہ کے ایکسیڈنٹ کا پتا چلا تو وہ بہت بے قرار ہوئی۔ اس کے پاس صرف خولہ کا نمبر تھا جو بند تھا۔ ایک دن اسے احتشام نظر آیا۔ وہ گاڑی میں بیٹھ رہا تھا، وہ اس کی طرف بھاگی۔

"احتشام بھائی...... احتشام بھائی۔" وہ پھولی سانسیں درست کرنے لگی۔ احتشام نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"وہ میں خولہ کا پتا کرنے آئی ہوں...... کیسی ہے وہ اب؟" زہرا کے لہجے میں بے تابی تھی۔

"بہت برے حالوں میں...... شاید اب وہ کبھی ٹھیک نہیں ہوپائے۔" احتشام کا لہجہ بے تاثر سا تھا۔

"اللہ نہ کرے احتشام بھائی۔" زہرا دہل گئی۔

"آپ ایسا کریں خولہ کے نمبر پر بات کرلیں۔" احتشام کہہ کر تیزی سے گاڑی میں بیٹھا اور یہ جا وہ جا۔ زہرا اس کے رویے پر سن سی کھڑی رہ گئی۔ وہ بہت دنوں سے کوشش کررہی تھی زہرا کا نمبر بند تھا اور کسی کا نمبر اس کے پاس نہیں تھا۔ احتشام کے رویے نے زہرا کے دل میں ایسے خدشے پیدا کردیے تھے جو اس کے دل کو ڈسنے لگے تھے۔

❁ ❁

"مس خولہ آپ بہت بہادر ہیں۔ جس طرح آپ موت کو شکست دے کر واپس آئی ہیں ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اللہ چاہتا ہے کہ آپ جئیں...... اسی لیے اس نے آپ کو زندگی دی ہے۔" خولہ ڈاکٹر کی بات سن کر لمحے بھر کو یوں مسکرائی جیسے گرد آلود رات میں ستارے اچانک چمک کر بجھ جائیں۔

"ہمیں آپ کے علاج کے لیے آپ کا تعاون چاہیے اور ہمیں یقین ہے کہ آپ ہمیں مایوس نہیں کریں گی۔" ڈاکٹر اس کے بیڈ کے پاس کھڑا قدرے جھک کر اس سے باتیں کررہا تھا۔ خولہ کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ اب اس کے علاج کا صبر آزما دور شروع ہونے جارہا تھا۔ ڈاکٹرز کے بورڈ کی رائے تھی کہ خولہ کو اس کی حالت کے بارے میں تفصیل سے بتادیا جائے تاکہ وہ علاج میں تعاون کرسکے۔ اس کے تعاون کے بغیر اس کا علاج ممکن نہیں تھا۔ اب یہ ڈاکٹر اسی سلسلے میں یہاں تھا۔ آہستہ آہستہ اس کو اس کی حالت سے باخبر کرنے کے لیے تمہیدی گفتگو کررہے تھے۔

"آپ میری بات غور سے سنیے۔" خولہ کا رواں رواں سماعت بن گیا تھا۔ وہ جو اتنے دنوں سے پٹیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ ہلنے جلنے سے قاصر تھی تو وہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ کب تک ٹھیک ہوجائے گی۔

"گرنے سے آپ کی گردن اور ریڑھ کی ہڈی شدید متاثر ہوئی ہے۔" خولہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ڈاکٹر نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کی طرف بغور دیکھا جس کا تیز چلتا تنفس اس کی اندرونی حالت کا عکاس تھا۔

"آپ کے بازو اور ٹانگیں کئی جگہ سے فریکچر ہیں۔" وہ پھر رکا اور خولہ نے دم سادھ لیا۔ اب آگے نہ جانے اور کیا سننا تھا۔

"علاج سے آپ ٹھیک ہوجائیں گی مگر اس علاج کے بعد بھی آپ صرف اتنا ٹھیک ہو پائیں گی کہ شاید

ساری زندگی اپنے پیروں پر کھڑی نہیں ہوسکیں۔" بالآخر ڈاکٹر نے مکمل بات اسے بتادی، پھر دھڑ دھڑ جیسے کمرے کی چھت خولہ پرآن گری۔

"علاج کے دوران آپ کو بہت صبر سے کام لینا ہوگا۔" ڈاکٹر اس کی زرد پڑتی رنگت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ صبر کر بھی لیتی مگر احتشام...... وہ کیسے صبر کرتا۔ وہ جسے اس کے چہرے پر رنگ کے دھبے برداشت نہیں ہوتے تھے، وہ اس کے ٹوٹے پھوٹے دجود کو کیسے برداشت کرے گا۔ اس حالت میں بھی اسے پہلا خیال صرف احتشام کا آیا تھا۔ وہ جو اپنے بارے میں سب کچھ سن کر برداشت کرگئی تھی، احتشام کو کھودینے کا خوف اس پر کپکپی طاری کرگیا تھا۔ ڈاکٹر اپنی بات کو ادھوری چھوڑ کر اس کی حالت کو کنٹرول کرنے لگا تھا۔

......✿......✿......

احتشام اس دن کا گیا پھر پلٹ کر نہیں آیا تھا۔ اس کی فطرت پرندوں جیسی تھی کہ جب پانی سوکھ گیا تو وہ اڑ کر دوسری جگہ جابیٹھا۔ وہ احتشام کے بارے میں سب سے سوال کرتی مگر سب نظریں چرانے لگتے۔ رفتہ رفتہ اس نے احتشام کے بارے میں پوچھنا ہی چھوڑ دیا مگر اس کا دل بڑا بے قرار تھا۔ وہ اپنی حالت پر صبر کر بھی لیتی اگر اسے اس بات کا یقین ہوتا کہ اس کی زندگی کا ساتھی اس کے ساتھ کھڑا ہے تو وہ سب سہہ جاتی مگر احتشام کے چھوڑ جانے کا احساس نیزے کی انی کی طرح روح میں گڑ گیا تھا۔ وہ جیسے اپنی ہر سانس کا تاوان چکا رہی تھی۔

خولہ کی چند رپورٹس آنا باقی تھیں۔ وہ رپورٹس آئیں تو اسے ایک اور صدمے کا سامنا کرنا پڑا۔ آج جب ڈاکٹر نے اسے یہ خبر سنائی کہ اس حادثے میں وہ ماں بننے کی صلاحیت بھی کھو بیٹھی ہے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی اور پہلی بار اللہ سے شکوہ کیا۔

"کیوں...... کیوں کیا تو نے میرے ساتھ ایسا...... میرے ہی ساتھ کیوں؟ تو جانتا ہے ناں احتشام کو...... پھر بھی...... پھر بھی...... کیوں کیوں؟" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس طرح رونے سے اس کی حالت مزید بگڑی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے ماں باپ کی بھی۔ اس حادثے نے انتہائی متحرک، زندہ دل، شوقین اور زندگی سے بھرپور وجود کو راکھ کردیا تھا۔

احتشام نے بڑا شور ڈالا تھا جلدی شادی کرنے کے لیے۔ خولہ صرف اٹھارہ سال کی تھی جب وہ دلہن بن کر احتشام کے آنگن میں اتری تھی۔ چار سال ہوگئے تھے ان کی شادی کو احتشام پانچ سال تک بچہ پیدا کرنے کے حق میں نہ تھا۔ وہ یہ وقت صرف خولہ کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ خولہ کو بچے بہت پسند تھے۔ اس نے یہ وقت گن گن کر گزارا تھا کہ کب پانچ سال پورے ہوں اور اس کی گود میں بچہ آئے مگر قدرت نے یہ کیا کردیا تھا اس کے ساتھ وہ خود ترسی کا شکار ہوگئی تھی۔ علاج میں پوری طرح تعاون بھی نہیں کرپارہی تھی۔

......✿......✿......

وہ اب بھی بیڈ پر لیٹی اللہ سے شکووں اور شکایات میں گریہ کناں تھی۔ جب کوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

"خولہ......" اس کا بھائی دانیال کھڑا تھا جو اپنے امتحانات کی وجہ سے کینیڈا سے دوبارہ واپس آیا تھا۔ پہلے وہ تب آیا تھا جب خولہ ہوش وخرد سے بے گانہ تھی۔

"دانی......" خولہ اسے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ دانیال آگے بڑھا اور اس کی پیشانی اپنی پیشانی سے ٹکا کر اسے حوصلہ دینے لگا۔ لفظ جیسے گونگے ہوگئے تھے۔ اس کی پیشانی سے نکلنے والی حرارت خولہ کی پیشانی میں جذب ہوکر اسے تسلی دے رہے تھے اور دانیال خود اپنے آنسو اپنے اندر اتار رہا تھا۔ اس کے آنسو بہن کو اس حالت میں دیکھ کر آنکھوں میں ٹھہر گئے تھے۔

"یار خولہ بس بھی کرو تم تو بہت بہادر ہو۔" تھوڑی دیر بعد دانیال نے خود پر قابو پاکر کہا۔

"نہیں ہوں میں بہادر...... بالکل بھی نہیں ہوں...... میں بہت ڈرپوک ہوں۔" الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر خولہ کے منہ سے سرگوشی کی صورت نکلے اور وہ پھر رونے

اہم اطلاع

نئے اُفق گروپ آف پبلیکیشنز سے شائع ہونے والے ڈائجسٹ

آنچل نئے اُفق حجاب

کا ویب ایڈریس اور تما کالموں کے ای میل تبدیل ہو گئے ہیں۔ قارئین نوٹ فرمالیں۔

پرانے ویب اور ای میل ایڈریس پر مسلسل صارفین کی شکایات موصول ہوتی رہیں۔ جس کی بنا پر ادارے نے اپنے ای میل ایڈریس تبدیل کر لیے ہیں۔ تمام سلسلوں کے الگ الگ ایڈریس اس پوسٹ میں لگائے جا رہے ہیں۔ براہ کرم اسے اپنے پاس محفوظ کر لیجیے اور اپنے دوست احباب کو بھی اطلاع کر دیں۔

نیا ویب ایڈریس یہ ہے

www.naeyufaq.com

info@naeyufaq.com	نئے افق، آنچل اور حجاب سے متعلق معلومات کے لئے یہ ای میل ہے
editorufaq@naeyufaq.com	نئے افق کی کہانیاں، سلسلے اور معلومات کے لئے
editor_aa@naeyufaq.com	آنچل کی کہانیاں، سلسلے اور معلومات کے لئے
editorhijab@naeyufaq.com	حجاب کی کہانیاں، سلسلے اور معلومات کے لئے
biazdill@naeyufaq.com	بیاض دل اور نیرنگ خیال
dkp@naeyufaq.com	دوست کے پیغام
yaadgar@naeyufaq.com	یادگار لمحے
aayna@naeyufaq.com	آئینہ کے لئے تبصرہ
bazsuk@naeyufaq.com	بزم سخن (شاعری)
alam@naeyufaq.com	عالم میں انتخاب شاعری منتخب شعرا کا کلام
shukhi@naeyufaq.com	شوخی تحریر (اقتباسات)
husan@naeyufaq.com	حجاب میں تبصرے کے لیے حسن خیال

اپنی کہانیاں یونی کوڈ، ورڈز اور ان پیج پر ٹائپ کر کے ای میل کر دیں۔ اردو رسم الخط میں موصول ہونے والی کہانیاں قابل قبول ہوں گی۔
نئے افق، آنچل اور حجاب کے کالم میں شریک ہونے کے لئے درست ای میل کا انتخاب کیجئے۔ بصورت دیگر ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔
تمام احباب سے گذارش ہے کہ ای میل ایڈریس محفوظ کر لیں تا کہ بوقت ضرورت آپ کو کسی قسم کی دشواری نہ اٹھانا پڑے۔

لگی۔ دانیال نے بڑی مشکل سے اپنے آنسو اپنے اندر اتار کر خود پر بشاشت طاری کی۔
"سارا دن یہاں لیٹے لیٹے فضول سوچیں پالو گی تو یہی حال ہوگا ناں۔" وہ کرسی گھسیٹ اس کے بیڈ کے پاس رکھ کر بیٹھ گیا۔ چھ مہینوں میں اتنا ہو گیا تھا کہ اس کا جبڑا کافی حد تک ٹھیک ہو گیا تھا۔ گردن کا کالر اتر گیا تھا۔ بازوؤں کے فریکچر ٹھیک ہو گئے تھے کہ وہ گردن اور بازوؤں کو آسانی سے حرکت دے سکتی تھی۔
"تو کیا کروں...... اب ایسے لیٹ کر اور کیا کر سکتی ہوں میں؟" وہ بے بسی سے بولی۔
"تمہارا شوق تھا پینٹنگ...... اس کا کیا ہوا؟" دانیال نے اپنی بہن کے مرجھائے چہرے اور بجھی آنکھوں کو دیکھا۔ اس کے دل پر بوجھ پڑنے لگا۔ اسے اب اپنی بہن کو زندگی کی طرف لانا تھا۔ یہ وعدہ تھا اس کا خود سے۔
"پینٹنگ کا شوق تو اب بھی ہے...... مگر میری حالت دیکھو۔" خولہ نے قدرے صاف الفاظ میں کہا۔ اب اس کے بولنے میں کافی بہتری آگئی تھی۔
"سوچ لو ایسے لیٹ کر ان دیواروں اور چھتوں کو دیکھنے سے بہتر ہے کہ الٹے سیدھے اسٹروک لگا لو۔" خولہ خاموشی سے دانیال کی شکل دیکھنے لگی۔ چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ اس کے سامنے سوچ کا ایک در کھول چکا تھا۔ اس روز دانیال اس سے بہت سی باتیں کر کے گیا تھا، وہ اس کا بڑا بھائی جو کہ بھائی سے زیادہ اس کا دوست تھا۔
"واقعی اس طرح کڑھنے سے بہتر ہے کہ میں کچھ کرنے کی کوشش میں خود کو مصروف کرلوں۔" وہ سوچنے لگی، ایک فیصلہ کر کے اس نے سکون سے آنکھیں موند لیں۔
دانیال نے سب سے پہلے اس کا موبائل فون آن کر کے اسے دیا۔ پریشانی میں کسی کو اس کے موبائل کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔
"یہ پکڑو...... اپنا موبائل۔"
"میں کیا کروں گی اس کا؟ اب کون ہے جو مجھے کال کرے گا۔" وہ پھر خود ترسی کا شکار ہوئی۔
"میں ہوں ناں...... مجھے ضرورت پڑتی ہے اکثر تم سے بات کرنے کی...... کوئی چیز لانی ہوتی ہے، کچھ پوچھنا ہوتا ہے۔" دانیال نے عام سے لہجے میں کہا۔ معاً موبائل پر کال آنے لگی۔
"لو ابھی تم کہہ رہی تھی کون کال کرے گا اور ابھی موبائل آن کیے چند منٹ ہوئے ہیں اور کال آنے لگی ہے۔" دانیال مسکرایا اور ہاتھ بڑھا کر موبائل اسے پکڑا دیا۔ خولہ کا دل خوش فہم ہوا کہ شاید احتشام کی کال ہو۔
"یہ زہرا کون ہے؟" دانیال کی آواز نے اس کی خوش فہمی کو سوکھی ریت کی طرح ہوا میں اچھال دیا۔
"زہرا...... زہرا...... میری دوست۔" خولہ نے مختصر جواب دیا۔ دانیال نے کال ریسیو کی۔
"خولہ خولہ تم ٹھیک ہو گئی ہو؟ خولہ میں کیا بتاؤں میں کتنی پریشان تھی...... ہر روز تمہارے موبائل پر صبح شام کال کرتی تھی مگر نمبر بند تھا...... آج بھی کال ملائی تو مجھے نہیں پتا تھا کہ تم سے بات ہو جائے گی۔" زہرا کی آواز میں نمی، خلوص، خوشی سب کچھ ملا جلا سا تھا۔
"مس زہرا میں دانیال ہوں خولہ کا بھائی۔" دانیال کی آواز سن کر زہرا چپ ہوئی اور کسی ان ہونی کے احساس سے لرز اٹھی۔
"وہ خولہ...... خولہ کہاں ہیں؟" اس کے آواز میں لرزتے اندیشے دانیال کو یہاں تک محسوس ہوئے۔
"خولہ اب بہتر ہے...... یہ لیں بات کریں اس سے۔" دانیال نے فون خولہ کی طرف بڑھایا۔
"خولہ...... خولہ......" زہرا کی آواز سننے کی دیر تھی اور خولہ کے آنسو بھل بھل بہنے لگے۔
"تم رو مت پلیز...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پہلے جیسا۔"
"اب کچھ پہلے جیسا نہیں ہوگا زہرا...... کچھ بھی نہیں۔" خولہ سسکنے لگی۔

"تم...... تم مجھے اپنا ایڈریس دو...... میں تم سے ملنے آؤں گی۔" زہرا نے تسلی دی اور کافی دیر اس سے بات کرتی رہی تھی۔

***

"دانی مجھے رنگ اور کینوس لادو۔" آٹو میٹک بیڈ کو تھوڑا سا اونچا کر کے وہ بیٹھنے کی پوزیشن میں آجاتی تھی۔ چند روز بعد اس نے دانیال سے فرمائش کی۔ دانیال تو جیسے انتظار میں تھا۔ وہ اس کے لیے رنگ، برش، کینوس اور ایک ایسا اسٹینڈ لے کر آیا جو اس کے بیڈ کے اوپر اس طرح فکس ہو جاتا تھا کہ وہ آسانی سے پینٹنگ کر سکتی تھی۔ وہ رنگوں سے کھیلنے لگی۔ اپنے اندر کی احساس محرومی کو رنگوں میں چھپا کر کینوس پر منتقل کرنے لگی تھی۔

"آپ چل نہیں سکتیں۔" اس کے کانوں میں ڈاکٹر کی آواز گونجی۔ اس نے ایک ہنستی مسکراتی، پرندوں کے پیچھے بھاگتی، دوڑتی، پھولوں اور درختوں کے درمیان لڑکی کی صورت بنا کر کینوس پر بکھیر دی تھی۔

"آپ ماں نہیں بن سکتی۔" ماں اور بچے کی ایک خوب صورت تصویر پینٹنگ کی شکل میں باہر آئی۔ پینٹنگ کر کے اس کے اندر کا غبار نکلنے لگا تھا۔ وہ کچھ بہتر محسوس کرنے لگی تھی۔ اچھا اور مثبت سوچنے لگی تھی۔ اس کے اندر جینے کی امنگ آنکھیں کھولنے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر ہر وقت کی بےزاری کے بجائے اکثر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔

زہرا اسے روز فون کرنے لگی اور پھر ایک دن وہ اس سے ملنے آپہنچی۔ دانیال اس لڑکی کے خلوص سے متاثر ہوا جو صرف دوستی کا رشتہ نبھانے یہاں تک آگئی تھی ورنہ تو خون کے رشتے بھی مشکل میں ہاتھ چھڑا لیتے ہیں۔

***

وہ تیزی سے بہتر ہو رہی تھی۔ اسے جیتا دیکھ کر اس کے گھر والے جی اٹھے تھے، اس کے ماں باپ، تایا تائی، بھائی سب خوش تھے۔ تایا، تائی روز آتے مگر احتشام کا نام نہ لیتے تھے مگر وہ ان سب کے چہروں میں اس ایک چہرے کو ڈھونڈتی تھی جو اس کا سب سے بڑھ کر محرم تھا۔ احتشام کہیں نہیں تھا۔ وہ تیزی سے بہتر ہو رہی تھی جب ایک دن احتشام چلا آیا۔ وہ اسٹینڈ سیٹ کیے پینٹنگ کرنے میں مصروف تھی۔ اس کو دیکھ کر اس کا دل ڈوب کر ابھرا۔ اسے لگا کہ وہ اس کے زخموں پر مرہم رکھنے آیا ہے مگر وہ تو اس کے زخموں پر آئے کھرانڈ تک کو کھرچ گیا تھا اور اس کے زخم پھر سے رسنے لگے تھے۔ وہ اسے چھوڑ کر آگے بڑھنا چاہتا تھا بڑھ جاتا مگر کیا ضروری تھا کہ وہ اس کو چھوڑنے کی وجوہات بےدردی سے بیان کرتا۔

"تم خود جانتی ہو کہ تم اب ادھوری ہو...... دوسروں کی محتاج ہو، ماں تم نہیں بن سکتی تو ایسے میں تم میرے کس کام کی ہو، بےکار ہوگئی ہو تم...... معذور دوسروں کے سہارے کی محتاج...... لہٰذا اب تم میرے ساتھ چلنے کے قابل نہیں ہو، سو میں نے تمہیں چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔" وہ رعونت سے بولا۔ وہ پیار سے بات کرتا تو وہ اس کی مجبوری جان کر اپنی جان بھی دے دیتی مگر وہ تو سنگ باری کر رہا تھا اس سے بڑا تماشا کیا ہوگا کہ جسے مسیحائی کرنا ہو وہی آپ کی تکلیف کو کئی گنا بڑھا کر چلا جائے۔ وہ گنگ ہوگئی یا شاید بےحس...... اس نے ہونٹوں سے ایک لفظ ادا نہ کیا مگر شکوے آنکھوں سے زار و قطار گرنے لگے تھے۔

"ہمیں معاف کر دینا خولہ۔" تایا تائی اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے کھڑے تھے۔

"تم ہمیشہ ہماری بیٹی رہو گی۔" تائی نے اسے گلے لگا کر کہا۔ امی چپکے چپکے آنسو بہاتی رہیں تو گویا سب احتشام کے اس فیصلے سے آگاہ تھے۔ بس ایک وہی بےخبر تھی یا شاید اسے جان بوجھ کر بےخبر رکھا گیا تھا۔ اس کے اندر اشتعال کی ایک لہر اٹھی اس نے جنونی کیفیت میں ہاتھ میں پکڑے برش کو زور زور سے کینوس پر پھیر کر تکمیل کے قریب تصویر کو بگاڑ دیا۔ برش دور پھینک دیا اور زور زور سے چیخ چیخ کر رونے لگی۔ اپنے بال نوچنے لگی۔ ڈاکٹر اور نرس نے اسے انجکشن دے کر پرسکون کیا۔

”میں نے آپ لوگوں سے کہا تھا ان کو کوئی شاک مت دیجیے گا۔“ ڈاکٹر کی بات سن کر سب خاموش کھڑے تھے۔ احتشام خولہ سے ملنے آیا تو ان سب کے چہروں پر امید کے دیے جگمگائے تھے مگر انہیں کیا خبر تھی کہ وہ خولہ کے چہرے سے امید کی روشنی بجھا کر چلا جائے گا۔ احتشام اسے صحرا میں اتری چاندنی رات جیسی حسین کہتا تھا مگر اب وہ صحرا میں اماوس کی رات جیسی ہوگئی تھی...... اجاڑ، ویران، تنہا، گھور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی۔

”دنیا میں اتنے گناہ گار لوگ ہوتے ہیں تو کچھ نہیں کہتا انہیں...... میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا جو تو نے مجھے یوں آسمان سے زمین پر لا پٹخا، لوگ تو اتنے بڑے بڑے حادثوں سے بچ جاتے ہیں کچھ نہیں ہوتا انہیں...... تو پھر مجھے کیوں نہیں بچایا تو نے اس حادثے سے، کیوں مجھے بے کار کردیا کہ آج وہ شخص مجھے دھتکار کر چلا گیا جو مجھے جان سے زیادہ پیارا تھا۔“ وہ بظاہر کمرے کی چھت کو گھور ہی تھی مگر دل میں اللہ سے شکوہ کناں تھی۔

”خولہ......“ دانیال نے اسے پکارا مگر وہ چھت کو تکتی رہی۔

”خولہ ادھر دیکھو۔“ اس نے پھر پکارا۔

”احتشام کی باتوں پر دکھی ہو؟“ اس کی خاموشی پر سوال کیا، ایسا سوال جو اس کی رگ جاں چیر گیا۔

”تو کیا نہیں ہونا چاہیے تھا دکھی۔“ اس کا لہجہ بہت ٹوٹا ہوا تھا۔

”اصل رشتوں کی اصل پہچان مشکل وقت میں ہوتی ہے۔ اس مشکل وقت نے تمہیں احتشام کی پہچان کروا دی۔“ دانیال چاہتا تھا کہ وہ اس حقیقت کو جلد قبول کرلے۔ یہی اس کے لیے اچھا تھا۔

”نہیں کرنی مجھے ایسی پہچان...... میں مر کیوں نہیں گئی، کیوں زندہ رکھا اللہ نے مجھے، جب مجھے یوں ہی بستر پر ہی ڈالنا تھا تو......“ وہ بات کرتے ہوئے رو دی۔ چاک دامن تو خیر سل ہی جاتے ہیں مگر چاک ہستیوں کی رفو گری بڑی مشکل ہوتی ہے۔ اس کی ہستی بھی چاک تھی اس وقت۔ جسے وہ رفو گر بھی تھی وہ تو چھوڑ گیا تھا۔ کوئی دکھ سا دکھ تھا۔

”خولہ اللہ کے ہر کام میں کوئی نا کوئی مصلحت ہوتی......“

”کون سی مصلحت...... میرے ایسے وجود سے اس کی کون سے مصلحت جڑی ہے۔“ خولہ نے دانیال کی بات کاٹ دی۔

”خولہ مشکل ترین وقت میں قریب ترین سہارے کو تھام لینا چاہیے۔ چھوٹ جانے والے یا دور ہو جانے والے سہارے کے غم میں روتے رہنے سے پار نہیں لگا جاتا بلکہ قریب ترین سہارے کو تھام کر بچنے اور جینے کی امید کی جاسکتی ہے۔ ہم تمہارے اپنے ہیں تمہارا قریبی سہارا ہیں جو تمہیں جیتا دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر تم کیوں چھوٹ جانے والے سہارے کے پیچھے خود کو یوں ہلکان کررہی ہو۔“ دانیال نے بڑی محبت سے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

”دیکھو اگر تم خود کو احتشام کی جگہ رکھ کر سوچو گی تو وہ اتنا غلط نہیں ہے۔ عام انسانوں کو جینے کے لیے عام حالات چاہیے ہوتے ہیں۔“

”ہاں وہ عام ہی تھا مجھے افسوس رہے گا میں اس کی تمام زندگی کے عام تقاضے پورے کرنے کے قابل نہیں رہی۔“ وہ جو خاموشی سے دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ پھیلی جسے نچوڑا جائے تو آنسو گریں۔

”زندگی ایک ایسی شاہراہ ہے، جس پر ایک مقررہ مدت تک سفر کرنا ہی ہوتا ہے چاہے خوشی سے کریں یا رو کر...... تم سوچنا تمہیں اگر اللہ نے زندگی دی ہے تو کیوں؟ ڈھونڈنا اس کیوں کو جب تمہیں اس کیوں کا جواب مل جائے گا تو پھر تم زندگی جیو گی اور زندگی جینا صرف زندہ رہنے سے کہیں زیادہ اہم ہے۔“ دانیال اس کی پیشانی پر بوسہ دے کر چلا گیا۔ اس کا ماں جایا جو اسے ہر صورت اس یاسیت سے باہر نکالنا چاہتا تھا۔

بہت دنوں تک اس پر یاسیت طاری رہی تھی۔

"نرس میرے رنگ، برش اور کینوس تو لا دیں۔" بہت دنوں کے بعد اس نے فرمائش کی تو نرس نے خوشی خوشی کینوس سیٹ کر کے رنگ اور برش اس کو پکڑائے (اس نے خزاں کے منظر کو پینٹ کرتے کرتے ایک ٹنڈ منڈ درخت میں بہار کے مناظر پینٹ کر دیے۔ ایک اور شاہکار وجود میں آ گیا تھا۔

پورا ایک سال اسپتال میں گزار کر وہ گھر آ گئی تھی۔ اس دوران دانیال اور زہرا دونوں نے اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ ہر لمحہ خیال رکھا تھا۔ وہ ان دونوں کی ممنون تھی۔ اس کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ اور نرس رکھ دی گئی تھی۔ وہ اب ذہنی طور پر بھی بہتر ہو رہی تھی مگر بیٹھنے سے اب بھی قاصر تھی۔ اب بھی اس کی کچھ سرجری رہتی تھیں۔ ان کے بعد امید تھی کہ وہ بیٹھنے کے قابل ہو جائے گی۔ ماں باپ، تایا تائی تو اسے دیکھ کر جیتے تھے۔ دانیال اللہ کے بعد اس کا سب سے بڑا اسہارا بن گیا تھا۔ قدم قدم پر اس کے ساتھ۔ سائیکاٹرسٹ سے اس کی کئی سٹنگ کروائی تھیں اس نے تا کہ وہ نارمل انداز میں سوچنے سمجھنے کے قابل ہو جائے جو ناممکن تو نہ تھا مگر آسان بھی نہ تھا۔

پھر ایک واقعے نے جیسے اس پر ایک نئی زندگی کا باب کھول دیا تھا۔ اس کی کل وقتی ملازمہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ خولہ نے اسے سرونٹ کوارٹر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ رات کو اسے ویسے بھی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی تھی ملازمہ کی۔ خولہ گہری نیند میں تھی۔ اسے لگا اس کے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے ہیں۔ یہ احساس اتنا شدید تھا کہ گہری نیند میں بھی اسے پوری جزئیات سے محسوس ہوا تھا۔ یہ احساس مزید زور آور ہوا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے سامنے دیوار پر لگی گھڑی میں وقت دیکھا جہاں تین بج رہے تھے اور اسے شدید پیاس لگ رہی تھی۔ اس نے گردن گھما کر ارد گرد دیکھا۔ پانی کی بوتل سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی تھی۔ اس نے بوتل پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا

مگر بوتل اس کی پہنچ سے دور تھی۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ موبائل اس کے تکیے کے پاس رکھا تھا مگر اسے اچھا نہ لگا کہ اس وقت وہ کسی کو تنگ کرتی۔

"خولہ تمہارے پاس دو راستے ہیں یا تو صبح تک پیاسی رہو جب تک کہ کوئی آ کر تمہیں پانی نہیں دیتا اور دوسرا اس مسئلے کا حل ڈھونڈو۔" اس نے دل ہی دل میں کہا اور اپنے ارد گرد نظر دوڑائی۔ اس کے بستر پر لمبی ڈنڈی والا نیا پینٹ برش رکھا تھا جو آج ہی دانیال اس کے لیے لایا تھا۔ اس نے وہ برش پکڑا اور ہاتھ بڑھا کر اس بوتل کے نزدیک کیا، برش کی ڈنڈی اس نے بوتل کے ربن میں پھنسا کر اسے اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ بوتل اس کے پہلو میں آ گری۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اس نے بوتل کو منہ لگا کر جی بھر پانی پیا۔ یوں لگا جیسے پانی کا ہر گھونٹ اس کے اندر طاقت کا ایک نیا در کھول رہا ہو۔ اس کے سامنے زندہ رہنے کا فارمولا آ گیا تھا۔

"محتاجی گھٹانے کے لیے مجھے اپنی ہر چیز کو اپنی پہنچ میں رکھنا ہوگا۔" اس کا دل خوشی سے جھومنے لگا۔ رات کا یہ پہر اس کے دل پر یقین کو الہام کی صورت اتار رہا تھا۔

"بس خولہ تجھے ایسے نہیں جینا...... تجھے حل نکالنا ہے، اپنے مسائل کا۔" اس نے دل ہی دل میں مصمم ارادہ کیا اور آنکھیں موند کر اللہ سے باتیں کرنے لگی۔

"یا اللہ مجھے معاف کرنا یقیناً آپ نے مجھے زندہ رکھا ہے تو کسی وجہ سے، بس اب مجھ میں ہمت پیدا کرنا ہے تا کہ میں تیری منشا کو سمجھ سکوں اور اس مقصد کے حصول میں کامیاب ہو جاؤں جس کے لیے تو نے مجھے منتخب کیا ہے۔ میں بتا سکوں دنیا کو کہ میں ناکارہ نہیں...... مجھے اپنے لیے لوگوں کی آنکھوں میں ترس نہیں بلکہ ستائش دیکھنی ہے۔ مجھے ہمت دے مولا...... میرے گناہ معاف کر اور میرے وہ شکوے بھی جو میں نے مایوسی میں تجھ سے کیے اور مجھے ہمت دے...... ہمت دے۔" اس نے اپنی ہتھیلی سے حسرتوں کو جھاڑ کر اس پر آرزوؤں کے نئے پھول دھر لیے تھے۔ گویا رات کے یہ پہر اسے حسرتوں کو

خواہشوں میں بدلنے کا گر سکھا گیا تھا۔

وہ بہادر ہوگئی کیونکہ جان گئی تھی کہ بزدل مریض کو کوئی ڈاکٹر اچھا نہیں کرسکتا۔ اس میں جینے کی امنگ دگنی ہوگئی تھی۔ اس نے پوری طاقت سے اپنی کمزوری کو زیر کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ وہ پوری طاقت سے ڈٹ گئی۔

"ارے ایسے ہی یہ لوگ اپنا وقت اور پیسہ برباد کررہے ہیں۔ اب یہ کہاں ٹھیک ہوگی۔" عیادت کا لبادہ اوڑھ کر لوگ اس کے سامنے ایسی باتیں کرتے۔

"بے چاری بڑی ہی بدقسمت ہے، ہمیشہ کی معذوری کوئی کم تکلیف دہ ہوتی ہے۔" ان کی ترس بھری نظریں۔

اس نے اپنے ہر خوف پر قابو پالیا تھا اور جب قابو پالیا تو پھر نڈر ہوگئی تھی۔ لوگوں کی باتوں کا نرمی سے جواب دینے لگی۔ یہ بات بھی ان لوگوں سے برداشت نہ ہوئی۔

"سارا جسم ٹوٹ پھوٹ گیا مگر زبان تو ایسے ہی چلتی ہے۔"

"رسی جل گئی مگر بل نہ گئے بھئی۔" اس کے پیٹھ پیچھے اس کے گھر والوں کے سامنے یہ زہریلے جملے کہے جاتے جو اس کے گھر والوں کو سانپ کی طرح ڈس لیتے مگر وہ خاموش تھے۔ انہیں انتظار تھا اس وقت کا جب خولہ بالکل تندرست ہوجاتی۔

دانیال نے اس کی رپورٹس کینیڈا بھیجیں۔ وہاں سے حوصلہ افزا جواب آیا کہ علاج سے ان کے ٹھیک ہونے کے اسی فی صد چانس موجود تھے۔ کینیڈا جانے سے پہلے زہرا ایک بار پھر اس سے ملنے آئی۔

"بس اب تم بالکل ٹھیک ہوکر آؤں گی ان شاء اللہ...... ہم سب تمہارا انتظار کررہے ہیں۔" زہرا نے اسے گلے لگایا تھا۔ اس کے لمس میں بڑی گرم جوشی تھی۔ دانیال نے زہرا کے چہرے کو غور سے دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں۔

دانیال اسے ساتھ لے کر کینیڈا آگیا۔ امی ابو، تایا تائی سب اس کے لیے دعاگو تھے۔ یہاں آکر اس کے بہت سارے ٹیسٹ ہوئے اور پھر اس کا علاج شروع ہوگیا تھا۔

"خولہ حوصلہ رکھنا علاج مشکل اور تکلیف دہ ہے۔" دانیال اسے تسلی دیتا۔

"اب میں ہر تکلیف اور مشکل برداشت کروں گی اور ان شاء اللہ ٹھیک ہوجاؤں گی۔" دانیال اس کے اس بدلاؤ پر حیران تھا۔ کہاں تو اس کے شکوے شکایات، ناامیدی اور کہاں اتنا یقین۔

"حیران مت ہو دانی...... وہ اللہ جو چیونٹی کے چلنے کی آواز تک سنتا ہے وہ ہماری آواز ان سنی کیسے کرسکتا ہے، وہ سنتا ہے، سب سنتا ہے، بس ہم انسان بے حد جلد باز ہیں۔ میں بھی بے صبری ہورہی تھی مگر اب میں پریقین ہوں کہ وہ رب میری پکار کا جواب دے گا۔ ضرور دے گا۔" خولہ نے جذب سے آنکھیں بند کرکے کہا۔ اس کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا۔ دانیال کی آنکھیں نم ہوئیں وہ اس کے جلد ٹھیک ہوجانے کے لیے دعاگو ہوا تھا۔

"تم......! تم یہاں کیوں آئے ہو؟" تایا جان نے احتشام کو حویلی کے صدر دروازے سے اندر آتے دیکھا تو آگے بڑھ کر اس کے راستے میں حائل ہوئے۔

"آپ لوگوں سے ملنے۔"

"ہم 'لوگ' ہیں یہ بات تم ثابت کرچکے ہو۔ اب یہاں تمہارا کوئی کام نہیں ہے۔"

"ابو آپ اپنی بھتیجی کو بیٹے پر فوقیت دے رہے ہیں؟" احتشام نے جذباتی انداز اپنایا۔

"نہیں...... میں اس بات پر شرمندہ ہوں کہ میرا تم جیسا بیٹا ہے، وہ میری لاڈلی بھتیجی جسے میں جتنا بھی پیار کرتا تم سے پھر بھی کم ہی ہوتا تھا۔ جب قدرت نے اتنے بڑے امتحان میں ڈالا اور تم نے اسے بے آسرا کردیا تو یقین جانو تم میرے دل سے نکل گئے۔" تایا جان کے لہجے میں دکھ ہی دکھ تھا۔

"تو آپ یہ چاہتے تھے کہ میں اس معذور کے ساتھ ساری زندگی ضائع کردیتا اپنی۔" وہ احتشام تھا جس میں برداشت کی ہمیشہ سے کمی تھی۔ اب بھی وہ پھٹ پڑا تھا۔ خولہ کے لیے لفظ "معذور" نے تایا کے غصے پر گویا پٹرول چھڑک دیا تھا۔

"تم نکل جاؤ یہاں سے....." وہ گرجے، ان کی اونچی آواز سن کر خولہ کے امی ابو اور تائی بھی باہر آگئے۔

"جارہا ہوں..... میں شادی کررہا ہوں۔ آپ لوگوں کو بتانے آیا تھا تاکہ آپ لوگ میری خوشیوں میں شامل ہوں مگر آپ لوگوں کو تو خولہ کے ماتم سے ہی فرصت نہیں ہے۔" وہ زہرخند لہجے میں گویا ہوا۔

"احتشام اپنی زبان کو لگام دو۔" خولہ کے ابو نے اسے ٹوکا۔ خولہ کی امی گھٹ گھٹ کر رونے لگیں۔ احتشام اپنی ماں کی طرف متوجہ ہوا۔

"کیا آپ بھی یہی چاہتی تھیں کہ میں خولہ کے ساتھ بندھا رہتا؟" وہ ماں کے سامنے کھڑا ہوا۔

"نہیں۔" سب نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"کیونکہ عام لوگوں سے خاص کاموں کی توقع رکھنا بے کار ہے۔ تم خولہ کو چھوڑ دیتے یہ تمہارا حق تھا مگر جس طرح تم نے اس کی روح کو زخمی کرکے یہ کام کیا ہے وہ ناقابل برداشت ہے..... مجھے افسوس ہے کہ میرا بیٹا ایک عام انسان ہے۔" تائی نے مضبوط لہجے میں بات مکمل کی۔

"اوہ تو آپ سب کی ملی بھگت ہے یہ۔"

"ہمیں مزید دکھ مت دو..... خولہ کے دکھ نے ہماری ساری توانائیاں کھالی ہیں۔ ہمیں اپنی باتوں سے مزید زخمی مت کرو، جاؤ چلے جاؤ احتشام اس سے پہلے کہ تم ہماری دعاؤں سے نکل جاؤ۔" تائی نے اس کو دیکھ کر کہا۔

"تو آپ بددعا کریں گی میرے لیے..... اپنے بیٹے کے لیے....."

"نہیں مگر کسی کی دعاؤں سے نکل جانا بھی ایک طرح کی بددعا ہی ہوتا ہے۔"

"جارہا ہوں میں اور شانزے سے شادی کررہا ہوں..... شادی کے بعد ہم لوگ باہر سیٹل ہوجائیں گے۔ بس یہی بتانے آیا تھا میں۔" احتشام لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ تایا جان جو اس کے سامنے مضبوطی سے کھڑے تھے۔ بھری بھری ریت کی طرح ہوگئے، خولہ کے ابو انہیں سہارا دے کر اندر لے گئے تھے۔

❀ ❀ ❀

خولہ نے ہارنے کی بجائے کوشش کا ارادہ باندھ لیا اور وہ جیت گئی۔ اللہ نے اس کی کوششوں کو بارآور کیا۔ اس کی دو چھوٹی اور بڑی سرجریز ہوئیں۔ آج پورے دو سال بعد وہ وہیل چیئر پر بیٹھی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا۔ ڈاکٹرز نے اس کے علاج کے مکمل ہونے کی نوید سنائی اور دانیال کو اپنے ساتھ لے گیا۔

"مسٹر دانیال اب ان کا علاج مکمل ہوچکا ہے..... یہاں سے آگے مزید علاج ممکن نہیں ہے۔ زندگی بھر کے لیے چلنے پھرنے سے معذور ہوگئی ہیں۔" دانیال خاموش رہا۔

"آپ لوگ شکر ادا کیجیے کہ خولہ اتنا ٹھیک ہوگئی ہیں ورنہ جو ان کے حالات تھے اتنا بھی مشکل نظر آرہا تھا..... ان کی اسپائنل کورڈ میں اتنا سدھار بھی کسی معجزے سے کم نہیں ہے کہ وہ اپنے اوپری دھڑ کو اپنی مرضی سے حرکت دینے کے قابل ہوگئی ہیں۔ کسی کی دعائیں کام آگئی ہیں آپ لوگوں کے۔" ڈاکٹر نے دانیال کی خاموشی کو محسوس کرکے تسلی دی۔

ڈاکٹرز نے یہ ساری باتیں خولہ سے بھی کیں۔ ساری تفصیل اسے بتائی تو وہ اللہ کی شکر گزار ہوئی کہ وہ ہمیشہ لیٹے رہنے کی معذوری سے تو بچ گئی تھی۔ دانیال اس کے پاس آیا تو وہ زیادہ خوش نہیں تھا۔

"دانی ایسے منہ کیوں لٹکایا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے ٹھنڈی سانس کھینچی۔

"تم ڈاکٹروں کی بات سن کر پریشان ہو؟" دانیال خاموش رہا۔

”کم آن دانی میں اپنی مرضی سے اٹھ بیٹھ سکتی ہوں۔ اپنے ہاتھوں کو استعمال کر سکتی ہوں۔ میرا دماغ بالکل درست حالت میں ہے۔ آنکھوں کی بینائی پوری ہے۔ میں اپنے اوپری دھڑ کو اپنی مرضی سے حرکت دے سکتی ہوں...... ہاں چہرے پر ہلکے نشان ہیں مگر چہرہ تو سلامت ہے ناں۔“ خولہ ایک ایک کر کے نعمتوں کو گننے لگی۔

”مگر ہمیشہ کے لیے وہیل چیئر......“ دانیال یاسیت کا شکار ہوا۔ وہ بڑی امید لے کر آیا تھا کہ خولہ اپنے قدموں پر چل کر گھر جائے گی۔

”یہ وہیل چیئر میری کمزوری نہیں...... میری سب سے بڑی طاقت ہے۔ دانی یہ بات یاد رکھنا۔“ مثبت سوچ اس کا سب سے بڑا وطیرہ بننے لگی تھی۔ اب اس نے منفی نہیں سوچنا تھا یہ طے کر لیا تھا۔

***

خولہ گھر آ چکی تھی۔ ماں باپ اس کا حوصلہ دیکھ کر خود بھی حوصلہ پکڑنے لگے تھے۔ تایا تائی اب بھی اس کے واری صدقے جاتے۔ زہرا مسلسل اس کے ساتھ رابطے میں تھی۔ گھر آنے کے بعد سب سے پہلے اسے احتشام کی شادی کی خبر ملی تھی۔ گھر والوں نے تو اسے کچھ نہیں بتایا تھا مگر عیادت اور ہمدردی کی آڑ میں کسی مہرباں نے اسے یہ راز بھی مزے لے لے کر بتایا تھا۔ اس کا دل ڈولا مگر اس نے خود پر قابو پا کر ہونٹوں پر مسکراہٹ سجالی تھی۔ سنانے والے کو مطلوبہ نتائج نہ ملے تو بدمزہ ہو کر اٹھ گیا تھا۔

”تو احتشام تم نے نئی زندگی کا آغاز کر دیا۔“

”کیوں تمہیں دکھ ہو رہا ہے؟“ اس کے اندر سے آواز آئی۔

”دکھ...... نہیں دکھ نہیں مگر اپنی کیفیت بھی سمجھ نہیں آ رہی۔“ وہ ہولے سے بڑبڑائی۔ ساری رات وہ بے چین رہی۔ اس نے کھڑکی کے پار نظریں دوڑائیں۔ صبح ابھی تک رات کے زندان میں قید تھی مگر آخر کو اسے آزاد ہونا ہی تھا۔ وہ مسکرادی ٹوٹے کانچ سی لبریز مسکراہٹ۔

***

سب ناشتے کی میز پر موجود تھے۔ خولہ بھی اپنی وہیل چیئر وہیں لے آئی تھی۔

”آج سے میں سب کے ساتھ ناشتا کیا کروں گی۔“

”احتشام نے شادی کر لی ہے؟“ سب خاموشی سے ناشتا کر رہے تھے۔ بس چمچوں کے پلیٹوں سے ٹکرانے اور چائے کے کپ پرچ سے اٹھانے اور رکھنے کی ہلکی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ خولہ کا سوال سن کر یہ آوازیں بھی معدوم ہو گئیں اور ایک دم سناٹا چھا گیا تھا۔

”آرام سے ناشتا کرو خولہ۔“ اس کی امی نے کہا۔

”وہ تو کر رہی ہوں...... مگر آپ لوگ مجھ سے کچھ مت چھپائیں، مجھے سب پتا چل گیا ہے۔“ خولہ نے حتی الامکان کوشش کی کہ اس کا لہجہ عام رہے۔ سب خاموش رہے۔

”اللہ گواہ ہے میں اب دکھی نہیں ہوتی...... یہ اس کا حق تھا کہ وہ ایک نارمل زندگی گزارے۔“ سب کے پاس جواب میں اب بھی خاموشی تھی۔

وہ احتشام کی شادی کرنا بھی سہہ گئی کیونکہ اس کے اندر جینے کی لگن پیدا ہو گئی تھی۔ زندگی نے اسے اور اس نے زندگی کو اپنا لیا تھا۔

”تمہیں شادی بہت بہت مبارک ہو...... خوش رہو ہمیشہ...... مجھے اب کھوکھلے سہاروں کی ضرورت نہیں رہی احتشام۔“ خولہ نے احتشام کو ٹیکسٹ کر کے شادی کی مبارک باد دی اور ساتھ ہی اپنے لیے طلاق کا مطالبہ بھی کر دیا۔

اس کے ٹیکسٹ کے ٹھیک پندرہ دن بعد ایک مہر بند لفافے میں احتشام کی جانب سے آزادی کا پروانہ مل گیا تھا۔ خولہ کے اندر کچھ کرچی کرچی ہوا تھا۔ مطالبہ کرنے کے باوجود اسے یہ امید تھی کہ وہ اسے طلاق نہیں دے گا۔ نام کا ہی سہی رشتہ قائم رکھے گا مگر احتشام نے ایک ہی پھونک مار کر اس کی امید کا دیا بجھا دیا تھا۔ یہ طلاق نامہ

احتشام کو ہمیشہ کے لیے سب سے جدا کر گیا تھا۔

❁ ❁

''زہرا آپ نے خولہ کے لیے جو کچھ بھی کیا ہے اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں...... آپ جیسے پرخلوص لوگ بہت کم ہوتے ہیں دنیا میں۔'' دانیال بھی زہرا سے اب کبھی کبھار بات کر لیتا تھا۔ دونوں میں اب اجنبیت قدرے کم ہوگئی تھی۔ زہرا دانیال کے دل میں ایک خاص مقام حاصل کر چکی تھی۔ اچھی لگنے لگی تھی اسے، آہستہ آہستہ دونوں میں اب بے تکلفی ہوتی جارہی تھی۔ یہ بے تکلفی پیدا کرنے میں زیادہ تر کوشش دانیال نے ہی کی تھی۔ دانیال کے دل میں پیدا ہوتے احساسات سے زہرا بے خبر تھی۔

❁ ❁

خولہ خود اٹھ کر کسی چیز کا سہارا لے کر وہیل چیئر پر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ جب اسے وہیل چیئر پر بیٹھنے اور اٹھنے کی پریکٹس ہوگئی تو اس نے گھر سے نکلنا شروع کر دیا۔ لوگوں سے ملنے جلنے لگی۔ پینٹنگز پر سنجیدگی سے کام کرنے لگی۔ ان دو سالوں میں اس نے کیا کچھ برداشت نہیں کیا تھا۔ ایسے میں صرف چند مخلص رشتے ہی اس کے ساتھ رہے تھے۔ ان میں سے دانیال اس کا سب سے مضبوط سہارا رہا تھا۔

''دانی تم میرا ایک کام کرو گے؟'' خولہ لان میں بیٹھی ہوئی تھی جب دانیال اس کے پاس آیا اور سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''یار اتنی فارمل کیوں ہو رہی ہو؟ پہلے کی طرح رعب سے کہو۔'' پھیکی سی مسکراہٹ خولہ کے ہونٹوں پر رینگی۔

''کل زہرا سے میری بات ہوئی تھی۔ کراچی میں اس کی خالہ کی آرٹ ایگزیبشن ہے۔ وہ کہہ رہی ہے کہ میں اپنی پینٹنگز اسے بھجوادوں تاکہ وہ اسے ایگزیبشن میں رکھوا دے۔''

''بھجوا کیوں دوں ڈیئر میں خود لے کر جاؤں گا تمہاری پینٹنگز۔'' دانیال نے مبہم سی مسکراہٹ سے کہا۔

''نہیں تم بھجوادو...... خود کراچی جانے کی کیا ضرورت ہے؟'' خولہ نے اسے دیکھ کر کہا۔

''ہے ناں ضرورت...... میں ویسے بھی پرسوں کراچی جانے والا ہوں تو لے جاؤں گا ساتھ اور پھر میڈم زہرا سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہو جائے گا۔'' زہرا کے ذکر پر دانیال کے چہرے پر محسوس کی جانے والی خوشی پھیل گئی تھی۔

''دانی...... ی ی ی۔'' خولہ نے تنبیہی انداز اختیار کیا۔

''جی......'' دانیال مودب ہوا۔

''دوست ہے وہ میری۔'' خولہ چڑی تھی اس کے انداز پر۔

''ہے تو دوست اگر بھابی بن جائے تو کیا مضائقہ ہے؟'' دانیال نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر سوال کیا اور پھر فوراً سے پہلے نظریں جھکالیں۔ خولہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

''سیریسلی آر یو انٹرسٹ ان ہر؟ (تم واقعی اسے پسند کرتے ہو؟)'' خولہ کا انداز حیرانی لیے ہوئے تھا۔

''یس آئی ایم (ہاں میں کرتا ہوں)۔'' دانیال نے اسی انداز میں کہا۔

''او مائی گاڈ آئی ایم سو ہیپی فار یو (اوہ خدایا میں تمہارے لیے بہت خوش ہوں)۔'' خولہ نے وہیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے اپنے دونوں بازو پھیلا کر آسمان کی طرف چہرا اٹھا کر خوشی کا اظہار کیا۔ دانیال کو اس کے انداز پر ہنسی آئی۔

''اچھا اب زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔'' دانیال نے اس کے جوش کے آگے بند باندھا۔

''میں بات کروں امی بابا سے؟''

''ظاہر ہے تم ہی کرو گی آفٹر آل میں ایک مشرقی لڑکا ہوں۔ اپنے منہ سے کہتا ہوا اچھا لگوں گا کیا۔'' خولہ اس کے انداز پر قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ دانیال نے محبت سے اس کے چہرے کو دیکھا جواب پہلے کی طرح صاف ستھرا اور

چمکدار ہوگیا تھا۔ اس نے اس کی دائمی خوشیوں کی دعا کی تھی۔

❀ ❀

"بابا میں جاب کرنا چاہتی ہوں۔" خولہ نے فرمائش کی۔

"بیٹا......"

"پلیز بابا میں جانتی ہوں مجھے ضرورت نہیں ہے۔ آپ لوگ مجھے افورڈ کرسکتے ہیں مگر میں خود کمانا چاہتی ہوں۔ مجھے اپنی معذوری کو شکست دینا ہے۔" وہ کئی جگہوں پر انٹرویوز کے لیے گئی مگر دھتکار دی گئی۔

"آپ خود کو تو سنبھال نہیں سکتیں کام کیسے کریں گی؟" اس کا دل ٹوٹا، لوگوں کے جملے اسے اتنی ہی تکلیف دیتے تھے جتنی تکلیف اسے اس کھائی میں گرتے وقت ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو جاتا مگر اگلے ہی لمحے وہ خود پر قابو پالیتی تھی۔

"مجھے ایک موقع تو دیں آپ۔"

"یہاں تو اچھے خاصے نوجوانوں کو موقع نہیں ملتا آپ تو پھر......" ایک کمپنی کے جی ایم نے اس کی ٹانگوں کو ترحم سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اپنی وہیل چیئر گھسیٹتی ہوئی باہر آگئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

"تو نے مجھے جینے کا حوصلہ بخشا ہے پر تیرے یہ بندے یہ حوصلہ چھینا چاہتے ہیں۔ میری مدد کر اللہ...... مجھے جینا ہے، تیری دی ہوئی اس زندگی کو ایسے کام میں استعمال کرنا ہے کہ لوگ میری معذوری کو بھول کر مجھے صرف میرے کام کی وجہ سے یاد رکھیں۔" لوگوں کے رویے اسے پھر سے مایوسی کی طرف دھکیلنے لگے تھے مگر اب اللہ نے اس کو مایوسیوں سے بچا کر روشن راہ پر لا کھڑا کیا تھا۔

❀ ❀

آج کی صبح بہت روشن تھی یا اسے محسوس ہو رہی تھی۔ خولہ اپنی آٹومیٹک وہیل چیئر پر بیٹھ کر باہر نکل آئی۔ اس کا موڈ بہت خوش گوار تھا۔ ہر چیز جیسے اسے خوشی کی نوید سناتی ہوئی لگ رہی تھی۔ وہ قدرت کے نظاروں کو دیکھ کر مسکرا دی۔ پرندوں کا ایک غول کافی نیچے پرواز کرتے ہوئے اس کے پاس سے گزرا تھا، اتنے قریب سے کہ اسے ان کے پروں کی ہوا اپنے چہرے پر محسوس ہوئی تھی۔ وہ مسکرا کر گردن موڑے پرندوں کو دور تک جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ اچانک گلاب کی مسحور کن خوشبو نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچی اس نے اپنے دائیں طرف دیکھا تو ایک بڑا سا گلاب صبح کی پوری تازگی اپنے اندر سموئے ہولے ہولے جھوم رہا تھا۔

"اوہ......" وہ وہیں بیٹھی ہوئی لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ اس کا موڈ مزید خوش گوار ہوگیا تھا۔

اسی شام کو زہرا کا فون آیا۔ ایگزیبشن میں اس کی پینٹنگز کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ اس کا کام دیکھ کر آرٹ کے ایک بہت بڑے ادارے نے اسے اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر کی تھی اور وہ اللہ کی اس عطا اور مدد پر جھک جھک گئی کیونکہ وہ جاب کی طرف سے مایوس ہونے لگی تھی۔ لوگوں کے رویے اسے دوبارہ سے توڑنے لگے تھے مگر اللہ نے اسے ایک بار پھر سے ٹوٹ پھوٹ سے بچالیا تھا۔

"زہرا تم نے انہیں میرے بارے میں سب کچھ بتایا ہے ناں؟" زہرا سمجھ گئی کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔

"بے فکر رہو، خالہ نے ساری تفصیلات بتا دی ہیں انہیں۔ وہ لوگ تمہیں ہر طرح سے اکاموڈیٹ کریں گے۔ تمہیں بس کراچی شفٹ ہونا ہے۔" زہرا کا انداز تسلی لیے ہوئے تھا۔

"کوئی مسئلہ نہیں ہو جائے گا سب۔" خولہ نے خوشی سے کانپتی آواز میں کہا۔

پھر امی بابا اور سب سے بڑھ کر دانیال کی مدد سے وہ کراچی شفٹ ہوگئی۔ دانیال بھی اس کے ساتھ ہی کراچی شفٹ ہوگیا تھا۔ اس نے کراچی والا اپنا بزنس سنبھال لیا تھا۔ کراچی آکر خولہ کو کیا کچھ یاد نہیں آیا تھا۔ کراچی میں گزارے بہاروں جیسے دن، احتشام کی محبت، اس کا

والہانہ پن، لوگوں کا ان پر رشک...... سب یاد آیا اور کئی بار اس کی آنکھیں نم کر گیا مگر اب اسے ماضی میں نہیں جینا تھا۔ خولہ نے ساری پرانی سوچوں کو جھٹک کر حال پر توجہ مرکوز کر لی تھی۔ زرینہ اس کی دیرینہ ملازمہ تھی جو اس کے ساتھ آئی تھی۔ ایک گاڑی اور ڈرائیور بھی ہر وقت اس کے لیے موجود تھے۔

"ہائے خولہ تم سے یہ ہیر کٹ تم پر بہت سوٹ کر رہا ہے۔" دانیال آفس سے واپس آیا تو زہرا کی آواز نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ اس نے آواز کی سمت دیکھا تو وہ خولہ کے ساتھ لاؤنج میں موجود تھی اور خولہ کی تعریفوں میں رطب اللسان تھی۔

"بھئی میڈم زہرا صاحبہ ویسے بندے کو اتنا بھی جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔" دانیال نے خولہ کے ہیر کٹ کا جائزہ لیتے ہوئے زہرا کو مخاطب کیا تو وہ اس لایعنی سی بات پر ایک دم خاموش ہوگئی۔ خولہ کو دانیال کے چہرے پر شرارت صاف نظر آرہی تھی۔

"میں نے آپ سے کیا جھوٹ بولا ہے؟" وہ ناک پھلا کر بولی۔

"میرے ساتھ تو آپ فالتو بات تک نہیں کرتیں تو جھوٹ کیا بولیں گی حالانکہ میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ لمبی لمبی باتیں کریں۔" دانیال نے شرارت سے کہا تو زہرا کا پارہ ہائی ہوگیا۔

"دانی......" خولہ نے ڈپٹ کر کہا۔

"زہرا چھوڑو اسے...... مذاق کر رہا ہے یہ اس کی عادت ہے۔" خولہ نے زہرا کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔

"جھوٹ تو بولا ہے میڈم نے۔" دانیال پھر بھی باز نہ آیا۔

"مانا کہ یہ ہیر کٹ خولہ پر سوٹ کر رہا ہے مگر اتنا بھی نہیں کہ بندہ میڈم زہرا کی طرح تعریفیں کرنے لگ جائے۔" زہرا نے اس کے انداز پر کڑے تیوروں سے اسے دیکھا تو وہ اپنا سامان اٹھا کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی جان دار مسکراہٹ تھی۔ خولہ نے ایک نظر تپی ہوئی زہرا پر ڈالی تو اس کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ رینگ گئی جو زہرا کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکی تھی۔

"تم دونوں بہن بھائی میرا مذاق اڑا رہے ہو؟" وہ کمر پر دونوں ہاتھ دائیں بائیں جما کر غصے سے بولی۔ خولہ اس کے انداز پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"میں جا رہی ہوں، بہت ہی بری ہو تم اور تمہارا وہ کھڑوس بھائی دانیال، اب نہیں آؤں گی میں ادھر۔" وہ غصے سے کہہ کر جانے لگی تو دانیال کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

"آنا تو میڈم آپ کو ادھر ہی ہے...... اس لیے ایسے دعوے مت کریں آپ۔"

"کیوں، زبردستی ہے کیا؟" بات کو گہرائی سے سمجھے بغیر وہ دوبدو ہوئی۔

"یہی سمجھ لیں۔" زہرا ہونہہ کہہ کر باہر چلی گئی اور دونوں بہن بھائیوں کے قہقہے نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

"نہ تنگ کیا کرو دانی اسے۔" خولہ نے محبت سے بھائی کا چہرا دیکھا تو وہ مسکرا دیا تھا۔

❁......❁......❁

خولہ نے آفس جوائن کر لیا تھا۔ اسے مسز احمد کے ساتھ کام کرنا تھا۔ مسز احمد بہت اچھی خاتون تھیں۔ جو دوسروں کو سکھانے اور ان کی بہترین صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے پر یقین رکھتی تھیں۔ شروع شروع میں خولہ کو مشکل ہوئی۔ بات چیت میں، لوگوں سے گھلنے ملنے میں مگر دانیال کی سپورٹ اور مسز احمد کی راہنمائی میں وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگی، چیزوں کو سمجھنے لگی، محنت سے سیکھنے لگی، یہ اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ بڑی جان مارنا پڑی تھی خولہ کو تب کہیں جا کر اس نے خود کو اس کام کا اہل ثابت کرنا شروع کر دیا تھا۔

❁......❁......❁
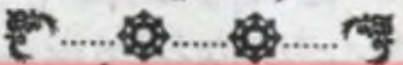
دانیال اور خولہ ایک ہفتے کے لیے گھر آئے ہوئے

تھے۔ امی، بابا، تایا، تائی سب بہت خوش تھے۔ آج ان کے لیے ناشتے پر خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔
"السلام علیکم!" سب ناشتہ کررہے تھے جب دانیال وہاں آیا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔
"وعلیکم السلام، میرے جوان......" تایا جان نے بڑے پرجوش انداز میں کہا، تب اس نے چائے کا کپ منہ سے لگایا۔
"سب کچھ اتنا اچھا بناتے ہیں ہمارے پچا شاکر مگر ایک چائے نہ بنانا آئی انہیں۔" دانیال نے چائے کا ایک گھونٹ بھر کر کپ واپس رکھا۔ اسے زہرا کی بنائی ہوئی چائے یاد آئی...... کیا چائے بناتی تھی وہ۔
"اماں اس کے لیے اچھی چائے بنانے والی کا بندوبست کردیں۔" خولہ شرارت سے مسکرائی تو دانیال بالوں پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔
"میں جانتی ہوں، ایک لڑکی کو...... بہت اچھی چائے بناتی ہے، اگر دانی کو کوئی اعتراض نہ ہوتو۔" خولہ تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے لگی۔
"آپ کریں جو کرنا ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مجھے ذرا کام سے جانا ہے تو میں چلتا ہوں۔" دانیال خولہ کو آنکھ مار کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میز کے گرد بیٹھے سب لوگ حیرانی سے دونوں بہن بھائیوں کی گفتگو ملاحظہ کررہے تھے۔
"اماں، بابا، تایا، تائی......" وہ باری باری سب سے مخاطب ہوئی۔
"میں اپنی زہرا کی بات کررہی ہوں...... دانی کی چاہت بھی ہے اگر آپ لوگوں کو مناسب لگے تو......" خولہ نے مناسب الفاظ میں بات ان تک پہنچائی۔ وہ سب تو جیسے تیار بیٹھے تھے۔
"عرصہ ہوا اس گھر میں خوشی کا وجود دیکھے...... اب ہم اس کام میں بالکل دیر نہیں کریں گے۔" اور پھر چٹ منگنی پٹ بیاہ ہوا اور زہرا دلہن بن کر دانیال کے سنگ آگئی۔

"کیوں میڈم زہرا میں نے کہا تھا ناں کہ آپ کو ادھر ہی آنا ہے...... اب بتائیں کیا کہتی ہیں؟" دانیال نے اس کے پاس بیٹھ کر کہا۔
"اچھا تو اس وقت آپ کا یہ مطلب تھا؟"
"جی......"
"تب میں بالکل نہیں سمجھی تھی۔" زہرا نے سادگی سے کہا۔
"اب تو سمجھ آگئی ہے ناں۔" تو وہ بے ساختہ سر ہلا گئی اور پھر صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے یک دم سر جھکا لیا۔ دانیال بے ساختہ ہنسا۔ زہرا کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔

❁......❁......❁
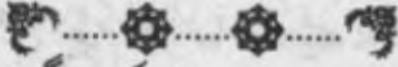
اس ادارے میں جاب خولہ کی زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوئی۔ خولہ نے نا صرف اپنی ساری ذمہ داریاں احسن طریقے سے سنبھال لیں بلکہ وہ ادارے کے دیگر پراجیکٹس میں بھی اپنی رائے کا اظہار کرنے لگی اور اس کی رائے میں اتنا وزن ہوتا کہ اس کو اہمیت دی جاتی۔ اس ادارے نے اس کی جسمانی معذوری کو نظر انداز کرکے اس کی ذہنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا تو اس کا منافع کمپنی اور خولہ دونوں کو سود سمیت واپس ملنے لگا۔ ابھی تک اس کا کام آفس کے اندر ہی تھا۔ اس کا ملنا جلنا زیادہ تر ادارے کے اسٹاف سے ہی تھا۔
"مس خولہ آپ کو مسز احمد بلا رہی ہیں۔" چپڑاسی نعیم نے اس کے کیبن کے دروازے پر دستک دے کر اطلاع دے کر جانے لگا۔
"نعیم بھائی بات سنیں پلیز......" خولہ کی آواز پر وہ پلٹا۔
"مسز احمد اکیلی ہیں یا کوئی اور بھی ہے ادھر؟" خولہ نے پوچھا۔
"میڈم جی، اکیلی ہیں۔"
"اچھا آپ یہ فائلز لے جا کر ان کی میز پر رکھیں، میں آرہی ہوں۔" خولہ نے اوپر نیچے رکھی ہوئی چار

فائلوں کی طرف اشارہ کیا تو نعیم نے فائلیں اٹھالیں۔
"آپ کا بہت شکریہ نعیم بھائی۔" وہ مسکرائی تو نعیم مسکرادیا۔
"مس شرمندہ نہ کیا کریں۔ ایک آپ ہی ہیں جو ہمارے ہر کام پر شکریہ ادا کرتی ہیں، باقی تو سب زرخرید غلام جیسا سلوک کرتے ہیں جی۔" بات مکمل کرکے وہ باہر نکل گیا تو خولہ افسوس سے سر ہلا کر رہ گئی۔ آفس میں سب تو نہیں مگر چند لوگ ایسے تھے جو واقعی نعیم کے ساتھ زیادتی کر جاتے تھے۔

❀......❀......❀

"آؤ خولہ۔" مسز احمد نے مسکرا کر اسے خوش آمدید کہا۔ خولہ نے اپنی وہیل چیئر ان کی میز کے بالکل سامنے روک لی اور سیٹ ہوکر بیٹھ گئی۔
"خولہ آپ بہت اچھی آرٹسٹ ہیں، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔" انہوں نے تمہید باندھی تو خولہ تشکر آمیز انداز میں مسکرائی۔
"ادارے کے زیر اہتمام آرٹ کے شارٹ کورسز کا آغاز کیا جارہا ہے اور اس کورس کی ایک کلاس آپ کو دی گئی ہے۔" ان کی بات سن کر خولہ پریشان ہوئی۔ آفس میں محدود لوگوں کے درمیان بیٹھ کر کام کرنا اور بات تھی۔
"آپ گھبرائیے نہیں، ان شاء اللہ آپ یہ کام بھی بہت اچھے سے کرلیں گی۔" مسز احمد نے اسے تسلی دی اور کورس کی تفصیلات پر بات کرنے لگیں۔ خولہ غور سے سن رہی تھی مگر اندر ہی اندر پریشان تھی۔
"آپ کو پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں، اس پراجیکٹ کو میں خود ہیڈ کر رہی ہوں۔" میٹنگ کے اختتام پر مسز احمد نے ایک بار پھر خولہ کو تسلی دی۔
خولہ ہچکچا رہی تھی لیکن مسز احمد کی حوصلہ افزائی پر اس نے کلاس لینے کا آغاز کردیا۔ بس چند دنوں کی بات تھی کہ وہ تھوڑا خوف زدہ اور پریشان رہی تھی اس کے بعد اس نے سب کا سامنا کرکے اپنے خوف پر قابو پالیا تو شاندار طریقے سے اپنا کورس بھی مکمل کروادیا۔ وہ اپنے طلبہ کی استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے انسپریشن بھی بن گئی تھی۔ اس کے طلبہ نے اپنی اس باہمت استاد کے ویڈیو کلپ فیس بک اور سوشل میڈیا پر ڈال دیے۔ ہر طرف جیسے اس کی ہمت اور بلند عزمی کی دھوم مچ گئی تھی۔
بس یہ آغاز تھا اس کے بعد اس نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ ہر کورس کی ایک کلاس لازماً مکمل کروائی تھی۔ زندگی بہت مصروف اور کسی حد تک سہل ہوگئی تھی بلکہ اسے تو اب زندگی اپنی تمام تر بدصورتیوں سمیت خوب صورت لگنے لگی تھی۔

❀......❀......❀

"خولہ...... اتنا اچھا بولتی ہو تم موٹیویشنل اسپیچ بھی بہت اچھی کرسکتی ہو۔" کچھ عرصے بعد مسز احمد نے پھر اسے گھیرا۔
"تو میم میں نہیں۔" وہ ایک بار پھر گھبراہٹ کا شکار ہوئی۔
"تم کرسکتی ہو، بس تھوڑی سی ٹریننگ کی ضرورت ہے۔" پھر اس کی ٹریننگ شروع ہوگئی اور اس ادارے کے زیر اہتمام موٹیویشنل کی تقاریر کی کلاسز اسے دی جانے لگیں۔
چھ سال گزر گئے تھے۔ ان چھ سالوں میں اس نے بہت کچھ پاکر وہ مطمئن ہوگئی تھی۔ اپنے اللہ کی رضا میں راضی...... اس کی چند تصاویر کو انٹرنیشنل آرٹ فیئر میں بھی بھیجا گیا تو وہ اول آئیں۔ انٹرنیشنل آرٹ فیئر والوں کی تقریب میں اسے مدعو کیا گیا جس میں اس نے انٹرنیشنل اسٹیج پر بات کرنی تھی اور جب اس کا نام اور کام بتا کر اسے اسٹیج پر آنے دعوت دی گئی تو وہ اپنی وہیل چیئر آپریٹ کرتی اسٹیج کے درمیان آکر ٹھہری تو پورا ہال تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا اور لوگ کھڑے ہوگئے۔ اتنی پذیرائی پر اس کا دل اللہ کے حضور سربسجود ہوا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ چند منٹ لگے تھے اسے خود پر قابو پانے میں اور پھر وہ بولنے لگی۔
"میں نے زندگی میں کبھی کوئی محرومی نہیں دیکھی تھی۔

بائیس سال کی عمر میں میری زندگی میں ہونے والے حادثے نے مجھے بتایا کہ محرومی اصل میں ہوتی کیا ہے۔" نہ جانے کیا کچھ آنکھوں کے سامنے آیا کہ اس کی آواز بھاری ہوگئی۔ اس نے چند لمحے خاموش ہوکر خود پر قابو پایا۔

"اس حادثے نے مجھ سے میرا بہت کچھ چھین لیا اور میں بھی ایک عام انسان کی طرح چھنی جانے والی چیزوں کا ماتم کررہی تھی، نوحہ کناں وشکوہ کناں کہ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا، آپ کا فن آپ کو جینے کا حوصلہ دیتا ہے۔ میری زندگی میں یہ بات پوری طرح ثابت ہوچکی ہے۔ ہسپتال میں، میں نے تھک کر پینٹنگ کرنا شروع کردی میں بڑی مایوسی اور بڑی تکلیف کا شکار تھی۔ میں نے اپنا سارا دکھ درد اپنی پینٹنگز میں سمو دیا اور میری تب کی بنائی ہوئی پینٹنگز شہ کار بن گئیں۔" ہال تالیوں کی آواز سے گونج رہا تھا۔

"پھر میرے بھائی دانیال نے مجھے اس مایوسی سے نکالا اور مجھے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ میرے زندہ رہنے کا کوئی نہ کوئی مقصد تو ہے۔ میں موت کو اتنا قریب سے چھو کر واپس آئی ہوں تو کیوں؟ مجھے اللہ نے دوبارہ زندگی دی ہے تو کوئی وجہ تو ہوگی۔ بہت مشکل تھا مگر جب میں نے ان باتوں پر غور کیا اور اپنا زاویہ نظر بدلا اور معجزے کا انتظار کرنے کی بجائے خود ہمت کی تو یقین جانیے اللہ نے میرے لیے ایسے ایسے وسیلے اور ایسے ایسے راستے پیدا کیے کہ میں ساری مشکلات کو سر کرتے ہوئے آج یہاں آپ سب کے سامنے کھڑی ہوں۔ میں نے ہمت کی اور جب آپ اپنے آپ کو جیسا ہے ویسا ہے کی بنیاد پر قبول کرلیتے ہیں تو دنیا آپ کو مان لیتی ہے۔ جب آپ شکست تسلیم کرنے سے انکار کرکے لڑنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو جیت آپ کا مقدر بن جاتی ہے، جو ہے اس کا شکر ادا کریں تو آپ کی جھولی بھری رہے گی، اس سے پہلے کہ آپ کے خوف آپ کو زیر کرلیں، آپ ان پر قابو پالیں۔ زندگی سوچنے کا ایک انداز ہے۔ مجھے دشوار راہوں کی بڑی خوب صورت منزل ملی ہے۔" حادثے کے بعد کا ایک ایک پل خولہ کی آنکھوں کے سامنے آتا گیا اور وہ آنکھوں میں نمی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے اپنے احساسات، تکالیف، دکھ، ہمت، کوشش اور محنت سب لوگوں کے سامنے کہتی چلی گئی اور لوگ بھی آنکھوں میں نمی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے اس کی کہانی کو سننے کے ساتھ ساتھ تالیاں بھی بجاتے رہے۔

"جب آپ مختلف طریقے سے کامیابی حاصل کرتے ہیں تو بہت سے لوگ آپ کی ٹانگیں کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں مگر خوش قسمتی سے مجھے ایسے لوگوں کا ساتھ ملا جو ٹانگ کھینچنے کی بجائے اپنے ہاتھوں کی سپورٹ دے کر اوپر تک پہنچنے میں مدد کرتے ہیں میں شکر گزار ہوں ان تمام لوگوں کی جو میرے اس کٹھن سفر میں میرا سہارا بنے اور جو چھوڑ گئے وہ بھی خوش رہیں۔ جو آپ کے پاس ہے اس کی قدر کریں اسے استعمال کریں۔" خولہ کی تقریر ختم ہوگئی تھی۔

امی بابا، تایا، تائی، دانی اور زہرا اپنی معصوم سی بیٹی کو گود میں بٹھائے ٹی وی پر ساری ٹرانسمیشن دیکھ رہے تھے ان کے چہروں پر مسکراہٹ خوشی اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

میلوں دور بیٹھے ہوئے احتشام نامی ایک شخص نے بھی اپنے گلاسز اتار کر اپنی آنکھیں صاف کی تھیں۔ جسے آج یہ پچھتاوا اور دکھ تھا کہ کاش اس نے خولہ کو اس مشکل وقت اور کٹھن راہوں میں اکیلا اور بے یار و مددگار نہ چھوڑا ہوتا۔ شرمندگی کنکر بن کر آنکھوں اور دل میں گڑ گئی اور اب اسے اس چبھن کے ساتھ زندگی گزارنا تھی۔

ختم شد

قسط نمبر اٹھائیس

عشق نگر کے مسافر

ندا حسنین

گزشتہ قسط کا خلاصہ

رضیہ بی ماضی کو سوچ کر خوف زدہ ہو جاتی ہیں۔ فاریہ سے ان کو خوف محسوس ہوتا ہے۔ ماضی میں دلاور بخت نے ان کے شوہر اور بیٹے کا قتل کر دیا تھا۔ ارسل اور ماریانہ شادی کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں، دونوں ہی بہت خوش ہوتے ہیں۔ فاریہ رضیہ بی کے پاس جاتی ہے اور اس کو حماد سے اپنی شادی کرانے کی بات کرتی ہے۔ رضیہ بی انکار کر دیتی ہے اور فاریہ کو باز رہنے کا کہتی ہے۔ یاور بخت دلاور کو اغواٗ کر لیتا ہے۔ صبیحہ دلاور کو گھر میں ڈھونڈتی ہے اور پھر عاصم کو فون کر دیتی ہے۔ شبنم ہر حال میں حماد کو حاصل کرنا چاہتی ہے وہ حماد کے دل سے فاریہ کی محبت کو کھرچ کر مٹا دینا چاہتی ہے۔ عاصم صبیحہ کو لے کر پولیس اسٹیشن چلا جاتا ہے۔ صبیحہ کو پورا یقین ہوتا ہے کہ اس کا بیٹا یاور بخت نے اغواٗ کیا ہے۔ صبیحہ دلاور بخت سے فاریہ کی شادی کی بات کرتی ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ جو جنگ سرد پڑ گئی ہے وہ ایک بار پھر شروع ہو جائے، فاریہ حماد کو فون کر کے اپنی شادی کا بتاتی ہے حماد اس کو تسلی دیتا ہے اور رشتہ کو ٹالنے کی بات کرتا ہے۔ شبنم اس

کی بات سن لیتی ہے۔

اب آگے پڑھیے

یاور بخت کچھ دیر پہلے ہی گھر لوٹے تھے۔ کھانا کھا کر آرام کی غرض سے کمرے میں آئے ہی تھے کہ ملازم نے ان کے کمرے میں آ کر پولیس کے آنے کی اطلاع دی تھی۔

''پولیس......؟'' وہ حیرانی سے بولے تھے۔

''جی صاحب پولیس...... صبیحہ بی بی اپنے ساتھ پولیس لے کر آئی ہیں۔'' ملازم نے مکمل وضاحت کے ساتھ یاور بخت کو آگاہ کیا تھا۔

''صبیحہ پولیس لے کر آئی ہے۔'' یاور بخت پرسوچ انداز میں بڑبڑائے اور ملازم ان کا اشارہ پا کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ یاور بخت کچھ ثانیے تک بیٹھے سوچتے رہے پھر کمرے سے نکلے اور سیڑھیاں اترتے ہی ان کی نگاہ صبیحہ پر گئی تھی۔

''تم نے آج اپنے محل میں قدم رکھ ہی دیا صبیحہ۔'' یاور بخت بے اختیار سوچ کر مسکرائے۔ اگلے ہی ثانیے ان کی نظر صبیحہ کے برابر عاصم پر جا ٹھہریں۔ چہرے پر پھیلی مسکراہٹ پل بھر میں سکڑ کر ناگواری میں تبدیل ہوگئی تھی۔ سیڑھیاں اتر کر وہ صبیحہ کی جانب بڑھے۔ متفکر سی بیٹھی صبیحہ یاور بخت کو سامنے پا کر بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

''تم...... تم نے آخر اپنا اصل رنگ دکھا ہی دیا یاور بخت...... میرے معصوم بچے سے تمہاری کیا دشمنی تھی جو اسے اغواء کرلیا۔'' صبیحہ نے جارحانہ انداز میں یاور بخت کی جانب لپکتے ہوئے ان کا گریبان پکڑ لیا تھا۔ یاور بخت نے گہری نظروں سے صبیحہ کو دیکھتے ہوئے اپنا گریبان چھڑانے کے لیے ان کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ یاور بخت کے ہاتھوں کا لمس، اپنے ہاتھوں پر محسوس کرتے ہی جنونی کیفیت میں گرفتار صبیحہ، یاور بخت کا گریبان چھوڑ کر ایک جھٹکے سے پیچھے ہوئی تھیں۔ صبیحہ کے اس ردعمل پر عاصم کے چہرے پر ناگواری آ گئی تھی۔

''صبیحہ......'' یاور بخت نے گھبراہٹ کے عالم میں انہیں پکارا۔ صبیحہ نے خشمگین نگاہوں سے یاور بخت کو گھورا اور اگلے ہی پل ایک زناٹے دار تھپڑ یاور بخت کے رخسار پر جڑ دیا۔ یاور بخت بے یقینی کے عالم میں صبیحہ کو دیکھتے رہے تھے۔ یہ غیر متوقع تھپڑ، صبیحہ کی جانب سے ان کی غیرت اور عزت پر پڑنے والا بھرپور طمانچہ تھا۔ عاصم نے آگے بڑھ کر صبیحہ کو سنبھالنا چاہا۔ مگر وہ شدید طیش کے عالم میں یاور بخت کو دیکھتے ہوئے بھڑک اٹھیں۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اس قدر گھٹیا انسان نکلو گے کہ اپنی حوس، اپنی غرض کو پورا کرنے کے لیے میرے معصوم بچے کو اغواء کرلو گے۔'' صبیحہ کسی بپھری ہوئی شیرنی کی مانند یاور بخت پر جھپٹ رہی تھیں۔

''صبیحہ...... خود کو سنبھالو پلیز۔'' عاصم نے صبیحہ کو سنبھالتے ہوئے، یاور بخت کو گھورا تھا۔

''یہ کیا ڈراما لگا رکھا ہے میرے گھر میں؟'' یاور بخت نے مشتعل انداز میں صبیحہ، عاصم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے انسپکٹر سے کہا تھا۔

''یاور بخت صاحب...... عاصم صاحب نے آپ پر اپنے بچے کے اغواء ہونے کا شک ظاہر کیا ہے۔'' کچھ فاصلے پر کھڑے انسپکٹر نے آگے بڑھ کر انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

''تو آپ کو میں بچہ چور لگتا ہوں؟'' یاور بخت نے سخت نظروں سے انسپکٹر کو گھور کر غصے سے کہا۔ انسپکٹر چند لمحوں

کے لیے خاموش سا ہو گیا۔ یاور بخت کا شمار ملک کے سیاسی پارٹی کے اہم ارکان میں ہوتا تھا اور اس پر بچہ اغواء کرنے کی رپورٹ درج کرنا اس کے لیے بالکل بھی آسان نہ تھا۔ پر عاصم بھی سرکاری افسر تھا اس وجہ سے اسے یاور بخت کے خلاف رپورٹ درج کرنی پڑی تھی۔

''جناب...... یہ رپورٹ ہم نے ان کی مدعیت میں درج کی ہے۔ آپ کے گھر کی تلاشی لینی پڑے گی۔'' انسپکٹر نے دبے دبے لہجے میں کہا تھا۔

''کیا میں جان سکتا ہوں...... بچہ اغواء کہاں سے ہوا ہے؟'' یاور بخت نے ایک گہری نظر صبیحہ کے چہرے پر ڈالتے ہوئے انسپکٹر سے پوچھا تھا۔ اس گہری نظر میں کیسا طنز چھپا تھا صبیحہ کو یہ جاننے میں صرف ایک لمحہ لگا تھا۔

''میرے گھر سے اغواء ہوا ہے میرا بیٹا اور میں جانتی ہوں کہ تم ذمہ دار ہو اس کے۔ تم نے دی تھیں مجھے دھمکیاں۔'' صبیحہ ایک بار پھر غصے سے دیکھتے ہوئے یاور بخت کو مورد الزام ٹھہرانے لگی تھیں۔

''تمہارا بیٹا میں نے اغواء کیا ہے اس بات کا کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس صبیحہ؟'' یاور بخت نے کڑی نظروں سے صبیحہ کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں صبیحہ کو اپنے لیے چیلنج محسوس ہوا تھا۔

''صبیحہ اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ انسپکٹر صاحب کو تلاشی لینے دو۔ حقیقت خود ہی واضح ہو جائے گی۔'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں، عاصم نے یاور بخت کے جذبات کو سمجھتے ہوئے نرمی سے صبیحہ کو سمجھاتے ہوئے کہا اور دونوں شانوں سے تھام کر اسے پرسکون رہنے کا کہہ کر انسپکٹر کی جانب متوجہ ہوئے تھے۔

''انسپکٹر صاحب...... پلیز......''

''جاؤ گھر کے کونے کونے کی تلاشی لو۔'' انسپکٹر نے عاصم کی درخواست پر اپنے سپاہیوں کو ہدایت دی۔ سپاہی اگلے لمحے ہی نچلی اور بالائی منزل میں پھیل گئے تھے۔ یاور بخت نے ایک کاٹ دار نگاہ عاصم کی جانب اچھالی اور کروفر کے ساتھ صبیحہ کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ صبیحہ نے تیز نظروں سے یاور بخت کو دیکھا اور ناگواری سے منہ پھیر لیا تھا۔

❀......❀......❀......❀

''میں یہاں کیا کر رہی ہوں...... میں تمہیں دیکھنے کے لیے آئی ہوں حماد اور تمہیں اپنی تیاری دکھانے کے لیے آئی ہوں۔'' شبنم نیلگوں رنگ کے انتہائی خوب صورت سے گاؤن میں ملبوس اس کے سامنے کھڑی تھی۔ حماد دنگ سا اسے دیکھتا رہا۔ وہ جیسے کوئی اپسرا تھی، اتنی حسین...... دلکش کہ وہ پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا۔ شبنم دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اس کے نزدیک آئی۔ حماد کے ہاتھوں سے موبائل فون گر پڑا تھا۔

''اچھی طرح مجھے دیکھ لو حماد اور خود فیصلہ کرو۔'' وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ حماد کے لیے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ شبنم کے جسم سے اٹھتی خوشبو اس کے حواس پر چھاتی جا رہی تھی۔ وہ اپنی اس کیفیت سے گھبراتا ہوا پیچھے ہوا۔

''خود فیصلہ کرو...... کون ہے تمہاری محبت کے قابل میں یا فاریہ؟'' شبنم حماد کے مزید نزدیک ہو کر مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا میرا حسن...... تمہیں مسحور نہیں کر رہا، کیا میرے جذبات تمہارے دل میں میری چاہت کے کوئی احساسات نہیں جگا رہے؟'' وہ اس کی ٹائی کو دھیرے سے پکڑتے ہوئے مزید قریب ہوئی۔ شبنم کی قربت، اس کے ہاتھوں کا

س...... حماد کے تن بدن میں آگ سی بھر گئی۔ وہ جھرجھری لیتے ہوئے جیسے ہوش میں آیا۔
"میری سمجھ میں نہیں آتا...... میں ہمیشہ سے تمہاری آنکھوں کے سامنے، تمہاری ہمدم، ہمقدم بن کر رہی پھر بھی تمہیں نظر کیوں نہیں آئی حماد؟" شبنم کا ہاتھ ٹائی سے ہوتا ہوا، دھیرے دھیرے حماد کے شانے تک پہنچنے لگا۔ شبنم ے چہرے کے ایک ایک نقوش پر اس لمحے عجب سی دیوانگی تھی۔
حماد کو یوں محسوس ہوا جیسے یہ دیوانگی رفتہ رفتہ اس کے وجود کو بھی اپنے حصار میں لپیٹ رہی ہے۔ وہ شبنم کے ہاتھ کو ی شدت سے جھٹکنا چاہتا تھا مگر اپنے آپ کو بے بسی کی انتہاء پر محسوس کر رہا تھا۔ اسے سامنے کھڑی لڑکی شبنم نہیں ہ کوئی مسحور کن ساحرہ محسوس ہو رہی تھی جس کی قربت اس کے اعصاب، اس کی حس کو اپنے حصار میں لے رہی تھی۔
"تم نے مجھے نظر انداز کیوں کیا حماد؟ کیوں تم اس فاریہ کی محبت کا دم بھرنے لگے، تم نے مجھے، میری محبت کو بری رح ٹھکرا دیا۔" شبنم نے اسے اس کے کالر سے پکڑ کر خود سے قریب کرتے ہوئے کہا۔ حماد کا جیسے اپنے وجود پر کوئی تیار ہی نہ رہا تھا۔
"دیکھو...... فرصت سے دیکھو...... کیا میں ٹھکرانے کے قابل ہوں؟ میں تمہاری محبت ڈیزرو کرتی ہوں یا نفرت۔" س کے کالر کو چھوڑ کر، شبنم جنونی کیفیت میں مبتلا، اپنے سنگ مرمر سے سراپے کی جانب اشارہ کرتے، وجد کے عالم س بازو پھیلائے حماد کے گرد دائرے کی شکل میں گھومنے لگی۔ حماد کو لگا جیسے اس کے اردگرد کے سارے منظر اپنی ثیت کھو بیٹھے ہوں۔ اس لمحے اگر کوئی سچائی تھی، حقیقت تھی تو وہ صرف شبنم تھی۔
"مجھے دیکھو حماد، میرے حسن کو دیکھو...... یہ تمہارے عشق میں مرمٹا ہے۔ میرا وجود تمہاری محبت میں فنا ہوتا جا رہا ہے۔" وہ جھومتے ہوئے ایک بار پھر حماد کے قریب ہوئی۔
"تمہاری ایک نظر میرے جسم کو ایک بار پھر زندگی کا دوام بخش دے گی۔ میری محبت مرجھا رہی ہے اسے اپنے ادوئی لمس سے پھر سے زندگی بخش دو۔" وہ اس کے چہرے پر ہاتھ پھیر کر یک ٹک دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ حماد گم صم بنم کو دیکھتا رہا تھا۔ اس پل وہ بے اختیار تھا، اس کے سارے اختیار سلب ہو گئے تھے۔ وہ جیسے شبنم کے بس میں جا چکا ا۔

"ہاسپٹل میں میری شفٹ ہے اور ڈرائیور مجھے لے کر جانے سے انکار کر رہا ہے۔ آپ ڈرائیور کو یہاں بلا کر رے سامنے اس کی کلاس لیں پاپا۔" فاریہ دلاور بخت کے سامنے کھڑی ڈرائیور کی شکایت کر رہی تھی۔ دلاور بخت وزا اپنے کمرے کے ٹیرس میں کھڑے تھے۔ ان کے بائیں ہاتھ کی انگلیوں کے درمیان سلگتا ہوا سگار دبا ہوا تھا اور گاہیں بخت محل کے گیٹ پر جمی ہوئی تھیں۔ فاریہ کی شکایت پر وہ آہستگی سے پلٹ کر اسے دیکھنے لگے۔ فاریہ کو اس پل ن کی نگاہوں سے اجنبیت سی محسوس ہوئی۔ پدرانہ شفقت سے محروم ان جانچتی نگاہوں میں بے اعتباری، سفاکی، یک تپش سی تھی جس کی آنچ فاریہ کے وجود کو بھی دھیرے دھیرے سلگانے لگی تھی۔
"ڈرائیور کو میں نے منع کیا تھا فاریہ۔" وہ اس کے چہرے کے نقوش بغور دیکھتے، اس کے تاثرات کو ٹٹولتے ہوئے پاٹ لہجے میں بولے۔
"مگر کیوں پاپا؟" فاریہ نے انتہائی معصومیت سے دلاور بخت کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ چند ثانیے تک بیٹی کی

صورت دیکھتے رہے اور پھر آہستگی رخ پھیر کر بولے۔

"تمہاری شادی ہونے والی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تم اب بلاضرورت گھر سے باہر نکلو۔"

"مگر ہاسپٹل جانا میری مجبوری ہے۔ میرے کیریئر کا انحصار میری ہاؤس جاب پر ہے۔ میں چاہ کر بھی اس کی طرف سے غفلت نہیں برت سکتی۔ کیا آپ چاہیں گے پاپا کہ شادی کے بعد میرے عالم فاضل سسرال میں اس بات کو اچھالا جائے کہ میں اپنی ہاؤس جاب تک مکمل نہ کرسکی۔ کیا آپ چاہیں گے کہ میں سسرال میں آپ کے اس فیصلے کی وجہ سے سبکی برداشت کروں۔" فاریہ گھوم کر ان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اس بار اس کے لہجے میں بھی خفگی تھی، لفظوں میں شکوہ تھا اور نظروں میں ناراضی کا شدید احساس جھلک رہا تھا۔ دلاور نے ساری بات سن کر فاریہ کو دیکھا۔ بیٹی کی سوالیہ نظروں کو اپنے چہرے پر جما پاکر بے لچک لہجے میں بولے۔

"مجھے تم پر یقین نہیں رہا فاریہ۔ تم اپنا اعتبار میرے فیصلے کے خلاف جاکر کھو چکی ہو۔"

"میں اپنی محبت، اپنی خوشی آپ کے فیصلے پر قربان کرچکی ہوں اور آپ میری اس قربانی کا احساس کرنے کے بجائے مجھے بے اعتبار نظروں سے دیکھ رہے ہیں پاپا۔" دلاور کے رویے سے زیادہ لفظوں نے فاریہ کو شدید ذہنی دھچکا پہنچایا تھا۔ وہ بری طرح چیخ کر بولی۔ دلاور نے ایک خاموش نگاہ اس کے چہرے پر ڈال کر پھیر لی۔

"مجھے اگر آپ کے فیصلے کے خلاف جانا ہوتا تو آپ کے فیصلے پر سر کیوں جھکاتی پاپا؟" دلاور کی خاموشی پر وہ جتاتے ہوئے انداز میں بولی۔

"میں نے بغاوت ترک کر کے آپ کے فیصلے کو قبول کیا مگر آپ کی یہ سوچ اور اقدام نے مجھے شدت سے احساس دلایا ہے کہ صرف میری خوشیوں کی ہی نہیں، آپ کی نظر میں میری بھی کوئی اہمیت نہیں ہے۔" فاریہ نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں دکھ ہچکولے لے رہا تھا۔ دلاور بخت لب بھینچے، خاموش نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ فاریہ انتہائی خفگی کے عالم میں انہیں دیکھ کر کمرے سے نکل گئی۔ وہ انتہائی غصے کی حالت میں گیٹ کی جانب بڑھنے لگی۔

"چھوٹی بی بی جی......" ڈرائیور فاریہ کو تیزی سے گیٹ کی جانب بڑھتا دیکھ کر عجلت کے عالم میں پکارتے ہوئے پیچھے لپکا۔ فاریہ نے تیزی سے پلٹ کر ڈرائیور کو خشمگیں نگاہوں سے گھورا۔

"بی بی جی...... گاڑی تیار ہے۔" ڈرائیور نے اسے گھورتا پاکر فوراً سے سر جھکا کر آگاہ کیا۔ فاریہ کی نظریں بے اختیار دلاور بخت کے کمرے کے ٹیرس پر ٹھہریں۔ وہ ہنوز وہاں موجود تھے۔ اسے اپنی جانب دیکھتا پاکر یوں سر ہلایا جیسے اسے جانے کی اجازت دے رہے ہوں۔ فاریہ استہزائیہ انداز میں مسکرا کر سر جھٹکتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ اس کے بیٹھتے ہی ڈرائیور اپنی نشست پر آکر بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے، تیزی سے گیٹ کو پار کرتے بخت محل کے حدود سے باہر نکل گیا۔

"پاپا...... آج آپ نے ان ملازمین کے سامنے بھی میری قدر گھٹا دی۔ آج احساس ہو رہا ہے یہ محل، یہاں کے غلام صرف آپ کے وفادار ہیں اور بخت محل میں رہنے والے ہم سب جیسے آپ کے قرض دار ہیں۔" وہ برق رفتاری سے گزرتے نظاروں کو کھوئی کھوئی نگاہوں سے دیکھتے افسردگی سے سوچ رہی تھی۔

"باپ تو اولاد کا، اس کی خوشیوں کا محافظ ہوتا ہے۔ آپ کیسے باپ نکلے پاپا کہ آپ نے اپنی اولاد کی خوشیوں کو ہی

ں انا، اپنی ضد کے بھینٹ چڑھا دیا۔ کاش...... کاش میری ماں زندہ ہوتی۔ وہ زندہ ہوتی تو شاید میرے لیے آپ سے لڑتی۔" فاریہ کی آنکھوں میں ماں کی جدائی کی تڑپ، یکلخت نمی بن کر تیرنے لگی۔ "مگر میری ماں کیسے لڑتی پاپا...... تو بے چاری شاید اپنے لیے بھی آپ سے لڑ نہیں سکی۔ آپ نے کسی رشتے کو اتنا مضبوط بنایا ہی نہیں کہ آپ کی محبت کے زعم میں وہ آپ پر اپنا حق جتا سکے، اپنی بات منوا سکے۔ آپ نے خود سے وابستہ ہر رشتے کو کمزور اور بے اماں کر دیا۔ ہر رشتہ جو آپ کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمیشہ اپنی بقاء کی جنگ لڑتے رہنے میں مصروف رہا۔ وہ بے چارہ رشتہ آپ کے دل میں اپنے ہونے نہ ہونے کا احساس جگانے کی کوشش میں تھک کر ہلکان ہو گیا مگر آپ کو چنداں فرق نہ پاپا۔ آپ کی ذات، آپ کی شان، آپ کی انا، غرور میں کوئی فرق نہیں آیا۔" جس گتھی کو سلجھانے کے لیے وہ در در کی ٹھوکریں کھاتی پھر رہی تھی۔ آج وہ گتھی سلجھ گئی، وہ راز عیاں ہو گیا تو اسے اپنا آپ زخموں سے چور محسوس ہونے لگا۔ اس کے دلکش چہرے پر تلخی اُمڈ آئی۔ ایسی تلخی جو اس کے حسن کو سفاکی میں ڈھالنے لگی۔

"مجھے اپنا آپ ان دیکھی آہنی زنجیروں میں قید محسوس ہو رہا ہے۔ میری سانسیں جکڑی ہوئی ہیں، میری روح تک آپ کی سنگ دلی سے چھلنی چھلنی ہو گئی ہے۔ مجھ میں آپ کا ظلم برداشت کرنے کی مزید سکت نہیں پاپا۔" فاریہ نے بے دردی سے اپنی ہتھیلیاں رخسار پر رگڑ کر اپنے آنسو کے نشان مٹانے چاہے۔

"آپ بھول گئے کہ میں بھی فاریہ دلاور بخت ہوں۔ آپ کی بیٹی......" وہ ایک زعم سے گردن اکڑا کر ہسپتال کے گیٹ کو دیکھنے لگی۔

"میں اپنی محبت نہ آپ کی ضد پر قربان کروں گی نہ ہی آپ کی بیٹی شبنم کی خواہش پر۔" گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تو فاریہ گاڑی سے نکل کر دل میں مصمم ارادہ باندھتی، ہسپتال کے اندر داخل ہو گئی تھی۔

❁......❁......❁
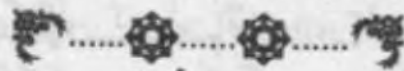
"میں تم سے محبت کرتی ہوں حماد...... بے انتہا محبت۔" شبنم کی مرمریں انگلیاں حماد کے سینے پر حرکت کر رہی تھیں۔

"ادراک بھلے اب ہوا ہے...... مگر یہ محبت تو شاید بچپن سے ہی میرے دل میں موجود تھی۔" وہ حماد کو دیوانگی کے عالم میں دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"تمہارے دل میں بھی تو یہ محبت ہو گی ناں حماد...... بس تمہیں ادراک ہونا باقی ہے مگر فکر نہ کرو...... ہماری محبت کا ادراک آج میں تمہیں کرا کر رہوں گی، میں ہمیشہ سے تمہارے ساتھ رہی حماد، تمہاری نظروں کے سامنے...... تمہارے بچپن، تمہاری جوانی کی ساتھی۔" وہ مزید قریب ہو کر حماد کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہنے لگی۔ حماد کے پورے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی تھی۔

"پھر تم زندگی کی ساتھی کے طور پر فاریہ کو کیسے چن سکتے ہو حماد......" ایک جھٹکے سے پیچھے ہو کر اس نے اپنے ہاتھوں میں جکڑے حماد کے کالر کو جھٹکا تو حماد کا چہرہ بے اختیار شبنم کے چہرے پر جھکا۔ شبنم کے لبوں پر دل آویز مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی...... دروازے پر ہوتی دستک نے حماد کے سوئے ہوئے ذہن کو یکلخت بے دار کر دیا۔

"حماد کہاں ہو یار...... ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟" وہ جیسے کسی سحر میں مبتلا اپنی سدھ بدھ کھو چکا تھا مگر ارسل کی

انتباہ

ماہنامہ آنچل کراچی ماہنامہ نئے افق کراچی ماہنامہ حجاب کراچی

ان تمام ویب سائٹس، بلاگ کے مالکان اور سوشل میڈیا پر گروپس و پیجز کے مالکان و ایڈمنز کو مطلع کیا جاتا ہے کہ دس دن کے اندر اندر آنچل و حجاب اور نئے افق کی تمام تحاریر اپنے ویب سائٹس، پیجز اور گروپس سے ہٹالیں ورنہ ادارہ نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز ان تمام گروپس اور ویب سائٹس، پیجز کے لیے قانونی چارہ جوئی کرنے کا نا صرف حق رکھتا ہے بلکہ مطلوبہ نوٹس کے بعد ان ویب سائٹس کے خلاف دی گئی مدت کے بعد ایف آئی اے، سائبر کرائم اور کاپی رائٹس کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کی جاسکتی ہے جس کے لیے ادارہ ذمہ دار نہیں ہوگا۔

جن ویب سائٹس کو پیشگی اجازت دی گئی تھی ان سے التماس ہے کہ وہ فوری ادارے سے رابطہ کریں تاکہ نئے قواعد وضوابط سے آگاہی حاصل کرسکیں۔

81 نیپیئر بیرکس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

رابطہ: 03008264242

آواز نے اسے بروقت بے دار کردیا تھا۔ اس نے چونک کر بے اختیار دروازے کی سمت دیکھا۔ اگلے ہی پل اسے خود سے بے حد قریب شبنم کے وجود کا احساس گھبراہٹ میں مبتلا کر گیا۔ اسے دیکھ کر حماد نے بوکھلاہٹ کے عالم میں زور سے پرے دھکیلا۔ شبنم جو گھبرائے ہوئے انداز میں دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ اس غیر متوقع ردعمل پر جھٹکا کھاتے دور جا گری۔

''جلدی آؤ یار...... ہم سب باہر تمہارا انتظار کررہے ہیں۔'' ارسل تاکید کرتا وہاں سے چلا گیا۔

''کس لیول پر جا پہنچی ہو تم...... کچھ اندازہ بھی ہے تمہیں؟'' وہ دانت کچکچاتے انتہائی غصے کے عالم میں اس کی جانب بڑھا۔ شبنم متوحش سی بے اختیار پیچھے ہوئی۔

''مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ غلطی کہاں ہوئی...... ہماری نیک نیتی میں یا پھر اماں بی کی تربیت میں؟'' وہ اسے نفرت آمیز نگاہوں سے گھورتا ہوا دبے دبے لہجے میں غرایا۔

''نہیں اماں بی کی تربیت غلط نہیں ہوسکتی...... میں مرد ہو کر نہیں بگڑا تو تم کیسے اتنے ہلکے کردار کی نکلیں...... جواب دو؟'' وہ مشتعل انداز میں استفسار کرنے لگا۔ شبنم بے اختیار نظریں چرا گئی۔

''سمجھ گیا...... یہ قصور فطرت کا نہیں۔ ضرور تمہاری رگوں میں انتہائی گندا خون دوڑ رہا ہے۔ اس قدر آلودہ کے ہمارے گھرانے کی پاکیزگی بھی اس کی آلودگی کو دور نہیں کرسکی۔'' وہ حقارت سے اسے زمین پر گرا دیکھ کر بولا۔

''اتنی گر چکی ہو کہ آج تمہیں اپنی بہن کہنا بھی مجھے گوارا نہیں۔ محبت کیا تم تو میری نفرت کے لائق بھی نہیں رہیں۔ تمہیں دیکھ کر ذہن میں ایک ہی لفظ ابھرتا ہے......'' حماد نے اسے حقارت سے دیکھتے ہوئے اپنی شرٹ ٹھیک کی۔ ٹائی کی گرہ کھول کر نئے سرے سے باندھ کر وہ اس پر جھکا۔ شبنم کے چہرے پر ذلت کا احساس رقم تھا۔

''تم اپنا کردار پستی میں گرا چکی ہو، میری نظر میں اب تم ایک حرافہ ہو...... حرافہ......'' حماد اسے دھتکارتے ہوئے انداز میں دیکھ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔ شبنم کا وجود جیسے اس ایک لفظ سے پتھرا گیا تھا۔

''حرافہ......'' وہ ہولے سے اور بے یقینی سے بڑبڑائی۔

''حماد نے مجھے گالی دی...... اس نے مجھے حرافہ کہا۔'' وہ بے یقین سی اس ایک لفظ کی بار بار تکرار کرتی رہی۔ وہ یہ بھول گئی تھی کہ حماد کو اس نہج میں لانے والی وہ خود تھی۔ اس نے نہ اپنے کردار کی حرمت کی پروا کی نہ اپنی ذات سے وابستہ لوگوں کی عزتوں کا خیال رکھا۔ اس نے پاتال میں گرنے کا انتخاب خود کیا تھا۔ حماد نے اسے لاکھ بچانا چاہا مگر اپنے ساتھ ساتھ وہ اسے بھی ذلت کے پاتال میں دھکیلنے کو بے تاب تھی۔ وہ عزت دار تھا بچ نکلا مگر وہ اپنی سطحی سوچ، بے لگام جذبات کے پیچھے بھاگتی بھاگتی پستی میں جا گری تھی۔

''حرافہ...... حرافہ......'' کمرے کے درودیوار بھی اس پر ہنستے ہوئے فقرے کس رہے تھے۔ اس کے کان کے پردے پھٹنے کو تھے۔

''نہیں...... نہیں ہوں میں حرافہ......'' وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے کان بند کیے چلائی تھی۔

❀ ❀ ❀

''حد کرتے ہو حماد...... تیار ہونے میں اتنی دیر، دلہا میں ہوں یا تم؟'' حماد کمرے سے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا نکلا تو سب سے پہلے اسے سامنے کھڑے ارسل کی خفگی کا سامنا کرنا پڑا۔

”اپنے بھیا کی شادی میں، مجھے اپنی تیاری تو غضب کی ہی رکھنی تھی۔“ وہ ہر ممکن حد تک اپنے لہجے کو خوشگوار بناتے ہوئے بولا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس پل اس کے دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے۔ شبنم کو وہ جتنا کچھ کہہ کر آیا تھا وہ بہت کم تھا۔ وہ آج اسے اچھی طرح احساس دلانا چاہتا تھا کہ وہ ان حرکتوں کے باعث اس کی نظروں سے کس قدر گر چکی ہے۔

”ویسے تیاری تو واقعی غضب کی، کی ہے تم نے۔“ ارسل نے مسکرا کر اسے توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تھینک یو بھیا جانی مگر میری تمام تیاری آپ کے آگے فیل ہو گئی ہے۔ آج آپ کا دن ہے، بھیا اور آپ نے بالکل بھی یہ موقع نہیں گنوایا۔ ریڈ پٹ کو ماند دیتے نظر آرہے ہیں آپ۔“ حماد خوشی سے ارسل کے گلے لگتے ہوئے تعریفوں کے پل باندھنے لگا۔

”یہ تعریف کر رہے ہو یا مبالغہ آرائی۔“ ارسل اس کی تعریف پر ہنستے ہوئے بولا۔

”مبالغہ آرائی ہے بھی تو آپ اسے بطور کامپلیمنٹ لیں بھیا جانی۔“ حماد نے شرارت سے چھیڑتے ہوئے کہا تو ارسل بے اختیار ہنس دیا۔

”آپ ہمیشہ اسی طرح مسکراتے رہیں بھیا جانی۔“ حماد نے بھائی کو مسکراتا دیکھ کر دل ہی دل میں دعا کی۔

”بابا...... گرینی سب کہاں ہیں؟“ خیال آنے پر اس نے استفسار کیا۔

”سب گاڑی میں بیٹھ چکے ہیں۔ تمہارا اور شبنم کا انتظار کر رہے ہیں۔ تم تو آگئے مگر یہ شبنم نہ جانے کہاں رہ گئی۔ اس کے کمرے میں بھی دیکھ کر آرہا ہوں۔ وہاں بھی نہیں ہے۔“ ارسل بتاتے ہوئے فکر مند ہوا۔

”یہیں کہیں ہوگی...... اس نے کہاں جانا ہے۔ ایک بار پھر اس کے کمرے میں دیکھ لیں۔“ شبنم کے ذکر پر حماد کا حلق تک کڑوا ہوا۔ وہ لاتعلقی کا مظاہرہ کرتے، کندھے اچکا کر باہر چلا گیا۔

”اسے کیا ہوا ہے؟“ حماد کے اس رویے پر ارسل حیرانی سے اسے دیکھ کر شبنم کو آوازیں دیتا آگے بڑھا۔

”شبنم......“ وہ آواز دیتا حماد کے کمرے کے سامنے سے گزرا۔ اچانک گھٹی گھٹی سی کسی کے رونے کی آتی آواز نے اس کے قدم روک دیئے۔ وہ بے اختیار دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اندر کا منظر دیکھ کر ارسل بری طرح لرز گیا۔ شبنم انتہائی برے حال میں زمین پر بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کا خوب صورت لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ ارسل شدید شاکڈ کے عالم میں اس کی جانب بڑھا۔

”یہ...... یہ کیا حال بنایا ہوا ہے تم نے؟“ وہ حیران و پریشان سا شبنم کے روبرو بیٹھتا ہوا بولا۔ شبنم ارسل کو سامنے پا کر، بلک بلک کر رونے لگی۔

”کیا ہوا شبنم تم کیوں رو رہی ہو اس طرح اور یہاں حماد کے کمرے میں کیوں بیٹھی ہو؟“ ارسل مضطرب سا شبنم کو دیکھ کر پریشانی سے استفسار کرنے لگا۔

”ارسل بھیا......“ شبنم، ارسل کے سینے سے جا لگی۔ اس کی اس غیر متوقع حرکت پر ارسل بری طرح گھبرایا۔

”کیا ہوا ہے شبنم...... کچھ بتاؤ تو سہی مجھے؟“

”ارسل بھیا...... حماد نے......“ وہ ہچکیوں کے درمیان بامشکل بول پائی۔

”حماد نے...... حماد نے کیا کیا شبنم؟“ ارسل عجب خدشات میں مبتلا شبنم کو دونوں بازوؤں سے تھام کر خود سے علیحدہ کرتے ہوئے بولا۔

”حماد نے مجھے......“ شبنم نے روتے ہوئے اپنے پھٹے ہوئے کپڑوں کو دیکھا اور پھر ارسل کی جانب دیکھ کر، بات ادھوری چھوڑ کر رو دی۔

”حماد نے تمہیں کیا..... آخر کہنا کیا چاہ رہی ہو تم؟“ ارسل نے الجھی ہوئی نظروں سے شبنم کو دیکھتے ہوئے، ناسمجھی سے دریافت کیا۔

* * *

”گھر میں کہیں بھی بچہ موجود نہیں۔“ انسپکٹر نے صبیحہ اور عاصم کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ میرے بیٹے کو اسی نے اغواء کروایا ہے۔ اس نے دھمکی دی تھی مجھے۔“ صبیحہ بے اختیار تڑپ کر غصے سے یاور بخت کو دیکھتے ہوئے کہنے لگیں۔

”میڈم کوئی ثبوت ہے آپ کے پاس؟“ انسپکٹر نے کڑے تیور کے ساتھ پوچھا۔ عاصم بھی سر اٹھا کر صبیحہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔

”کیا جس بات کا ثبوت نہ ہو وہ حقیقت نہیں رہتی۔ جب میں کہہ رہی ہوں کہ اس شخص نے مجھے دھمکی دی تھی اور اسی نے میرے بیٹے کو اغواء کروایا ہے۔ تو یہ غلط نہیں ہے۔ آپ پوچھیں اس سے...... کہاں چھپا رکھا ہے میرے بیٹے کو۔“ صبیحہ نے چیخ کر یاور بخت کو دیکھتے ہوئے انسپکٹر کو جواب دیا تھا۔

”میڈم قانون ثبوت کی بنیاد پر اپنا کام کرتا ہے۔ آپ کے کہنے پر ہم نے یاور بخت صاحب کے گھر پر چھاپہ مارا مگر بچہ تو کیا، کوئی ثبوت بھی نہیں ملا۔ یہ تو ان کی شرافت ہے جو انہوں نے آپ کے خلاف کوئی جوابی کارروائی نہیں کی۔ چلیں جناب عاصم صاحب...... تھانے چل کر بات کرتے ہیں۔“ انسپکٹر نے پروفیشنل انداز میں بات نمٹاتے ہوئے کہا۔ یاور بخت خاموشی سے صبیحہ کے چہرے پر نظریں جمائے کھڑا رہا تھا۔

”چلو صبیحہ...... تھانے چلتے ہیں۔“ عاصم نے صبیحہ کو ساتھ لگاتے ایک نظر یاور بخت کے چہرے پر ڈالی اور انسپکٹر کے ساتھ باتیں کرتا وہاں سے جانے لگا تھا۔ صبیحہ نے پلٹ کر یاور بخت کو دیکھا تھا۔ یاور بخت اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی سفاکی تھی۔ صبیحہ کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی تھی۔ وہ دونوں تھانے سے تھکے ہارے گھر لوٹے تھے۔ تب ہی رشیدہ ہانپتے کانپتے ان دونوں کے پاس چلی آئی تھی۔

”بی بی جی...... دلاور مل گیا۔“

”کیا کہا......! دلاور مل گیا؟“ عاصم متحیر سا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”جی...... صاحب جی مل گیا۔“ رشیدہ نے دونوں کو باری باری دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”کہاں ہے میرا بیٹا؟“ صبیحہ بے تاب سی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”بی بی جی...... دلاور اسٹور میں چھپا سو رہا تھا۔ آپ لوگوں کے جانے کے بعد، اس کے رونے کی آواز آئی تب میں نے اسٹور میں جا کر دیکھا تھا۔“ رشیدہ تفصیل بتاتے ہوئے بولی تو صبیحہ ہکا بکا سی کھڑی رہ گئی تھیں۔

”اوہ میرا خدا...... عاصم اسٹور میں بند تھا مگر وہ وہاں چلا کیسے گیا؟“ عاصم، صبیحہ کو گھورتے ہوئے استفسار کرنے لگا تھا۔

”کہاں ہے اب میرا بیٹا؟“ صبیحہ، عاصم کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے رشیدہ سے استفسار کرنے لگی تھیں۔

''اسے میں نے سلا دیا ہے۔'' رشیدہ کے اتنا کہنے پر صبیحہ اور عاصم بے اختیار کمرے کی جانب بڑھے تھے۔ دلاور بستر پر گہری نیند سو رہا تھا۔

''دلاور...... میری جان......'' صبیحہ بے تاب سی آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں بھر کر پیار کرنے لگی تھیں۔ عاصم بھی اطمینان بھری سانس اپنے سینے میں اتارتے ہوئے آگے بڑھا تھا۔

''شکر ہے...... دلاور مل گیا۔ مگر زندگی میں پہلی بار مجھے تم پر شدید غصہ آ رہا ہے صبیحہ۔'' عاصم نے بستر پر بیٹھتے ہوئے انتہائی سنجیدگی سے کہا تھا۔ صبیحہ حیران سی اسے دیکھنے لگی تھیں۔

''مجھ پر غصہ؟'' صبیحہ کی آنکھوں میں سوال ہی سوال تھے۔

''ہاں تم پر...... تم ہمارے بچے کا خیال نہیں رکھ سکیں اور بناء تلاش کیے تم پولیس لے کر یاور بخت کے گھر پہنچ گئیں۔'' عاصم نے غصے سے صبیحہ کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''عاصم...... میں بہت ڈر گئی تھی۔ مجھے لگا یاور بخت......'' صبیحہ نے عاصم کو پہلی بار اتنے غصے میں دیکھا تھا۔ وہ بری طرح گھبرا کر وضاحت دینے لگی تھیں۔

''پلیز صبیحہ...... یاور بخت کو اپنے ذہن پر اتنا حاوی نہ کرو کہ ہماری زندگی متاثر ہونے لگے۔'' عاصم نے بری طرح زچ ہو کر صبیحہ کی بات کاٹ کر کہا تھا۔

''عاصم مگر میں تو خود نہیں چاہتی کہ اس بد بخت انسان کی وجہ سے ہماری زندگیاں متاثر ہوں۔'' صبیحہ روہانسی ہو کر بولی تھیں۔

''تم نہیں چاہتیں...... مگر اس کے باوجود ہماری زندگی متاثر ہو رہی ہیں صبیحہ۔ تمہیں احساس ہے اس بات کا کہ آج تم نے کتنی بڑی غلطی کی ہے؟'' عاصم نے مضطرب سے انداز میں صبیحہ کو احساس دلاتے ہوئے کہا تھا۔

''کیا مطلب...... کیسی غلطی؟'' صبیحہ متحیر سی عاصم کو دیکھنے لگی تھیں۔

''دلاور گھر میں موجود تھا اور اسے گھر میں صحیح طرح سے تلاش کرنے کے بجائے تم نے یاور بخت پر الزام لگایا۔ مجھے بھی اس حد تک پریشان کر دیا کہ میں یاور بخت کے گھر پولیس لے گیا۔ کچھ اندازہ بھی ہے کہ کتنی سنگین غلطی ہم سے سرزد ہو گئی ہے؟'' عاصم، صبیحہ کے روبرو بیٹھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

''میں نہیں سمجھ پا رہی عاصم......'' صبیحہ ناسمجھی سے شوہر کو دیکھ کر پریشانی سے بولی تھیں۔

''یہی تو مسئلہ ہے کہ تم سمجھ نہیں پا رہیں۔ صبیحہ یاور بخت کو محض اپنا سابقہ شوہر سمجھنا چھوڑ دو۔ وہ ایک انتہائی با اثر اور بارسوخ سیاسی جماعت کا اعلیٰ عہدیدار ہے۔ ماضی میں نہ جانے وہ اتنا بارسوخ تھا یا نہیں، مگر اب وہ بے حد پاور فل انسان بن چکا ہے۔ تم جانتی ہو انسپکٹر اس کے خلاف رپورٹ درج کرنے، گھر کی تلاشی لینے سے کترا رہا تھا اور اب جب انسپکٹر کو علم ہوگا کہ ہمارا بیٹا اسی گھر میں موجود تھا اور ہم لاعلم بنے دوسروں پر الزام لگاتے رہے تو جانتی ہو کتنی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا مجھے؟'' عاصم نے صبیحہ سے پوچھا مگر ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ شرمندگی سے سر جھکا گئی تھیں۔

''صرف یہی نہیں صبیحہ...... جانتی ہو مجھے اصل فکر کیا ہے؟'' عاصم نے اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”کیا ہے اصل فکر؟“ صبیحہ نے بے ساختہ سر اٹھا کر عاصم کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔
”یاور بخت...... جو الزام تم نے اس پر لگایا، جو تذلیل تم نے اس کے گھر جا کر کی...... وہ کبھی نہیں بھولے گا۔ وہ جس حلقے میں موو کرتا ہے۔ وہاں ذرا ذرا سی بات کا بتنگڑ بنتے دیر نہیں لگتی اور ایسے میں جو کچھ بھی تم نے اس کے ساتھ کیا' کیا اس کی جگ ہنسائی نہیں ہوئی ہوگی؟“ عاصم اسے اس کی غلطی کی سنگینی کا اور اک دلاتے ہوئے بولا تھا۔ شوہر کی بات سن کر صبیحہ کے چہرے پر بھی پریشانی و تفکر کی لکیریں کھنچنے لگی تھیں۔
”مجھے ڈر ہے صبیحہ کہیں وہ اپنی اس تضحیک کا بدلہ ہمیں یا ہمارے بچے کو نقصان پہنچا کر نہ لے۔“ عاصم کی آواز بدترین اندیشوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔
”اللہ نہ کرے عاصم...... اللہ نہ کرے۔“ صبیحہ کا دل بری طرح دہلا، وہ سینے پر ہاتھ رکھے تڑپ کر عاصم کو دیکھنے لگی تھیں۔
”تم دعا کرو صبیحہ...... باقی میں معاملہ سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ عاصم تھکے تھکے انداز میں گہری سانس لیتا، اسے تسلی دے کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ صبیحہ شوہر کی تسلی پر سر ہلا کر رہ گئی تھیں۔
”اور پلیز صبیحہ...... دلاور کا خیال رکھنا۔“ عاصم جاتے جاتے پلٹ کر اسے تاکید کرتے ہوئے بولا تھا۔ صبیحہ نے شوہر کے پریشان کن چہرے کو دیکھ کر دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ عاصم کے جانے کے بعد وہ کتنی دیر تک دلاور کو سینے سے لگائے یاور بخت کو سوچتی رہی تھیں۔
اس کی دھمکیاں، سرد نگاہیں، ان نگاہوں میں مخفی اس کے خوفناک ارادے...... صبیحہ نے جھرجھری لی تھی۔ عاصم کی بات اسے سچ لگنے لگی تھی۔ یاور بخت نے جاتے وقت اسے جن نظروں سے دیکھا تھا۔ ان نظروں کا صحیح مفہوم اسے اب سمجھ میں آرہا تھا۔
”یااللہ...... غارت ہو جائے یاور بخت...... میری زندگی سے کہیں دور چلا جائے یہ بدبخت انسان۔“ صبیحہ اندیشوں اور وسوسوں میں گھری یاور بخت کو کوسنے اور بددعائیں دینے لگی تھیں۔

❁......❁......❁
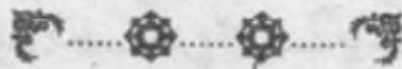
”حماد نے میرے ساتھ......“ شبنم نے ارسل کے الجھن بھرے چہرے کو دیکھا اور پھر اٹک اٹک کر بولنا شروع کیا۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اسے کیا کہنا ہے۔ وہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بتا رہی تھی کہ حماد نے اس کے ساتھ زیادتی کی کوشش کی مگر اسی لمحے دروازے پر حماد آ کھڑا ہوا۔ اسے اس طرح روتا پیٹتا دیکھ کر حماد کا ماتھا بری طرح ٹھنکا تھا۔
”یہ اب کون سا نیا ڈراما کرنے جا رہی ہے؟“ حماد نے کوفت بھرے انداز میں سوچا۔
”تم نے مجھے حرافہ کہا تھا ناں حماد...... اب دیکھو حرافہ ہوتی کیا ہے۔“ شبنم نے اسے بڑی جتاتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ نظروں کے اس تبادلے نے حماد کو بری الجھا دیا۔ اس کی چھٹی حس اسے عنقریب کچھ غلط ہونے کا اشارہ دینے لگی۔
”ہاں بولو شبنم...... کیا، کیا ہے میں نے تمہارے ساتھ؟“ حماد کچھ سوچ کر اسی کے الفاظ دہراتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا کمرے میں داخل ہوا۔ ارسل عقب سے آتی حماد کی آواز پر چونک کر پلٹا۔

''حماد کیا ہوا ہے شبنم کو...... یہ اس طرح یہاں کیوں بیٹھی ہے؟'' ارسل نے فکرمندی سے اٹھ کر حماد کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے سوال کیا۔ اس سے پہلے کہ حماد کچھ کہتا، شبنم نے چونک کر ارسل کو اٹھتے ہوئے دیکھا اور پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارسل بھائی حماد نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا...... اس نے میرے ساتھ......'' شبنم نے تیز نظروں سے حماد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ فیروز حسن اور گرینی اچانک اس کی نظروں کے سامنے، دروازے پر آ کھڑے ہوئے تھے۔

''کیا ہوا ہے شبنم...... یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے، تم تو اچھی بھلی تیار تھیں پھر یہ کیا ہوا؟'' گرینی نے اچنبھے سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سب یہاں موجود ہیں...... حماد کو اپنی محبت کے سامنے سر جھکانے اور تذلیل کا بدلہ لینے کا اس سے بہترین موقع نہیں ہوسکتا۔'' شبنم دل ہی دل میں سوچ کر، حماد کو سہمے ہوئے انداز میں دیکھتی بے اختیار گرینی کی جانب بڑھی۔

''گرینی......'' گرینی کو آنسو بھری نگاہوں سے دیکھتے بے ساختہ لپٹ گئی۔

''ارے میری بچی...... بتاؤ تو ہوا کیا ہے، کیوں اس طرح زاروقطار رو رہی ہو؟'' گرینی نے بری طرح پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

''تم بتاؤ حماد...... آخر ماجرا کیا ہے، کیوں رو رہی ہے شبنم اتنی بری طرح؟'' فیروز حسن، حماد کو پریشانی سے دیکھتے ہوئے استفسار کرنے لگے۔

''بابا جانی...... میں بتاتی ہوں آپ کو، میں انہیں پرفیوم دینے آئی تھی اور انہوں نے میرے ساتھ...... بہت برا کیا......'' حماد کے کچھ کہنے سے پہلے ہی شبنم تیز تیز لہجے میں حماد کی جانب اشارہ کر کے بتانے لگی۔ آخری جملہ اس نے انتہائی ڈرامائی انداز میں روتے ہوئے کہا۔

''اچھا...... کیا برا کیا ہے میں نے تمہارے ساتھ؟'' حماد نے چند قدم آگے بڑھ کر، سرد نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''پلیز یار...... تم لوگ اب یہ سسپنس ختم بھی کرو۔ حماد کچھ اندازہ بھی ہے تمہیں کہ کتنی دیر ہوگئی ہے۔ ماریانہ کب کی بیچ پر پہنچ کر شدت سے ہم سب کی منتظر ہے مگر تم دونوں کے جھگڑے ہی ختم نہیں ہو کر دے رہے۔'' ارسل بیزار لہجے میں بولا۔

''بالکل صحیح کہہ رہا ہے ارسل۔ بات کیا ہے آخر...... تم دونوں بتاتے کیوں نہیں؟'' فیروز حسن بھی دونوں کو خفگی سے دیکھتے ہوئے بولے۔

''بات کچھ بھی نہیں ہے بابا۔ شبنم کو یہ ڈریس پسند نہیں آ رہا تھا اور وہ اس وقت بضد تھی کہ میں اسے مارکیٹ لے کر جاؤں اور کوئی دوسرا ڈریس دلاؤں۔ وقت اتنا نہیں تھا کہ میں اسے مارکیٹ لے جا کر دوسرا ڈریس دلاتا۔ اسی لیے میں نے اسے سمجھایا کہ ضد چھوڑو اور اسی ڈریس میں تقریب اٹینڈ کرو مگر یہ بات ماننے کو تیار ہی نہیں تھی۔ اسی لیے کمرے میں منہ پھلائے بیٹھی ہے اور اس نے اپنے اس ڈریس کا کیا حال کر لیا غصہ میں آ کر آپ سے دیکھ لیں۔'' حماد نے ان سب کو دیکھتے ہوئے سوچ سمجھ کر بہانہ گھڑا۔ شبنم کی انتہائی گری ہوئی حرکات کے باوجود وہ اب بھی اس کی عزت و حرمت کا خیال رکھ رہا تھا۔ تب ہی سچائی بتانے سے گریزاں تھا۔ ارسل سمیت ان سب نے حماد کی ساری بات سن کر

سکون کا سانس لیا۔

"یہ جھوٹ ہے..... غلط بیانی کر رہے ہیں۔" شبنم چلائی۔

"اچھا یہ جھوٹ ہے تو ایک کام کرتے ہیں۔ تقریب سے واپسی پر سی ٹی وی پر چیک کر لیں گے پھر سب کو پتا چل جائے گا کہ کون کتنا سچا اور کتنا جھوٹا ہے۔" حماد نے ہلکے پھلکے انداز میں کندھے اچکا کر جتاتے ہوئے شبنم کی بات کا جواب دیا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے..... تم دونوں کا جھگڑا تقریب سے واپسی پر نبٹائیں گے۔ جاؤ شبنم بیٹا حلیہ ٹھیک کر کے جلدی سے آؤ ہم لوگ گاڑی میں بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" فیروز حسن نے حماد کی بات سے متفق ہوتے ہوئے ان سب کو اپنا فیصلہ سنا کر ارسل سے کہا۔

"چلو ارسل بیٹا۔" ارسل سر ہلاتا فیروز حسن کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ حماد بھی گرینی کو اپنے ساتھ لیے ایک جتاتی ہوئی نظر شبنم پر ڈال کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

"او مائی گاڈ..... سی سی ٹی وی کو میں کیسے بھول گئی۔" شبنم بری طرح ٹپٹا کر سر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔

"شکر ہے بچت ہوگئی..... اگر کچھ ایسا ویسا بول دیتی تو بہت برا پھنستی۔" بڑبڑاتے ہوئے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر بالوں میں برش پھیرنے لگی۔

"اف..... کتنا مشکل ہوتا جا رہا ہے حماد کے دل میں اپنی محبت کا احساس جگانا۔" وہ ٹشو کی مدد سے اپنے چہرے پر پھیلے کاجل کا نشان صاف کرنے لگی۔ "لیکن میں بھی ہار نہیں مانوں گی..... تمہیں اتنا بے بس کر دوں گی حماد کہ تم فاریہ کو چھوڑ کر مجھے اپنانے پر مجبور ہو جاؤ گے۔" آئینے کی پرشفاف سطح پر جھلکتے، اپنے سراپے کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے شبنم نے فاتحانہ انداز میں مسکرا کر خود کو دیکھا اور کمرے سے نکل گئی۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

"تم نہیں جانتی صبیحہ جو تھپڑ تم نے مجھے مارا ہے۔ وہ تمہیں کس قدر مہنگا پڑے گا۔" یاور بخت سگریٹ سلگائے لاؤنج میں ٹہلتے ہوئے سوچ رہے تھے۔ ان کی نگاہوں کے سامنے اب تک وہ منظر گھوم رہا تھا جب صبیحہ نے سب کے سامنے انہیں تھپڑ مارا تھا۔ زندگی ان کے ساتھ بڑے نرالے کھیل کھیلتی آئی تھی۔ باپ کی کردار کی گندگی کا تاوان انہیں اپنی خوشیاں قربان کر کے ادا کرنا پڑا تھا۔ محمود بیگ کا دھوکا، صبیحہ کی جدائی، بجل کی بے وفائی، اولاد کی محرومی..... ان کی زندگی تو جیسے ایک کے بعد ایک آزمائش گاہ بن گئی تھی۔ ایک امتحان ختم ہوتا نہیں کہ دوسرا شروع ہو جاتا مگر وہ مضبوطی سے کھڑے رہے۔ ہر مشکل کا جم کر مقابلہ کرتے رہے۔ اپنے راستے کے تمام حریفوں کا نام ونشاں مٹا دیا مگر صبیحہ کا غم انہیں بے چین اور بے کل رکھتا تھا۔ خاص طور پر جب سے انہوں نے اسے عاصم اور اس کے بیٹے کی سنگت میں خوشی سے نہال دیکھا تھا تب سے وہ ایک ان دیکھی آگ میں جھل جل رہے تھے۔ جب وہ نامراد رہے تو صبیحہ بامراد کیسے ہو سکتی ہے۔ ان کے نصیب کے حصے میں مایوسی رقم تھی تو صبیحہ کو کیوں خوشی ملی۔ انہوں نے دھتکار دیا تھا صبیحہ کو، بھلا دھتکارے ہوئے لوگ کیسے معرفت پا لیتے ہیں۔ کیا دھتکارنے سے کسی کے نصیب سنور سکتا ہے۔ اچانک فون کی گھنٹی نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کی۔ وہ عجلت کے عالم میں ٹیلی فون کی جانب بڑھے۔

"ہیلو..... یاور بخت بات کر رہا ہوں۔" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے پررعب انداز میں بولے۔

''جانتا ہوں۔ کام اچھی طرح کیا ہے تم نے۔'' وہ پراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے بولے۔

''ہونہہ...... عاصم کے گھر کی ملازمہ کا معاوضہ دے دیا؟'' سگریٹ کا بھرپور کش لگاتے ہوئے انہوں نے استفسار کیا۔

''اس عورت نے گھر سے بچہ غائب کرنے میں تم لوگوں کی معاونت کی اور پھر بعد میں ان دونوں میاں بیوی کی غیر موجودگی میں بچہ بھی گھر پر لے گئی۔ سمجھو تم لوگوں کی راز دار ہے وہ۔ خاص نظر رکھنا اس پر۔ جب تک کام نہیں نکلتا اس عورت کو اپنے ہاتھ میں رکھو۔'' یاور بخت تحکمانہ انداز میں بولے۔

''ہونہہ...... ٹھیک ہے۔ اگلے کام کے لیے تیار رہو۔ بس خیال رکھنا یہ کام پہلے سے بھی زیادہ احتیاط کے ساتھ کرنا ہے۔'' یاور بخت نے تاکید کرتے ہوئے فون کریڈل پر رکھ دیا۔ ان کے چہرے پر پراسراری مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اوہ صبیحہ...... تم نے ٹھیک کہا تھا۔ تمہارا بچہ میں نے ہی اغوا کیا تھا۔'' سگریٹ کا کش لگا کر دھوئیں کا مرغولہ فضا میں چھوڑتے وہ خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئے۔

''اور کتنی بھولی ہو تم...... اپنے بچے کو ڈھونڈنے میرے ہی در پر چلی آئیں۔ جیسے میں بیوقوف ہوں جو یہاں اسے چھپا کر رکھوں گا۔'' وہ ہنستے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''تمہیں کیا لگتا تھا صبیحہ تم پولیس لے کر آؤ گی اور اپنے بچے کو مجھ سے چھڑا لو گی۔ بیوقوف عورت یہ پولیس بھی میرے گھر کی باندی ہے اور تمہارے گھر کی ملازمہ بھی میرے ہاتھوں بک چکی ہے۔ تم بس اب دیکھتی جاؤ کہ میں تمہارے ساتھ کرتا کیا ہوں۔ جو تھپڑ تم نے میرے منہ پر مارا ہے۔ اس کی گونج تمہیں پچھتاوے کی صورت ساری زندگی سنائی دے گی۔'' یاور بخت کی سرخ آنکھوں سے اس پل انتقام جھلک رہا تھا۔

❁......❁......❁

کونچا بیچ کی سنہری ریت پر سفید کرسیاں بڑی ترتیب سے دونوں جانب سجی ہوئی تھیں اور ان کرسیوں کے دونوں اطراف کے درمیان سفید قالین بچھے ہوئے تھے جس کے دونوں اطراف سفید سنگ مرمر کے خوش رنگ پھولوں سے سجے گلدان رکھے تھے۔ قالین اور گلدان کا سفر نیلے سمندر کا رخ کیے ایک انتہائی خوب صورت گیٹ کے سامنے ماتھا ٹیک کر ختم ہوتا تھا۔ گیٹ سفید اور گلابی پھولوں سے سجا تھا۔ گیٹ کے دونوں اطراف ہلکا گلابی جالی دار پردہ، گیٹ کے نگہبان کی صورت گویا ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ پھول دار گلابی گیٹ سے نیلے جہاں کا نظارہ ہو رہا تھا۔ سفید بادلوں سے ڈھکا نیلا آسمان زمین پر سبز و نیلا رنگ اوڑھے پرسکوت سمندر کا منظر ایک حسین نظارہ پیش کر رہا تھا۔

ماریانہ سرمئی گاؤن میں ملبوس...... آسمان سے اتری کوئی پری محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے گاؤن پر کاسنی اور ہلکے گلابی رنگ کے پھول بنے تھے۔ اس کی خوب صورت گہری بھوری زلفوں میں ستارے ٹکے تھے، چار حصوں میں بٹ کر انتہائی خوب صورتی وسلیقے سے ایک دوسرے میں گوندھی ہوئی، اس کے دائیں شانے پر دھری تھی۔ اس کے ہاتھوں میں بروچ بکے تھا جس میں سنہرے برگنڈی، کریمی رنگ کے حسین گلاب موجود تھے۔ موتیوں کی تین لڑی اس کے کے ایک سرے سے دوسرے سرے کو چھوتی، جھول رہی تھیں۔ ماریانہ سمندر کی جانب رخ کیے کھڑی تھی۔ سورج کی کرنیں اس کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی سنگ تراش نے سنہرے پتھروں کا مرمریں مجسمہ تراش کر کونچا کے ساحل پر کھڑا کر دیا ہو۔

سرمئی کوٹ پینٹ اور سفید شرٹ میں ملبوس ارسل، چہرے پر مسکراہٹ سجائے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ماریانہ کے پہلو میں آ کھڑا ہوا۔ ایک بھرپور نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ ارسل نے دھیرے سے اس کے بازو میں اپنا بازو حمائل کیا۔ سنہرے مجسمے میں جیسے زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ماریانہ نے بے ساختگی کے عالم میں رخ موڑ کر ارسل کی جانب دیکھا اور بے اختیار مسکرا دی۔

"بہت انتظار کرایا تم نے۔" ماریانہ نے مسکراتے ہوئے شکوہ کیا۔

"بس یہ آخری انتظار تھا۔ آج کے بعد کوئی انتظار ہمارے درمیان نہ آئے گا۔" ارسل نے بھی جوابی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا گلہ دور کیا۔

وہ دونوں سبک سبک قدم اٹھاتے گیٹ کی جانب بڑھنے لگے۔ تقریباً سب مہمان آ چکے تھے ماریانہ نے کچھ فاصلے پر شفیق مسکراہٹ کے ساتھ کھڑی گرینی کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ماریانہ کے لیے ممتا کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجزن تھا۔ صوفیہ ان کے ساتھ ہی کھڑی اسے ممتا بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے صوفیہ کو بھی مسکرا کر دیکھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی دنیا مکمل ہو چکی ہے۔ اپنی زندگی کا غالباً وہ سب سے حسین پل جی رہی تھی۔ اس نے نگاہوں کا رخ پھیر کر اپنے پہلو میں موجود ارسل کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر اس کی مخصوص مسحور کن مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ماریانہ کا دل کیا وہ ارسل کو یوں ہی دیکھتی رہے اور یہ پل یہیں ساکت ہو جائے۔ وہ اور ارسل کسی خوب صورت فوٹو فریم میں فکسڈ ہو جائیں۔ زندگی کا یہ حسین پل قید ہو جائے۔

"وعدہ کرو...... زندگی بھر اتنی ہی محبت سے مجھے دیکھتی رہو گی۔" ارسل کی نگاہیں بھلے لوگوں پر جمی تھیں مگر اس کی حسیں ماریانہ پر تھیں۔ وہ بنا دیکھے بھی جان گیا تھا کہ ماریانہ کی نگاہیں اس کے چہرے پر ٹھہری گئیں ہیں۔

"زندگی بھر...... آخری آسانس تک......" ماریانہ مسکرا کر نظروں کا زاویہ بدل کر سامنے گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"آخری سانس تک...... تم نے تو پل میں نظریں پھیر لیں۔" ارسل نے ماریانہ کو دیکھتے ہوئے اس کے نگاہیں پھیرنے پر مسکرا کر چوٹ کی۔

"پہلو میں تم ہو اور ہماری منزل سامنے ہے۔ راستے پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے سنیور ارسل۔" ماریانہ نے شرارت سے جواب دیا۔

"ان راستوں میں، میں ہی تمہاری آنکھیں میں ہوں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں ماریانہ، تمہیں راستوں کی فکر کی ضرورت نہیں ہے۔" ارسل نے گمبھیر لہجے میں ماریانہ کے کان میں سرگوشی کی۔ ماریانہ دھیرے سے مسکرائی دفعتاً ان دونوں کی نگاہیں بائیں جانب کھڑے فیروز حسن پر پڑیں وہ حماد کے ساتھ کھڑے ان دونوں کو شفقت سے دیکھتے مسکرا رہے تھے۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ پڑھیں)

بیٹیاں

ام خدیجہ

میں پچھلے سات ماہ سے اذیت کا شکار ہوں اور یہ اذیت میری خود ساختہ ہے جبکہ گھر والوں نے قدم قدم پر مجھے سنبھالا اور ساتھ دیا اگر یہ کہوں کہ مجھے میری ساس اور شوہر نے ہتھیلی کا چھالا بنا رکھا ہے تو غلط نہ ہوگا، میں اپنے ماں باپ کی پانچ اولادوں میں سے تیسرے نمبر پر ہوں اور ان پانچوں اولادوں میں نرینہ اولاد کوئی بھی نہیں ہے، بچپن سے میری خواہش تھی کہ میرا بھی کوئی بھائی ہو، جب دوستیں اپنے بھائیوں کے قصے سناتی تو میرے اندر ایک محرومی جاگ جاتی، کسی کا بھائی کالج چھوڑنے آتا تو کسی کا بھائی لینے اور پھر واپسی میں گول گپے اور چاٹ کھا کر گھر جاتے۔ کوئی اپنی بہن کو جیب خرچ اچھی دیتا ہے تو کوئی بہنوں کے ناز نخرے اٹھاتا ہے۔

غرض یہ کہ میں اپنی چھوٹی بہنوں کو طعنے دیتی کہ کاش تم لڑکیاں نہیں لڑکے ہوتے۔ میرے نزدیک اہمیت اس بات کی تھی کہ جو لڑکیاں بھائیوں والی ہوتی ہیں انہیں معاشرے میں تحفظ بھی ملتا ہے اور سسرال بھی دب کے رہتا ہے۔ میں اٹھارہ برس کی تھی جب میری پھوپو نے اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے مجھے ابو سے مانگ لیا تھا۔ میں نے بہت احتجاج کیا بہت روئی مگر میرے آنسوؤں نے کسی پر اثر نہیں کیا۔ بات یہ نہیں تھی کہ فیصان میں کوئی برائی تھی یا میں فیضان سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی، بلاشبہ فیضان ایک بہترین ہم سفر ثابت ہوئے۔ میرا انکار اس بات پر تھا کہ میں پڑھنا چاہتی تھی، میرا یہ احتجاج نکاح نامہ پر دستخط کرنے تک رہا اور آگے پڑھنے کا خواب، خواب ہی رہ گیا تھا۔

فیضان بچپن سے ہمارے گھر آتے رہے تھے۔ ابو کے لیے بیٹوں کی طرح تھے۔ بجلی، گیس کا بل جمع کروانا، بہنوں کے لیے کالج سے داخلہ فارم لانا، ابو

وڈاکٹر کے پاس لے جانا یہ سب ذمہ داری فیضان نے اپنے سر لے رکھی تھی۔ فیضان مجھ سمیت میری ھوٹی بہنوں کے لیے فیضان بھائی تھے، میرے د یک سنجیدہ، سوبر اور نظریں جھکا کے بات کرنے لے مجھ سے تو کبھی کوئی لمبی گفتگو نہیں کی مگر میری یہ وچ شادی کی پہلی رات ہی غلط ثابت ہوئی جب ضان نے یہ کہہ کر میرا ہاتھ تھاما تھا۔

''حریم...... مجھے معلوم ہے تم مجھ سے شادی نہیں رنا چاہتی تھی۔'' میں نے چونک کر فیضان کو دیکھا۔ میرے ہاتھ پر بنے مہندی کے نقش و نگار کو دیکھ ہے تھے اور میرا ہاتھ ان کے ہاتھوں میں کپکپا رہا ا۔

''تم پڑھنا چاہتی ہو، میں تمہاری راہ میں کبھی ائل نہیں ہوں گا۔ تم اپنی تعلیم جاری رکھو اور اپنے راب کو پورا کرو، تم جو سوچتی تھیں تمہارا بھائی ہوتا تو الج چھوڑنے اور لینے آتا تو یہ فرائض میں بھی انجام ے سکتا ہوں۔ گول گپے، چاٹ بھی کھلاؤں گا اور ہارے ناز نخرے بھی اٹھاؤں گا۔'' فیضان نے ونمائی کی انگوٹھی پہناتے ہوئے کہا اور میرا دل چاہا امنے میز پر رکھا گل دان اپنی چھوٹی بہنوں کے سر پر دوں جو الف سے لے کر ی تک میری ہر بات پنے چہیتے فیضان بھائی کو سناتی رہی تھیں۔

میری شادی کو کچھ ہی مہینے گزرے تھے میری یعت بوجھل رہنے لگی اور پھر ڈاکٹر کا انکشاف کہ ں امید سے ہوں میری اور فیضان کی زندگی میں رید خوشیاں لے آئی اور بہت جلد اللہ نے ہمیں اپنی مت سے نوازا، جس کا نام ہم نے ہانیہ رکھا۔ ہانیہ نے دو دانت نکالے، چلنے لگی تو ایک بار پھر میں امید ے ہوگئی، میں فیضان سے ناراض تھی اور وہ بہت ش تھے۔ مجھے سمجھاتے۔

''جب اللہ ہمیں اولاد کی نعمت سے نواز رہا ہے تو یں خوش ہونا چاہیے اور اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔'' دل میں آس اور یقین تھا اس بار اللہ مجھے بیٹا دے گا پر یہ یقین اس وقت ٹوٹا جب دوسری بار بھی اللہ نے بیٹی سے نوازا اور پھر ایک ایک سال کے وقفے سے ہانیہ کے بعد رانیہ اور تانیہ ہمارے گھر اللہ کا تحفہ بن کر آئیں۔ میری زندگی کا محور میری تینوں بیٹیاں ہیں۔ پڑھنے کا خواب ہی رہا...... مجھے یاد ہے شادی کے بعد میں فیضان پر زور دیتی کہ مجھے آگے تعلیم حاصل کرنا ہے تو پھوپو ہنستی تھیں۔

''عورت کے لیے شادی کے بعد پڑھنا لوہے کے چنے چبانے کے برابر ہے۔'' اور میں ہنس کر کہتی۔

''پھوپو میں یہ چنے چبانے کے لیے تیار ہوں۔''

آج میں سوچتی ہوں پھوپو صحیح کہتی تھیں۔ شادی کے بعد تعلیم جاری رکھنا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف ہے۔ ان بچیوں کے ساتھ میں خود پر توجہ نہیں دیتی کجا آگے پڑھتی۔ میرے دل کے کسی ایک کونے میں بیٹے کی خواہش پنپ رہی تھی، جب دوسری بار میں امید سے تھی تو میری زبان پر صرف بیٹے کی دعا تھی اور تیسری بار تو میں خود غرض بن گئی تھی۔ اللہ سے جب بھی مانگا بیٹا مانگا اپنی خوشی کو مقدم جانا، میرا رب میرے لیے کیا بہتر سمجھتا ہے مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ تیسری بیٹی کی پیدائش پر میں نے اپنی بیٹی سے منہ موڑ لیا جبکہ میری یہ بیٹی دونوں بڑی بیٹیوں کے مقابلے میں بہت خوب صورت اور صحت مند تھی لیکن میرے اندر بیٹا نہیں ہونے کی ایک خلش تھی اور ایک بار پھر میں اس مرحلے سے گزر رہی تھی، میرے مزاج میں چڑچڑا پن اور خود سری آگئی تھی۔

میرے رویے کی بدسلوکی کا شکار میرے معصوم بچے ہو رہے تھے۔ بیٹے کی خواہش مجھے ان بیٹیوں سے دور کر رہی تھی، ماں باپ کے گھر پانچ بہنیں اور

اب میرے گھر بھی تین لڑکیاں...... اف...... پھوپو اور فیضان کی جان تھیں یہ لڑکیاں اور میری جان پر بنی تھی۔ لوگوں کے رویے اور باتیں مجھے مار رہے تھے۔ لوگوں کا صاف کہنا تھا۔

''ہائے بیچاری کو تین لڑکیاں ہیں، اللہ لڑکا بھی دے دیتا۔'' بیچاری کا لفظ میرا خون کھولا دیتا، کیا میں لنگڑی ہوں یا اندھی ہوں جو مجھے بیچاری کہہ دیتے اور پھر میرا پارہ چڑھ جاتا اور میرا غصہ میری معصوم بچیوں پر نکلتا تھا۔

❁ ❁

رات کھانا کھانے کے بعد فیضان کمرے میں کتاب کا مطالعہ کررہے تھے اور میں سامنے دیوار پر لگی تصویر میں موجود گلابی گال والے بچے میں منہمک تھی۔ بچے کی تصویر دیکھتے ہوئے بے شمار آنسو میری آنکھوں سے نکل کر میرے گال بھگو رہے تھے۔

''حریم کیا ہوا کیوں رو رہی ہو؟'' فیضان نے کتاب میز پر رکھ کر مجھ سے پوچھا۔ میں خاموش رہی اور فیضان میری خاموشی پر پریشان ہوگئے اور میرے سامنے آ کر بیٹھ گئے۔ میرے رونے میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔

''مجھے بتاؤ کیا ہوا، تمہاری طبیعت ٹھیک ہے، بچہ ٹھیک ہے؟ تم ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں، میں کہہ رہا تھا میں لے کر جاؤں گا پر تمہیں آج ہی جانا تھا۔ کیوں رو رہی ہو؟'' فیضان کے لہجے میں میرے لیے محبت، فکر اور پریشانی تھی۔

''فیضان میں نے الٹرا ساؤنڈ کروایا تھا، اس بار بھی بیٹی ہوگی۔''

''او خدایا حریم تم پاگل لڑکی مجھے پریشان کردیا۔'' فیضان نے اپنا سر تھام لیا۔

''اس میں مسئلہ کس بات کا ہے؟'' فیضان نے سوال کیا۔

''یہ آپ کے لیے مسئلہ نہیں ہے؟'' میرا لہجہ بھی سوالیہ تھا جب کہ میں جانتی تھی یہ بیٹیاں اپنے باپ کی جان اور کل کائنات تھیں۔

''بالکل نہیں۔'' فیضان نے نفی میں سر ہلایا۔

''میں کیا کروں فیضان میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میرا بھی بیٹا ہو، یہ لڑکیاں اپنے گھر چلی جائیں گی اور ہم تنہا رہ جائیں گے۔ اللہ مجھے بیٹا کیوں نہیں دیتا، کیا وہ مجھے نہیں دے سکتا اس کے خزانے میں کون سی کمی ہوجائے گی، اسے میرے آنسو نظر نہیں آتے؟'' میری زبان پر شکوہ تھا اور بیٹے کی خواہش نے وہ تمام نعمتیں جو میرے رب نے مجھے دی تھیں بھلا دی تھیں۔

''پہلی بات یہ کہ میں نے تمہیں الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے معلوم کروانے کے لیے منع کیا تھا۔ تم باقی ماہ یہی سوچتے ہوئے گزارو گی اس طرح تمہاری اور بچے کی صحت پر برا اثر پڑے گا جو بات ہمارے رب نے پوشیدہ رکھی ہے ہم اسے کیوں معلوم کرواتے ہیں اور جو تم شکوہ کررہی ہو کہ اللہ کے خزانے میں کمی نہیں ہوجائے گی تو بے شک وہ ہمیں ایک کیا پانچ بیٹے بھی دیتا تو کمی نہیں ہوتی اس کے خزانے میں، اہمیت اس بات کی نہیں ہونی چاہیے کہ ہم کیا چاہتے ہیں بلکہ اس بات کی ہونی چاہیے ہمارا رب کیا چاہتا ہے۔ اس نے ہمارے لیے کیا بہتر سمجھا۔ حریم میں نے لوگوں کو اولاد کے لیے ترستے دیکھا ہے اور تم بیٹے کے لیے رو رہی ہو۔ لڑکیوں کی بہترین اور اچھی تربیت پر ہی جنت کی بشارت ہے۔ یہ وہ رحمت ہے جو بن مانگے دی جاتی ہیں، تمہاری طرح ہر کوئی بیٹے کی تمنا کرتا ہے، پر بیٹیاں وہ تحفہ ہیں جو اللہ اپنی خوشی اور رحمت سے دیتا ہے۔ اللہ نے اپنے نبیوں کو طویل عرصے بے اولادی کے بعد بڑھاپے میں اولاد سے نوازا۔ حضرت زکریا علیہ السلام کو بڑھاپے میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی بشارت ملی اور ہم گناہ

گاروں کو بغیر مانگے، بغیر کسی آزمائش کے اولاد سے نواز رہا ہے اور تم اس سے شکوہ کررہی ہو، مجھے تمہاری سوچ پر افسوس ہورہا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے۔

’’آسمانوں کی اور زمین کی سلطنت اللہ ہی کے لیے ہے...... وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے...... جس کو چاہتا ہے بیٹیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹے دیتا ہے یا انہیں جمع کردیتا ہے بیٹے بھی اور بیٹیاں بھی۔ وہ بڑا علم والا اور کامل قدرت والا ہے۔ (۵۰ سورہ الشوریٰ)۔

یہ اس کی تقسیم ہے اور وہ بہترین پالنہار اور انصاف کرنے والا ہے۔ کس کے لیے کیا بہتر ہے وہی بہترین جاننے والا ہے۔ بیٹے کی خواہش فطری ہے مگر تم اس کو خود پر سوار نہیں کرو۔ اپنی رب سے نیک صالح اولاد مانگو بیٹا بھی مانگو بیشک وہی سننے اور دینے والا ہے پر جب بیٹی سے نوازے تو منہ نہیں موڑو، یاد رکھو حریم یہی بیٹیاں جنت میں لے کر جائیں گی۔ بیٹیاں رحمت ہیں اور رحمت اللہ اپنی خوشی سے نوازتا ہے اور بیٹے نعمت، بے شک اللہ بیٹے بھی اپنی خوشی سے نوازتا ہے مگر اس نعمت کا سوال بھی ہوگا، یہ اولاد ہمارا امتحانی پرچا ہیں، اس امتحانی پرچے میں ہم کیا لکھ رہے ہیں اس کی فکر کرو، یہ اولاد امانت ہے، اس کی حفاظت ہمارے ذمہ ہے۔ ان کی بہترین تربیت اور پرورش اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے مطابق کی تو ہم یقیناً اس امتحان میں کامیاب ہوں گے۔ میں تمہیں بے وقوف سمجھتا تھا مگر تم تو عقل سے پیدل نکلی...... صرف اس بات پر پریشان ہو، مجھے اور بچوں کو نظر انداز کررہی ہو، میری تو خیر ہے مگر میری بیٹیاں تمہارے رویے سے سہم گئی ہیں اور تم سے دور ہورہی ہیں۔ تم ان معصوم بچیوں سے غفلت برت رہی ہو۔‘‘ فیضان نے مجھے سمجھایا۔

’’ویسے حریم اللہ اگلی بار ہمیں بیٹا دے سکتا ہے...... اچھی امید رکھو، امید پر دنیا قائم ہے میری جان۔‘‘ مجھے خود سے قریب کرتے ہوئے فیضان نے کہا۔

’’اللہ کا خوف کریں۔‘‘ کہہ کر میں نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ’’یعنی اگلی بار پھر یہ مراحل نہیں بھئی۔‘‘ فیضان کا قہقہہ بلند ہوا اور میرے اندر تک سکون اتر گیا تھا۔

صحیح معنوں میں، میں نے رب کا شکر ادا کیا، بہترین سسرال اور جیون ساتھی بھی بہت بڑی نعمت ہے۔ مجھے ڈر اس بات کا لگتا تھا شاید اس بار فیضان مجھے طعنہ دیں کہ پھر ایک بیٹی مگر نہیں، فیضان کی سوچ اور فطرت ان جاہل مردوں جیسی نہیں ہے جو سارا الزام عورتوں پر ڈال دیں اور زندگی بھر طعنہ دیں کہ تم نے صرف بیٹیاں پیدا کی ہیں۔ فیضان پھر کتاب پڑھنے لگ گئے اور میں پھوپو کے کمرے میں اپنی چھوٹی بیٹی کو لینے جارہی ہوں جو پچھلے کچھ دنوں سے پھوپو کے ساتھ سورہی تھی مگر آج وہ میرے ساتھ سوئے گی اور میری چھوٹی بیٹی کی محبت میرے اندر ٹھاٹے مار رہی ہے اور اس کا مجھے بے صبری سے انتظار ہے جس کا نام میں نے سارہ رکھنا ہے اور اس بار بھی فیضان مجھے ہی نام رکھنے دیں گے اس بات کا مجھے یقین ہے۔

’’اللہ میری بیٹیوں کا نصیب اچھا کرے اور انہیں دنیا و آخرت کی تمام خوشیاں نصیب ہوں، آمین۔

خوب صورت، بد صورت

مسکان نور

"کیا میں اور شادی اس بدصورت شاہ میر سے کروں گی؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے ناں۔" حمیرا اپنی چھوٹی بہن اریبہ کی بات سن کر غصے اور غم میں آ کر تقریباً چیخی اور یقیناً اس کی یہ چیخ نما آواز لاؤنج میں گونجی تھی جہاں اس کی چچی جو رشتے میں اس کی سگی خالہ بھی تھی اور ان کی بیٹیاں رمشا اور عائشہ بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی یہ آواز باہر بیٹھے سب بہ آسانی سن چکے تھے اور ان کے چہرے اپنی اتنی بے عزتی پر مرجھا سے گئے تھے۔ انہیں حمیرا سے اتنی بے باکی کی امید بالکل نہیں تھی۔
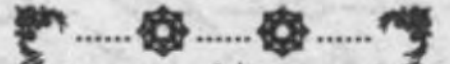
فوزیہ بیگم بھی اپنی بیٹی کی بات سن کر گھبرا سی گئی تھی۔ تینوں ماں بیٹیاں اٹھی اور فوزیہ بیگم پر افسوس بھری نظر ڈال کر چلی گئی تھیں۔ فوزیہ بیگم نے انہیں روکنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن کون اتنی بے عزتی برداشت کر کے بیٹھا رہتا، عزت نفس تو ہر انسان اپنے پاس رکھتا ہے اور کمرے کے اندر اریبہ گھبراتے ہوئے اپنی بہن سے دبے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"آہستہ بولیں آپی کیا ہو گیا ہے۔ آپ چچی جان کو خود اپنا انکار پہنچا رہی ہیں۔" اریبہ کے لہجے میں خفگی تھی۔ حمیرا نے اسے بری طرح سے گھور کر دیکھا۔

"ہاں پہنچا رہی ہوں میں اپنا انکار، مجھے نہیں کرنی اس شاہ میر سے شادی۔" حمیرا تلخ ہو کر بدتمیزی سے بولی لیکن کمرے میں اندر داخل ہوتی اپنی ماں کا سرخ چہرہ دیکھا تو خاموش ہو گئی۔

"تو نہ کرو کس نے تمہیں مجبور کیا ہے کہ تم شاہ

بچے سے شادی کرو لیکن اپنا یوں تماشہ تو مت بنواؤ کچھ تو لحاظ کرلیا کرو لڑکی ذات ہو۔'' فوزیہ بیگم غصے سے کانپتے لہجے میں بولی۔

''لڑکی ہوں مگر مجبور نہیں، امی جان اچھا ہے کہ انہوں نے خود میرا انکار سن لیا اب دوبارہ یہاں آنے کی جرأت نہیں کریں گے۔'' حمیرا سکون سے کہتی ایک نظر ماں اور بہن پر ڈالتی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

فوزیہ بیگم کی آنکھیں اپنی بیٹی کی ہٹ دھرمی دیکھ کر بھر آئی تھیں۔ اریبہ ماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تڑپ اٹھی اور ان کے گلے سے لگ کر ماں کی پشت نرمی سے تھپکتے ہوئے تسلی دینے لگی لیکن خود اس کا دل بھی اداس ہو گیا تھا۔

❀......❀......❀

خدیجہ بیگم اور حفیظ صاحب کے دو بیٹے تھے وحید اور عارف۔ خدیجہ بیگم نے اپنے دونوں بیٹوں کی شادی اپنی بھانجیوں جو سگی بہنیں تھی سے کی تھی۔ وحید صاحب اور کوثر بیگم کے تین بچے تھے۔ شاہ میر، رمشا اور عائشہ۔ عارف صاحب اور فوزیہ بیگم کی پانچ اولادیں تھی۔ حمیرا، اریبہ اور ان سے تین چھوٹے بھائی تھے جو اسکول کالج میں پڑھ رہے تھے۔ یہ دونوں بھائی جب تک ماں باپ زندہ رہے ساتھ رہے تھے لیکن ماں باپ کے مرنے کے بعد بیچ میں دیوار کھڑی کر کے اپنے پورشن الگ کرلیے تھے لیکن دیوار تو گھر کے بیچ کھڑی کی گئی تھی دلوں پر تو نہیں، وہ اب بھی ایک ہی تھے خوشی میں غمی میں ساتھ ہوتے تھے۔ کوثر بیگم بچپن سے ہی خوب صورت سی حمیرا کو اپنی بہو بنانے کی چاہ دل میں رکھے ہوئے تھیں اور یہ بات شاہ میر کو بھی پتا تھی اور اسے اپنی ماں کی ہر خواہش عزیز تھی۔

شاہ میر اور اس کی دونوں بہنوں کے رنگ گندمی تھے مگر نقش اچھے تھے۔ حمیرا، اریبہ اور اس کے تینوں بھائی کے رنگ سرخ سفید تھے اور وہ بہت خوب صورت بھی تھے مگر غرور صرف حمیرا کو تھا وہ خود کو کم نہیں سمجھتی تھی اور خودنمائی کے غرور میں رمشا اور عائشہ کے سانولے رنگ کا بھی مذاق اڑایا کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شاہ میر کا رشتہ آنے پر وہ خود پر قابو نہیں رکھ پائی تھی۔

شاہ میر ماں کا اداس چہرہ دیکھ کر خود بھی اداس ہو گیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ حمیرا کے انکار نے کوثر بیگم کو بہت تکلیف پہنچائی ہے۔ تکلیف تو شاہ میر کو بھی بہت ہوئی تھی۔

''امی جان آپ میرا رشتہ اریبہ کے لیے لے کر جائیں مجھے یقین ہے کہ اس بار آپ مایوس نہیں لوٹیں گی۔'' شاہ میر نے ماں کے کندھے پر اپنا بازو پھیلا کر انہیں اپنے ساتھ لگا کر نرمی سے مسکرا کر کہا تو کوثر بیگم کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ دل تو ان کا بھی یہی چاہ رہا تھا پر اب وہ اپنے بیٹے پر کوئی زبردستی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''ہمیشہ خوش رہو میرے بیٹے، تم نے تو میرے دل کی بات کہہ دی، مجھے پتا ہے میری بچی اریبہ ضرور مان جائے گی کیونکہ وہ ہم سے بہت پیار کرتی ہے اور اسے چہروں سے زیادہ اندر کی خوب صورتی بہت بھاتی ہے۔'' کوثر بیگم نے خوش ہوتے ہوئے مسکرا کر بیٹے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو شاہ میر نے بھی مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا۔ ماں کو خوش دیکھ کر اس کا دل بھی خوش ہو گیا تھا اور وہ پورے دل سے مسکرا رہا تھا۔

فوزیہ بیگم نے اریبہ سے اس کی رضامندی پوچھی تو اس نے اپنا سر جھکا دیا یعنی اپنی رضامندی دے دی تھی اور یوں بڑی کے بجائے چھوٹی کی شادی کی تیاریاں ہونے لگی۔ اریبہ رخصت ہو کر

اپنے اصل گھر چلی آئی تھی جہاں خوشیاں اپنا در کھولیں اس کے استقبال کے لیے کھڑی تھی۔ ابھی اریبہ کی شادی کو کچھ دن ہی گزرے تھے کہ حمیرا کے لیے بھی بہت اچھا رشتہ آگیا تھا۔ لڑکے کی تصویر دیکھتے ہی حمیرا نے فوراً ہاں کردی تھی۔ ولید بہت ہی خوب صورت تھا اور بہت اچھی پوسٹ پر جاب کرتا تھا گھر بھی اپنا تھا لڑکی کے گھر والوں کو اور کیا چاہیے تھا بھلا، سو رشتہ پکا ہونے پر شادی کی تاریخ بھی رکھ دی گئی اور یوں حمیرا اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں کی دعاؤں میں رخصت ہوکر ولید کے گھر آ گئی تھی۔

امی جان کی کال آرہی تھی۔ حمیرا تھکی تھکی سی کچن کا کام ختم کرکے ابھی کمرے میں آئی تھی اپنے موبائل پر ماں کی کال دیکھ کر اس کی آنکھیں بھر آئی تھی۔

''السلام علیکم! امی جان۔'' حمیرا نے اپنے آنسو پیتے ہوئے بہ مشکل کہا، ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

''وعلیکم السلام بیٹا کیسی ہو؟'' ممتا بھرے لہجے میں پوچھا اور حمیرا کا دل چاہا کہ کہہ دے۔

''نہیں امی جان میں ٹھیک نہیں ہوں بھلا گھٹن زدہ ماحول میں کون آزاد سانس لے سکتا ہے۔'' لیکن اس نے کہا بھی تو صرف اتنا۔

''میں ٹھیک ہوں امی جان اور بہت خوش بھی۔''

''اچھا یہ تو بہت اچھی بات ہے میری دعا ہے کہ تم ہمیشہ خوش رہو میری بچی اور اپنے گھر میں ہمیشہ سکھی رہو اچھا تم گھر کیوں نہیں آئیں تمہارے بہن بھائی تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔''

''جی امی جان میں......'' ابھی وہ ماں کے سوال کا جواب دینے ہی والی تھی کہ ولید نے اس کے ہاتھ موبائل چھین کر اپنے کان سے لگایا اور دوسری طرف اپنی ساس کی آواز سن کر اس کے ماتھے کے بل آہستہ آہستہ کم ہوتے چلے گئے لیکن اس نے اپنی ساس کو کوئی بات نہیں کی اور فون بند کردیا تھا۔ حمیرا اپنے آنسو پینے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

''اب یہ موبائل میرے پاس رہے گا ویسے بھی لڑکیوں کے پاس نہیں ہونے چاہیے لڑکیاں خراب ہونے میں دیر نہیں لگاتیں۔'' ولید سرد لہجے میں اسے اپنا حکم سناتا موبائل اپنی پینٹ کی جیب میں رکھتا کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ اس سے یہ بھی نہیں کہہ سکی۔

''اللہ کے واسطے یہ ظلم مت کرو میرے ساتھ، تم نے مجھ سے پہلے ہی میرے اپنے دور کردیے ہیں، یہ آخری رابطہ تھا اپنوں سے جڑے رہنے کا۔'' لیکن وہ سوائے آنسو بہانے کے کچھ بھی نہ کہہ سکتی تھی اور نہ کرسکتی تھی۔ حمیرا کا شوہر ولید پہلے تو اس کے ساتھ بہت اچھا تھا لیکن پھر جیسے جیسے دن گزرتے چلے گئے ویسے ویسے ولید کا رویہ بھی بدلتا چلا گیا تھا۔ ولید ایک شکی مزاج آدمی تھا، اس کی ماں رقیہ بیگم بیٹے کی طبیعت سے اچھی طرح سے واقف تھیں لیکن بیٹے کو سدھارنے کے بجائے خاموش رہیں اور حمیرا کو بیاہ لے آئیں اور پھر ایسے بن گئی جیسے وہ کبھی بیچ میں آئی ہی نہیں تھیں۔ ولید نے حمیرا کو گھر میں بالکل بند کرکے رکھ دیا تھا۔ وہ اپنے میکے جاتی تو ولید کی شکی نظریں بھی اس کے ساتھ ہوتی تھیں۔ وہ خود اسے اپنے ساتھ لے جاتا تھا اور لے کر آتا تھا۔ حمیرا دن بہ دن ذہنی مریض بنتی جارہی تھی اس نے اپنے گھر والوں کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا پر اس کے گھر والے اب ولید کو سمجھ گئے تھے لیکن پھر بھی خاموش تھے۔

اریبہ بہن کے گھر آئی اور وہ بھی صبح کے پہر تاکہ اس کا سامنا ولید سے نہ ہو۔ حمیرا بہن کو

سامنے دیکھ کر پہلے تو ساکت ہوگئی تھی پھر اس کے وجود میں حرکت ہوئی اور وہ بہن کے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ اریبہ نے بہن کو کھل کر رونے دیا تھا۔ رونا بھی ایک نعمت ہے۔ حمیرا نے آج جانا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ وہ اریبہ سے الگ ہوئی اور اپنے آنسو صاف کر کے محبت بھری نظروں سے دیکھا تو اریبہ خود پر ضبط کرتی نرمی سے مسکرائی تھی۔ اپنی بہن کو ڈھارس دینے کے لیے اسے یہ کرنا پڑا تھا۔

''کیا کھاؤ گی، کیا پیو گی تم؟'' حمیرا نے پیار سے پوچھا تو اس نے سر نفی میں ہلایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

''کچھ بھی نہیں آپی آپ میرے ساتھ بیٹھیں مجھے آپ سے ڈھیر ساری باتیں کرنی ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ جیسا تم کہو ہاں اب بولو۔'' حمیرا خوشگوار لہجے میں مسکرا کر بولی تو اریبہ نے اور بہن کی آنکھوں میں دیکھا۔

''آپی آپ سے ایک سوال پوچھوں پلیز مائنڈ مت کیجیے گا اور بالکل صحیح جواب دیجیے گا۔'' اریبہ نے سنجیدگی سے کہا تو حمیرا نے اپنی حیرت چھپا کر اثبات میں ہلایا۔

''آپی آپ ولید بھائی کے ساتھ خوش ہیں؟'' حمیرا بہن کی بات سن کر پہلے تو خاموش رہی پھر سر اٹھا کر آنسو بھری نظروں سے بہن کو دیکھا۔

''میں خوش نہیں ہوں اریبہ، میں پل پل جیتی ہوں اور مرتی ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ بری طرح سے رو دی۔ اریبہ نے افسردہ نظروں سے اپنی بہن کو دیکھا اور اس کا ہاتھ نرمی اور محبت سے تھپتھپائے۔

''مجھے سب پہلے سے ہی پتا تھا آپی کہ آپ خوش نہیں ہیں مگر میں آپ کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔ آپی آپ نے شاہ میر کو ٹھکرایا صرف اس وجہ سے کہ وہ خوب صورت نہیں تھے پر ولید بھائی تو خوب صورت ہیں پھر کیوں آپ ان کے ساتھ خوش نہیں ہے۔ صرف ظاہری خوب صورتی ہی سب کچھ نہیں ہوتی بلکہ اندر کی خوب صورتی بہت اہم ہوتی ہے۔ انسان اندر سے حسین ہونا چاہیے۔ یہ میں نے آج آپ کا حال دیکھ کر جانا ہے شاہ میر بھلے ہی شکل وصورت میں حسین نہیں ہیں لیکن اس کا دل بہت حسین ہے۔ اس نے کبھی مجھ پر پابندیاں نہیں لگائی۔ اس سے بڑی اور کیا بات ہوگی کہ آپ سے ملنے کے لیے بھی مجھے نہیں روکا۔ حالانکہ آپ نے شاہ میر کا دل توڑا تھا مگر وہ دل کے سچ میں بہت اچھے ہیں اور میں خوش قسمت ہوں کہ شاہ میر جیسا شوہر ملا مجھے۔'' اریبہ نے سچائی بھرے لہجے میں مسکرا کر کہا اور حمیرا چہرے پر رشک اور حسرت لیے اس کا پہلے سے بھی زیادہ حسین چہرہ دیکھ رہی تھی۔ سچ ہی تو کہہ رہی تھی وہ۔ ہم ظاہری خوب صورتی کو ترجیح دیتے ہیں لیکن ہم یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔ ایسے ہی ہر خوب صورت انسان اندر سے اتنا حسین نہیں ہوتا جتنا وہ نظر آتا ہے اور اب حمیرا صرف پچھتانے کے سوائے اور کر ہی کیا سکتی تھی۔

''شیخ سعدی۔ فرماتے ہیں...... یہ ضروری نہیں جو خوب صورت ہو وہ خوب سیرت بھی ہو۔ کام کی چیز اندر ہے باہر نہیں۔''

میرا مسیحا

بینش مجید ملک

اوائل دسمبر کی رات تھی۔

اس جاڑے میں ہر چیز اپنے اپنے خول میں سمٹی ہوئی تھی لیکن اس تاریک اور سرد رات میں وہ کندھے پر جھولتی شال کو بہ مشکل سنبھالتی ننگے سر اور ننگے پاؤں اندھا دھند بھاگ رہی تھی۔ اس کو خود بھی نہیں پتا تھا کہ وہ کس سمت بھاگ رہی ہے، سخت سردی کی وجہ سے اس کی ٹانگیں شل ہو رہی تھیں اور ایک دو بار تو ٹھوکر لگنے سے وہ منہ کے بل گرتے گرتے بھی بچی لیکن پھر خود ہی سنبھل گئی تھی۔ وہ بھاگتے ہوئے کتنی دور نکل آئی تھی اس بات کا اندازہ اسے خود بھی نہیں ہوا تھا، پیاس کی شدت سے اس کا گلا خشک ہوا اور وہ نڈھال ہو گئی تھی، اس نے آس پاس نظر دوڑائی لیکن کہیں بھی پانی کی کوئی امید اس کو نظر نہ آئی، اس کی ٹانگوں سے جان نکل رہی تھی۔ پھر بھی وہ سب سے انجان اندھا دھند بھاگ رہی تھی اس کو ڈر تھا کہ کوئی اس کو پکڑنے آ رہا ہے، وہ جس سے بچ کر نکلی تھی وہ اس کے تعاقب میں ہے۔ شدید سردی اس کی ہڈیوں میں اتر رہی تھی، آنسو اس کی آنکھوں کے بند توڑ کر گالوں کو بھگو رہے تھے۔ بھاگتے ہوئے ایک دم سے اس کے سر میں درد کی لہر اٹھی، اس نے سر کو تھاما اور سامنے سے آتی گاڑی کی ہیڈ لائٹس تو نظر آ رہی تھی لیکن اسے یہ نہیں پتا تھا کہ وہ خود کس طرف بھاگ رہی ہے؟ گاڑی بہت تیز رفتاری سے آ رہی تھی، اچانک ہی سامنے آ جانے والی لڑکی کو دیکھ کر زین نے بمشکل بریک لگائے تھے لیکن تب تک وہ لڑکی گاڑی سے ٹکرا گئی تھی۔ ٹکر اتنی زوردار تھی کہ وہ سنبھل ہی نہ پائی اور منہ کے بل گری پڑی تھی۔ گاڑی کے ٹائر تیز آواز کے ساتھ چرچرائے تھے۔

"کیا ہوا؟" وہ چونک کر سیدھا ہوا۔

"اف...... پتا نہیں...... اب یہ سامنے کون آ گیا؟"

زین کو کوفت ہوئی جبکہ دارین اس کی بات سن کر فوراً گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ اس نے لائٹس کی روشنی میں لڑکی کو منہ کے بل گرے دیکھا، اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا، دارین نے اس لڑکی کو سیدھا کیا اور اس کی نبض چیک کی اور پھر زین کی طرف دیکھا۔

"گاڑی کا بیک ڈور کھولو جلدی۔" اس نے زین کو اشارہ کیا...... وہ ایک دم سے بدکا۔

"کیا مطلب بھائی؟" زین چونکا۔

"مطلب گاڑی کا دروازہ کھولو یہ لڑکی زندہ ہے، اس کو ہاسپٹل لے کر جانا ہوگا، معمولی سی چوٹ ہے، پریشانی والی کوئی بات نہیں۔" دارین اس کی سانس اچھی طرح سے چیک کر چکا تھا، اس لیے اسے اطمینان ہوا کہ وہ لڑکی زندہ ہے اور خوف سے بے ہوش ہوگئی ہے۔

"لیکن بھائی...... آپ یہ کیا کر رہے ہیں، یہ لڑکی کون ہے اس وقت اس حال میں یہاں کیسے ہے؟ سب یہ سوال کریں گے ہم سے اور پھر سارا الزام ہمارے سر ہوگا، کوئی بھی ڈاکٹر پوچھ گچھ کے بغیر ٹریٹمنٹ نہیں دے گا۔ ہم پھنس جائیں گے۔" زین نے اس کو باز رکھنے کی ایک کوشش کی لیکن دارین بھی عجیب مزاج کا شخص تھا جس بات کی ٹھان لیتا وہ کر کے ہی رہتا اور جس بات پر دھیان نہ دیتا تو اس کو پھر نظر انداز ہی کیے رکھتا تھا۔

"ڈونٹ وری یار...... میرا ایک دوست ڈاکٹر ہے اس کی طرف لے چلتے ہیں۔" وہ جو ٹھان چکا تھا اس کو کرنا ہی تھا اس نے خود اٹھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور اس لڑکی کو بیک سیٹ پر لیٹا دیا پھر اس کی شال بھی اٹھا کر پچھلی سیٹ پر پھینکی، پہلے گاڑی زین ڈرائیو کر رہا تھا لیکن اب وہ خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ وہ دونوں اس وقت آفس سے واپس آرہے تھے، وہ بڑی ریش ڈرائیونگ کر کے زید کے کلینک پر پہنچا اور لڑکی کو اٹھا کر کلینک میں لے گیا تھا۔

کلینک بہت چھوٹا اور مختصر تھا، ایک کمرہ ڈاکٹر کے لیے اور تین کمرے مریضوں کے لیے مخصوص تھے وہ کلینک چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا کیونکہ ڈاکٹر کی رہائش اس کے اوپر والے حصہ میں تھی، دارین جیسے ہی اس لڑکی کو اندر لایا نا چاہتے ہوئے بھی اس کی نظر لڑکی کے سراپے پر گئی تو وہ مبہوت رہ گیا وہ بلا کی خوب صورت تھی لیکن اس وقت اس کی حالت ابتر تھی نہ اس کے سر پر چادر تھی اور نہ پاؤں میں چپل...... ڈاکٹر زید نے اس کا تسلی سے چیک اپ کیا اور پھر اس کے سر پر بینڈیج کی، خون بہہ جانے کی وجہ سے اس کو کافی کمزوری ہوگئی تھی جس کے لیے ڈرپ لگا دی گئی تھی، اس کے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔

"کتنی دیر لگے گی زید؟" دارین نے ڈرپ کا ٹائم ختم ہونے کا پوچھا۔

"تقریباً دو گھنٹے لگ جائیں گے۔" ڈاکٹر نے ڈرپ کی طرف دیکھ کر بتایا، اب رات کے ساڑھے بارہ ہو رہے تھے یعنی اگر وہ انتظار کرتے تو تین ساڑھے تین بج جانے تھے زین کو کوفت ہونے لگی تھی۔

"زین تم گھر جاؤ۔" اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

"گھر؟" زین کو حیرت ہوئی۔ "مطلب آپ ادھر رکیں گے بھائی؟"

"ہاں میں اس لڑکی کو اپنی ذمہ داری پر یہاں لایا ہوں اب ایسے اکیلے نہیں چھوڑ سکتا۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے...... میں بھی ادھر ہی رک جاتا ہوں آپ کے ساتھ ہی۔" وہ بولا، اس کو دارین پر حیرت ہو رہی تھی۔

"دیکھو زین...... رات بہت ہوگئی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تم یہاں رکو، اس لیے چلو میں تمہیں گھر چھوڑ آتا ہوں۔" دارین نے بہت پیار سے اس کو سمجھایا اور اب کی بار وہ اس کی بات مان گیا۔

"اور آپ کے بارے میں کیا کہوں؟" اس نے چلتے ہوئے پوچھا۔

"کہہ دینا وہ دوست کے ساتھ ہیں۔" وہ اس کو لے کر کلینک سے باہر آیا اور پھر اسے گھر کے باہر چھوڑ کر واپس کلینک پر آ گیا تھا۔

وہ لڑکی فجر کے وقت ہوش میں آئی تھی اور خود کو انجان جگہ پر اور پاس ہی کرسی پر انجان شخص کو بیٹھے دیکھ کر متوحش سی ہوگئی تھی۔

"ریلیکس...... ریلیکس...... کچھ نہیں ہوا آپ کو، گھبرانے کی ضرورت نہیں اور آپ یہاں بالکل محفوظ ہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا آپ کو۔" دارین نے اپنے تئیں اس کو مطمئن کیا۔

"آپ کون ہیں؟" وہ مشکوک اور سہمی ہوئی نظروں سے اس کو دیکھ رہی تھی۔

"میں وہ ہی ہوں جس کی گاڑی سے رات آپ ٹکرائی تھیں۔" دارین نے سنجیدگی سے کہا۔

"گاڑی سے؟" اس نے حیرت سے دہرایا۔ اس کو اپنے ذہن پر زیادہ زور ڈالنا پڑا اور کل دوپہر سے لے کر رات تک کا سارا واقعہ اس کے ذہن میں روشن ہوگیا تھا، اس کے چہرے کا رنگ خوف اور وحشت سے فق ہوگیا تھا، دارین اس لڑکی کے چہرے کے تاثرات کو بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ عجیب وحشت اور خوف کا شکار تھی، گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ اس کے ہر انداز سے عیاں ہورہی تھی، لیکن دارین کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ معاملہ کیا ہے؟

"مطلب رات گزر گئی؟" وہ آہستہ سے بولی۔

"جی ہاں اور رات یہاں کلینک پر گزری ہے آپ پریشان نہ ہوں۔" دارین نے اس کو تسلی دی۔ تب تک ڈاکٹر زید بھی آگئے تھے، وہ فجر کی نماز پڑھ کر آئے تھے، ڈاکٹر نے لڑکی کا تفصیلی چیک اپ کیا اور پھر اس کو ڈسچارج کردیا تھا۔

"اب آپ ان کو لے جاسکتے ہیں۔" ڈاکٹر کی اجازت پر دارین چونکا۔

"لے کر جاسکتے ہیں مگر کہاں؟" وہ سوچ کر رہ گیا۔

"صبح پانچ بجے کا وقت اور اس نازک وقت میں وہ اس کو کہاں لے کر جاتا؟" ڈاکٹر زید کہہ کر چلے گئے تھے مگر وہ وہیں کا وہیں بیٹھا رہ گیا تھا۔

"یہ میڈیسن ہیں دو دن تک استعمال کرنی ہیں۔" نرس آ کر دوائیاں تھما گئی، اب تو وہاں بیٹھنے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔ دارین کھڑا ہوا۔

"آیئے میرے ساتھ۔" اس نے لڑکی کو اشارہ کیا۔

"کک...... کہاں؟" وہ گھبرائی۔ وہ اب چاہ کر بھی کسی مرد پر اعتبار نہیں کرسکتی تھی۔

"میرے ساتھ۔"

"آپ کہاں لے کر جائیں گے مجھے؟"

"یہ تو ابھی مجھے بھی نہیں پتا۔" اس نے لاعلمی سے کندھے اچکائے۔

"مم...... میں نہیں جاؤں گی۔"

"اگر نہیں جائیں گی تو لوگ شک کریں گے، ڈاکٹر اور نرسیں مشکوک ہوجائیں گی۔" دارین نے اسے حقیقت سے آگاہ کیا۔ اس نے دارین کی طرف دیکھا وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا، وہ تو پہلے ہی گھر سے بھاگی ہوئی تھی، اب اگر وہ یہاں سے نہ جاتی تو اور مشکوک ہوجاتی اور پھر یہ لوگ اس کو پولیس کے حوالے کردیتے، سو نا چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے ساتھ باہر آ گئی تھی، دارین نے اس کے لیے فرنٹ ڈور کھولا تو وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ دارین نے دروازہ بند کیا اور دوسری طرف سے آ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

"آپ کا نام؟" گاڑی روڈ پر لاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"انابیہ احمد۔"

"تو مس انابیہ احمد کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ آپ کہاں جانا پسند کریں گی، آپ کا گھر یا کوئی رشتہ دار؟" وہ گاڑی آہستہ ڈرائیو کررہا تھا، اس کے سوال پر یک دم وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رودی۔

"میں نے آپ سے آپ کے گھر کا پتا پوچھا ہے، آنسوؤں کا نہیں۔" دارین کو کوفت ہوئی۔

"میرا کوئی گھر نہیں، میرے ماں باپ مر چکے ہیں، میں لاوارث ہوں۔" اس نے ایسے ہی روتے ہوئے بتایا۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئی، دارین کے ماتھے پر سلوٹیں

پڑ گئیں۔

”تو پھر آپ کہاں جائیں گی؟“

”کہیں بھی چلی جاؤں گی، آپ بس مجھے یہیں اتار دیں۔ قبرستان جانے سے تو مجھے کوئی نہیں روک سکتا ناں؟“ وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

”یہ کیسے ہوسکتا ہے...... آپ کا کوئی نہ کوئی گھر تو ہوگا ہی. اتنے دنوں سے آپ کہاں رہ رہی تھیں؟“ اس نے تعجب سے پوچھا۔

”میں جس گھر میں اتنے دنوں سے رہ رہی تھی...... اس گھر میں اب میری عزت اور جان دونوں محفوظ نہیں، اس لیے میں نے وہ گھر چھوڑ دیا۔“ اس نے خود پر ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔

”چھوڑ دیا مطلب؟ آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی، آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟ رات کو جس حال میں آپ گاڑی سے ٹکرائی تھیں اس کو دیکھ کر نہیں لگتا کہ آپ نے سوچ سمجھ کر گھر چھوڑا ہے بلکہ آپ کے حلیے سے ایسے لگ رہا تھا کہ آپ ایمر جنسی میں گھر سے نکلی ہیں۔ نہ تو آپ کے سر پر چادر تھی اور نہ ہی پاؤں میں چپل۔“ اس نے انابیہ کے پیروں کی طرف دیکھ کر کہا۔ انابیہ نے جلدی سے اپنے پاؤں پیچھے کھینچ لیے لیکن ایسا کر کے وہ حقیقت نہیں چھپا سکتی تھی۔

”میں اپنے گھر سے بھاگ کر آئی ہوں لیکن ایسے نہیں بھاگی جیسے آپ سمجھ رہے ہیں، میں اپنی جان اور عزت بچانے کے لیے گھر سے بھاگی تھی، اگر میں نہ بھاگتی تو میرے. بہنوئی نے میری عزت پامال کر کے مجھے جیتے جی مار دینا تھا۔“ اس نے سب کہہ دیا، وہ کب تک جھوٹ بولتی، وہ بھی اس شخص سے جو اس کی مدد کر رہا تھا۔

”اوہ گاڈ...... تو پھر اب آپ کہاں جائیں گی؟“

”پتا نہیں؟“ وہ ایک بار پھر رونے لگی اور غالباً دارین کو اس کے رونے پر ترس آیا تھا اس لیے اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور گاڑی کا رخ گھر کی جانب کر دیا تھا۔

***

”مامی؟“

”ہوں بولو۔“ وہ بڑے آرام سے بیڈ پر بیٹھی ناشتہ کر رہی تھیں۔ جب بیا ان کے کمرے میں داخل ہوئی، رائمہ یونیورسٹی گئی ہوئی تھی۔

”وہ مم...... میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں، ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ دو تین دن سے اس کو بخار تھا لیکن وہ لاپروائی برت رہی تھی۔ آج تو اس میں بالکل ہی ہمت ختم ہوگئی تھی اور کمزوری اور نقاہت محسوس ہو رہی تھی، اس لیے مجبوراً وہ عابدہ مامی کے پاس آئی تھی۔

”تو چلی جاؤ میں نے کون سا روکا ہے۔“ انہوں نے بے پروائی سے کندھے اچکا کر کہا اور ناشتہ کرنے لگیں۔

”اکیلی؟“ اس نے روہانسی انداز میں کہا۔

”تو پھر کس کے ساتھ جانا ہے؟“ انہوں نے ناشتہ چھوڑ کر ابرو اچکا کر اس کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

”اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو......“ اس نے ڈرتے ہوئے کہا۔

”نہ بی بی میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے، جو میں تمہارے ساتھ رکشوں کے دھکے کھاتی پھروں۔“ انہوں نے رکھائی سے کہا اور پھر سے ناشتہ کرنے میں مصروف ہوگئیں۔ وہ خاموشی سے ان کی طرف دیکھ کر سر جھکا گئی۔

”اب یہاں کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو...... جاؤ یہاں سے، سارا موڈ خراب کر دیا۔“ وہ غصہ سے بولیں۔

”وہ مم...... مجھے کچھ پیسے چاہیے تھے دوائی اور رکشے کے کرائے کے لیے۔“ عابدہ مامی سے پیسے مانگتے ہوئے اس کو اتنی سردی میں بھی ماتھے پر شرمندگی سے پسینا آ گیا تھا لیکن ان سے مانگنا بھی اس کی مجبوری تھی کیونکہ اس کے پاس اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔

”صبح دیے تو تھے پیسے کہاں گئے وہ؟“ وہ ماتھے پر بل ڈال کر کرختگی سے بولیں۔ اس نے سر اٹھا کر عابدہ مامی کے بگڑے تیور دیکھے اور پھر جلدی سے سر جھکا کر آہستہ سے بولی۔

"وہ تو سودا سلف کے لیے تھے، سب خرچ ہو گئے۔ کل نائمہ آپی نے جو آنا ہے۔"

"ہمم...... جب تجھے پتا ہے کہ سارے پیسے خرچ ہو گئے ہیں پھر بھی منہ اٹھا کر مانگنے آ گئی، تمہارے ماموں کی کوئی فیکٹریاں نہیں چل رہیں اور نہ ہی ان کی حرام کی کمائی ہے جو میں تم پر ایسے لٹاتی رہوں، تم خود بھی کچھ شرم کر لیا کرو۔" انہوں نے اس کو کھری کھری سنا کر اچھا خاصا شرمندہ کر دیا تھا، ان کو کچھ کہنے کی اس میں ہمت ہی نہ ہوئی۔

"بیا...... بیا بیٹا...... کہاں ہو؟" باہر سے زرینہ خالہ کی آواز آئی تو وہ اپنے بے جان ہوتے قدموں کو گھسیٹتی ہوئی ان کے کمرے سے باہر نکل آئی اور جلدی سے اپنی آنکھیں صاف کر کے باہر صحن میں آئی۔

"ارے خالہ آپ یہاں؟" اس نے نم آلود آواز میں آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا...... تم سے کچھ کام تھا تو خود ہی آ گئی اور یہ تمہاری آواز کو کیا ہوا؟" انہوں نے جواب دے کر اگلا سوال کیا۔

"وہ...... کک...... کچھ بھی......"

"ارے پاگل لڑکی تمہیں تو اتنا تیز بخار ہے...... کب سے ہے بخار بتاؤ؟" ابھی اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ انہوں نے اس کے بخار سے سرخ ہوتے چہرے کو ہاتھ لگایا اور تپتے چہرے کو دیکھ کر پریشانی سے بولیں۔

"تین دن سے۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"تو تم نے میڈیسن کیوں نہیں لیں؟"

"وہ خالہ...... مم میرے پاس پپ...... پیسے......" وہ کہتے ہوئے رک گئی۔

"اوہ...... تم یہیں رکو میں ابھی آئی۔" وہ اس کی امی کی بہت اچھی دوست تھیں، ساتھ والے گھر میں ہی رہتی تھیں، اس کے حالات جانتی تھیں اس لیے اس کی مدد کرتی رہتی تھیں کچھ دیر بعد وہ واپس آئیں۔

"یہ لو پیسے...... میں نے بچا کر رکھے ہوئے تھے کہ کبھی ضرورت کے وقت کام آئیں گے اور اب دیکھا آ گئے کام۔" انہوں نے پیسے بیا کے ہاتھ پر رکھے، وہ مزید شرمندہ ہوئی، ہر بار ہی وہ ایسے ہی اس کی مدد کرتی تھیں۔

"بہت شکریہ خالہ۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔

"ارے روتے نہیں اور نہ ہی شکریہ کی کوئی ضرورت ہے میں نے کوئی احسان نہیں کیا تم پر...... تم میری بھی بیٹی ہو۔" انہوں نے پیار سے اس کو ڈپٹا۔

"اب جاؤ جلدی سے دوائی لو۔"

"لیکن خالہ مم...... میں اکیلی کک...... کیسے جاؤں؟ مم...... مجھے تو کچھ پتا بھی نہیں۔" وہ بہت جلد گھبرا جاتی تھی۔

"تم گھبراؤ نہیں میں تمہیں رکشے پر بٹھا دیتی ہوں۔ وہ تمہیں واپس بھی لے آئے گا...... اگر گھر میں بچے ہوتے تو میں خود تمہارے ساتھ چلی جاتی۔" انہوں نے فوراً ہی حل نکالا۔

"ٹھیک ہے پھر میں شال لے لوں۔" وہ کہہ کر اندر کمرے میں آئی اور شال اوڑھ کر باہر آ گئی۔ زرینہ خالہ نے اس کو رکشے پر بیٹھا دیا تھا تقریباً دو گھنٹے بعد وہ دوا لے کر واپس آئی تھی۔

بخار کی وجہ سے اس کو کافی کمزوری ہو گئی تھی، ڈاکٹر نے اس کو دو تین دن آرام کے لیے کہا تھا، اس لیے جب سے وہ ہسپتال سے آئی تھی اپنے کمرے میں تھی اور اب بھی وہ دوا کھا کر لیٹی ہی تھی کہ اچانک ہی کمرے کا دروازہ جھٹکے سے کھلا اور صفدر ماموں غصے سے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے عابدہ مامی اور رائمہ بھی تھیں، اس کو آج صفدر صاحب کے گھر آنے کا بھی پتا نہیں چلا تھا۔

"ارے ماموں جی...... آپ کب آئے؟" اس نے دھیمی آواز میں پوچھا اور جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی، وہ ان کی بہت زیادہ عزت کرتی تھی۔

"میں کب آیا اس بات کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ آج کہاں گئی تھی اور کس کے ساتھ گئی تھی؟" انہوں نے اس کی بات کے جواب میں غصے سے پوچھا وہ ایک دم سے چونکی۔

"وہ مم...... ماموں میں ہسپتال گئی تھی دوا لینے۔" وہ گڑبڑا کر بولی۔

"اکیلی؟" انہوں نے غصہ سے پوچھا۔

"جج...... جی ماموں۔" وہ ڈر گئی۔

"جب تجھے تمہاری مامی نے کہا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ جائیں گی تو تم کچھ دیر رک نہیں سکتی تھی۔ مرنے لگی تھی کیا؟" مسعود علی انتہائی بدماغ اور اکھڑ مزاج انسان تھے، جب وہ بولتے تو پھر ان کی زبان زہر اگلتی تھی اور وہ یہ بھی نہیں دیکھتے تھے کہ سامنے کون ہے، بس جو وہ کہہ دیتے تھے وہی پتھر پر لکیر ہوتی تھی، وہ شروع سے ہی بڑے ضدی اور غصے کے تیز تھے لیکن بیوی کی بات وہ بہت مانتے تھے اور اب بھی ایسے ہی ہوا تھا۔

"مم...... مامی نے کب کہا ساتھ جانے کو؟" وہ ہکا بکا ہی رہ گئی۔

"تو تمہارا کیا خیال ہے وہ اس عمر میں جھوٹ بول رہی ہیں؟" وہ تیز لہجے میں بولے۔

"لل...... لیکن ماموں۔"

"بس خاموش...... آئندہ میں تمہاری کوئی شکایت نہ سنوں۔ بہت تنگ کر رکھا ہے تم نے مجھے۔" اس نے کچھ کہنا چاہا تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو خاموش کروا دیا اور پھر اس کی طرف سرسری سی نظر ڈال کر کمرے سے نکل گئے۔

"اس کا تو اب کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا ہی پڑے گا یہ تو ہاتھوں سے نکلتی جا رہی ہے۔" ان کے پیچھے ہی عابدہ مامی اور رائمہ بھی کمرے سے باہر نکل گئیں، وہ تو بس اس کی بے عزتی اور بے بسی کا تماشا دیکھنے آئی تھیں، اب کمرے میں وہ اکیلی تھی، دکھ سے اس کی آنکھیں بھر آئیں اور آنسو رخسار پر بہنے لگے تھے لیکن اس بار اس نے اپنے آنسو صاف کرنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ ان کو بہنے دیا تھا۔

❁......❁......❁

شام کو نائمہ آپی اور اسرار بھائی آگئے تھے لیکن وہ طبیعت خرابی کا بہانہ بنا کر کمرے سے نہیں نکلی، مغرب کی اذان ہونے ہو رہی تھی اس نے وضو کر کے نماز پڑھی اور رو رو کر دعا مانگ رہی تھی، جب دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی وہ یک دم سے ڈری۔

"کک...... کون؟" خوف سے اس کی آواز لڑکھڑائی، اسے اسرار بھائی کی بے باک اور گندی ہوس بھری نظروں سے خوف آتا تھا، وہ جب بھی آتے ان کی غلاظت بھری نظریں بیا کا ہی طواف کرتی رہتی تھیں، اس لیے تو جب وہ لوگ آتے وہ اپنے کمرے سے باہر ہی نہیں نکلتی تھی۔

"بیا آپی...... کیا ہوا؟" باہر سے رائمہ کی پریشان سی آواز آئی، اس نے جلدی سے دعا مانگ کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور چہرے سے آنسو صاف کرتی ہوئی اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

"آپ کچھ پریشان سی ہیں؟" رائمہ نے اس کی روئی ہوئی آنکھیں دیکھ کر سوال کیا۔

"نن...... نہیں تو، تمہیں کوئی وہم ہوا ہے۔" وہ جلدی سے مسکرا کر بولی۔

"آپ کو نائمہ آپی اور امی بلا رہی ہیں...... وہ بہت غصہ ہیں آپ پر۔" اس نے عابدہ مامی کا پیغام اسے دیا۔

"مم...... میں ابھی آتی ہوں۔" وہ لڑکھڑاتی آواز میں آہستہ سے بولی۔

"جلدی آئیں آپی۔" وہ کہہ کر چلی گئی۔ رائمہ کے جانے کے بعد اس نے شال اچھی طرح سے اپنے گرد لپیٹی اور کمرے سے باہر نکل آئی، اس کا رخ مامی کے کمرے کی طرف تھا، وہ خود کو ان دونوں کی ڈانٹ کھانے کے لیے تیار کر رہی تھی۔

"السلام علیکم۔" اس نے کمرے میں قدم رکھتے ہی سب کو مشترکہ سلام کیا، سامنے ہی صوفے پر اسرار بھائی بیٹھے تھے، اسے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں شیطانی چمکنے لگی تھی۔ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتے معنی خیزی سے مسکرا رہے تھے۔

"آئیے آئیے سالی صاحبہ...... آپ تو ہمیں دیکھ کر کمرے میں ہی چھپ گئیں...... ہم آپ کو کھا تھوڑی

جائیں گے، کچھ دیر ہمارے پاس بھی بیٹھیں۔" ان کی باتیں سن کر رائمہ اور نائمہ نے بھی بیا کی طرف دیکھا، وہ گھبرائی ہوئی تھی اور شال کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا، رائمہ جلدی سے اس کی مدد کو بولی۔

"ایسی بات نہیں ہے اسرار بھائی، ان کی طبیعت ٹھیک نہیں اس لیے وہ اپنے کمرے میں تھیں۔"

"ارے کیا ہوا سالی صاحبہ؟" ان کے لہجے میں بیا کے لیے فکر دیکھ کر نائمہ نے پہلو بدلا اور کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا، عابدہ مامی بھی یہ سب دیکھ کر غصے سے بیا کی طرف پلٹیں۔

"یہاں کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو۔ جاؤ کچن کو دیکھو۔" وہ خود بھی وہاں سے جانا چاہتی تھی، ان کا حکم ملتے ہی وہ وہاں سے تقریباً بھاگتی ہوئی کچن میں آئی جبکہ اسرار کی ہوس بھری نظروں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا، یہ بات رائمہ سے چھپی نہیں رہ سکی تھی، وہ بھی وہاں سے اٹھ آئی تھی۔

صفدر علی اور ذکیہ دو ہی بہن بھائی تھے...... ذکیہ کی شادی احمد علی سے اور صفدر کی شادی عابدہ بیگ سے ہوئی تھی، ذکیہ کی ایک بیٹی تھی انابیہ جبکہ صفدر علی کی دو بیٹیاں تھیں بڑی نائمہ اور چھوٹی رائمہ...... نائمہ کی دو سال پہلے شادی ہو چکی تھی، وہ انابیہ سے بڑی تھی، بالکل اپنی ماں کا پر تو تھی، جبکہ رائمہ بیا سے چار سال چھوٹی تھی وہ یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی، اس کا ایم اے کا آخری سیمسٹر تھا، وہ بہت پیاری اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی، بالکل انابیہ کی کاپی لگتی تھی، چار سال پہلے انابیہ کے والد کی ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں رحلت ہو گئی تھی۔

وہ ان دونوں ماں بیٹی کو روتا چھوڑ کر اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ تب انابیہ ایف اے کے پیپر دے رہی تھی۔ شوہر کے انتقال کے صدمے سے ذکیہ بیمار رہنے لگی تھی۔ بہن کا دکھ اور بیماری دیکھ کر صفدر علی نہ چاہتے ہوئے بھی ان دونوں کو اپنے گھر لے آئے تھے۔ وہ ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت کرتے تھے، کام کی وجہ سے ان کا شہر سے باہر جانا لگا رہتا تھا، گھر ان کا اپنا تھا، تنخواہ بھی اچھی خاصی تھی لیکن مہنگائی کے اس دور میں تنخواہ جتنی بھی ہو پھر بھی کم تھی۔

ان کا گزر بسر اچھا ہی ہو رہا تھا، ان کی بیوی عابدہ بہت تیز طرار خاتون تھیں، وہ ان دونوں ماں بیٹی کے آنے پر خوش نہیں تھیں، پہلے پہل تو اس نے بہت ناک بھوں چڑھائی، ان کو طعنے دیئے، باتیں سنائیں لیکن پھر جب اس کو مفت کی دو نوکرانیاں ملیں تو وہ بھی خاموش ہو گئیں لیکن اپنی تیز زبان کے جوہر دکھانے سے باز نہیں آتی تھیں۔ وہ ماں بیٹی سارا دن گھر کے کام کرتیں لیکن پھر بھی ان کو ڈھیروں باتیں اور طعنے سننے کو ملتے تھے، چھ ماہ پہلے ذکیہ کا بھی انتقال ہو گیا تھا اور وہ مکمل طور پر بے سہارا ہو گئی تھی، اس کو ماں کا جو سہارا تھا وہ بھی ختم ہو گیا تھا اور وہ پوری کی پوری عابدہ کی زہریلی باتوں کے رحم و کرم پر رہ گئی تھی۔

اب سارے گھر کا کام، ہانڈی روٹی، برتن، صفائیاں اس اکیلی کے ذمہ تھا، پہلے تو ذکیہ بی اس کی کچھ نہ کچھ مدد کر دیتی تھیں لیکن اب تو وہ بیچاری بھی اس ظالم سماج اور بے رحم دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔

❀......❀......❀

ڈائننگ ہال میں اس وقت مکمل خاموشی تھی، بس چھری اور کانٹے کی آوازیں گونج رہی تھیں، حالانکہ اس وقت وہاں تین لوگ موجود تھے لیکن تینوں ہی اپنی اپنی جگہ خاموش تھے، چوبیس گھنٹوں میں یہی ایک وقت تھا جب اس عظیم و شان عمارت جس کے ماتھے پر "شاہ ولا" لکھا تھا کے مکینوں کو مل بیٹھنے کا موقع ملتا تھا لیکن اس وقت میں بھی وہ صرف اور صرف ضروری باتیں ہی کرتے تھے، دارین کو یہ "شاہ ولا" کم اور ضرورت ولا زیادہ لگتا تھا، کبھی کبھی اس کا دل کرتا کہ وہ اس کا نام بھی ضرورت ولا ہی رکھ دے لیکن پھر اس گھر کے مکینوں پر رشک کون کرتا جو کہ دولت، شہرت اور عزت کے لیے جانے جاتے تھے، لیکن پیار اور جذبات کے معاملے میں وہ کسی برتن کی طرح خالی تھے۔ دراصل اس محل میں رہنے والے لوگوں کے رشتے کی بنیاد بھی

ضرورت پر رکھی گئی تھی، حیدر علی شاہ اور شاہانہ کی شادی ان کے والدین نے اپنے بزنس کی ساکھ کو مضبوط رکھنے کے لیے کی تھی یہ جانے بغیر کہ ان دونوں کے خیالات اور مزاجوں میں زمین اور آسمان کا فرق ہے اور وہ دونوں ہی خودسر اور ضدی تھے، وہ دونوں ہی بزنس ففٹی ففٹی پرسنٹ کے مالک تھے اگر حیدر علی طلاق دیتے تو وہ اس سے محروم ہوجاتے اور اگر شاہانہ خود طلاق مانگتی تو وہ بھی اس دولت سے محروم ہوجاتی، اس لیے وہ اس رشتے کو نا چاہتے ہوئے بھی نبھانے پر مجبور تھے۔

یہ ان کے والدین کی چالاکی تھی یا ان دونوں کی بدنصیبی لیکن پھر بھی وہ دونوں ساتھ رہنے پر مجبور تھے اور اس طرح جو گھر وجود میں آیا وہ پیار و جذبات سے خالی اور بکھرا ہوا تھا۔ دارین کی پیدائش نے بھی ان پر کچھ اثر نہیں کیا، اس کا سارا بچپن ہی ماں باپ کی محبت پانے کو ترستے ہوئے گزرا لیکن صرف بچپن بعد میں دارین حیدر بھی ماں باپ کے اطوار میں رنگ گیا تھا، وہ بھی بے حس اور کٹھور بن گیا تھا، اب اس کے لیے بھی دولت، شہرت روپیہ پیسہ ہر چیز سے بڑھ کر تھا لیکن پھر بھی بہت سی جگہوں پر اس کی انسانیت جاگ ہی جاتی تھی اور اس کے اندر بھی زندہ انسانوں والے احساسات وجذبات آ ہی جاتے تھے۔

اس نے اپنے باپ کے ساتھ بزنس کرنے کی بجائے الگ سے اپنا بزنس شروع کیا تھا اور دن رات کی محنت و لگن سے وہ ایک کامیاب بزنس مین بننے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اس کی شاندار شخصیت اور غیر معمولی صلاحیتوں نے اس کو بہت سے نوجوانوں کا آئیڈل اور بہت سی لڑکیوں کی دلوں کی دھڑکن بنادیا تھا۔ وہ بھی ان سب دلوں سے کھیلنا اپنا حق سمجھتا تھا لیکن صرف وقتی طور پر، مستقل بنیاد پر کسی کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا شاید اس لیے کہ کہیں اس کی ٹوٹی بکھری شخصیت سے ایک اور ٹوٹا بکھرا گھر جنم نہ لے لیکن پھر بھی اس کے دل کے کسی کونے میں ایک آسودہ سی خواہش جنم لیتی تھی کہ اس کا بھی ایک خوب صورت سا گھر ہو جہاں اس کا خیال رکھنے والی اور اس سے محبت کرنے والی بیوی ہو لیکن وہ بس ایسا سوچ کر ہی رہ جاتا تھا، اس کی اٹھائیسویں سالگرہ پر مسز شاہ نے بھی اپنی تمام تر شخصی آزادی کو ایک طرف رکھ کر شادی کے بارے میں کہا تو اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ در آئی تھی، وہ بس سوچ کر رہ گیا کہ اس کو لفظ شادی سے متنفر کرنے والی اور عورت ذات سے بے اعتبار کرنے والی وہی تو تھیں جو کہ اس کی ماں ہونے کا درجہ رکھتی تھیں۔

وہ اپنی اولاد کے سامنے اپنی بربادیوں کی دہائیاں اور اپنے شریک سفر کی ذات کی دھجیاں نہیں بکھیرنا چاہتا تھا، جس طرح اس کے والدین کرتے تھے۔ ایک زین ہی تھا جو اس کو بہت اچھی طرح جانتا اور سمجھتا تھا، وہ ایک لاوارث بچہ تھا جس کو دارین نے اپنا بھائی بنایا ہوا تھا وہ اس سے پانچ سال چھوٹا تھا لیکن ان دونوں میں بنتی بہت زیادہ تھی، ان دونوں کی جان تھی ایک دوسرے میں، وہ بھی اسی شاہ ولا میں رہتا تھا۔

اب بھی شاہانہ بیگم، حیدر علی شاہ اور زین تینوں ڈائننگ ہال میں بیٹھے تھے لیکن دارین کا کچھ اتا پتا نہیں تھا، حیدر علی نے ایک نظر میز کی خاموش فضا پر ڈالی اور لب بھینچ لیے، تب ہی ان کی نظر تیزی سے سیڑھیاں اترتے دارین پر پڑی۔

''دارین؟'' وہ جو نک سک سے تیار ایک ہاتھ میں آفس بیگ تھامے، دوسرے ہاتھ سے سیل فون کان سے لگائے کسی سے بات کرتا بڑی عجلت میں سیڑھیاں اتر رہا تھا، اس کے کانوں سے حیدر علی شاہ کی رعب دار آواز ٹکرائی، تیزی سے اٹھتے اس کے قدم رکے، وہ کال ڈسکنکٹ کرکے ان کی طرف متوجہ ہوا۔

''جی پاپا...... کچھ کام تھا آپ کو؟''

''نہیں...... اتنی جلدی میں کہاں جارہے ہو؟'' انہوں نے خود ہی سوال کیا۔ دو تین دنوں سے ان کا دارین سے سامنا نہیں ہوا تھا اور آج ہوا بھی تو وہ کافی عجلت میں تھا۔

''آفس۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''چلو ناشتہ کرلو ہمارے ساتھ پھر چلے جانا۔'' انہوں

نے نرمی سے کہا۔

''ہمم......او کے۔'' اس نے بھی کسی قسم کی بحث کیے بغیر بیگ میز پر رکھا اور خود زین کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''بھائی پھر آج کا کیا پلان ہے؟''

''فی الحال تو کچھ نہیں تم یونیورسٹی جاؤ...... وہاں سے فری ہو کر آفس آجانا جو بھی پلان ہوا وہاں ڈسکس کرلیں گے، ابھی میں بھی کافی جلدی میں ہوں۔'' وہ جلدی جلدی ناشتہ کرنے کے ساتھ ساتھ زین سے باتیں بھی کررہا تھا، شاہانہ بیگم اور حیدر شاہ خاموشی سے ان دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''کیا چل رہا ہے آج کل، بہت بزی ہو، دو تین دن سے نظر ہی نہیں آئے؟'' حیدر شاہ نے مداخلت کرکے اس کی مصروفیت کا پوچھا۔

''کام، کام اینڈ کام...... یو نو پاپا دارین حیدر کی لائف میں صرف کام ہی ہے اور کچھ بھی نہیں۔'' اس نے ازلی سنجیدگی سے جواب دیا۔ وہ آج کل ایک اہم پراجیکٹ پر کام کررہا تھا اس لیے کچھ زیادہ ہی مصروف تھا۔

''اپنے پاپا کو بھی کچھ عقل دے دو تا کہ وہ بھی ادھر ادھر خواتین سے دوستی کرنے کے بجائے اپنے کام پر توجہ دیں۔'' کب سے خاموش بیٹھی شاہانہ بیگم نے حیدر شاہ کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے اس سے کہا، ان کی بات پر دارین اور زین نے تو نارمل انداز میں ان کی طرف دیکھا کیونکہ یہ ان کا روز کا معمول تھا جبکہ حیدر شاہ کا پارہ چڑھ گیا تھا۔

''شٹ اپ...... تم اپنی بے ہودہ بکواس بند کرو۔'' وہ ایک دم دھاڑے۔

''یہ بکواس نہیں بلکہ سچ ہے...... جو کچھ آپ کرتے پھر رہے ہیں وہ میں تو کیا پورا شہر جانتا ہے۔'' وہ بھی ان کے انداز میں ہی غصے سے بولیں۔

''تو بھاڑ میں جائیں سب، مجھے کسی کی بھی پروا نہیں۔'' انہوں نے شدید طیش میں آتے ہوئے کہا، وہ دونوں اس وقت جوان اولاد کے سامنے بچوں کی طرح لڑ رہے تھے ملازمین کی پروا کیے بغیر...... یہ ان کا روز کا معمول تھا اب تو ان سب کو بھی عادت ہوگئی تھی۔

''ہاں صحیح کہا۔'' وہ طنزاً بولیں۔

''کچھ شرم وحیا کیا کریں، جوان اولاد ہے آپ کی۔'' وہ اپنی نفاست اور سارا سلیقہ ایک طرف رکھے بدزبان اور جاہل عورتوں کی طرح بولیں۔

''تم انتہائی جاہل، بدتمیز اور زبان دراز عورت ہو اور تمہاری یہی عادتیں مجھے باہر جانے پر مجبور کرتی ہیں...... سمجھی تم۔'' وہ بھی سب کچھ بالائے طاق رکھ کر چیخے جبکہ دارین اور زین خاموشی سے ناشتہ کررہے تھے۔

''اور آپ بھی انتہائی ضدی، خودسر اور آوارہ قسم کے انسان ہیں، جو گھر چھوڑ کر باہر......'' اتنا کہہ کر وہ رکیں۔ وہ بھی کہاں پیچھے ہٹنے والی تھیں، ان کو لڑتے دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ اعلیٰ خاندان کے پڑھے لکھے لوگ ہیں۔

''شٹ اپ۔'' وہ دھاڑے۔

''او کے پاپا...... مجھے آفس سے دیر ہورہی ہے، میں چلتا ہوں آپ چلیں گے یا نہیں؟'' دارین نارمل انداز میں نیپکن سے ہاتھ صاف کرکے اٹھ کھڑا ہوا۔

''زین تم چل رہے ہو میرے ساتھ یا بعد میں آؤ گے؟'' وہ زین کی طرف مڑا اور اس کے جواب دینے سے پہلے ہی لمبے لمبے ڈگ بھرتا لاؤنج میں چلا آیا تھا۔

''ہم بھی تمہارے ساتھ ہی چلتے ہیں۔ اس بے وقوف اور جاہل عورت کے ہوتے ہوئے بھلا کوئی سکون سے ناشتہ کرسکتا ہے؟ صبح صبح ہی موڈ خراب کردیا۔'' وہ بھی غصے سے کہتے وہاں سے اٹھ گئے تھے۔

❁ ❁ ❁

''صفدر صاحب...... کیا ہوا؟ آپ کافی پریشان سے لگ رہے ہیں۔ خیر تو ہے ناں؟'' صفدر علی اپنے کمرے میں بہت بے چینی سے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ پریشانی ان کے چہرے پر واضح تھی جو کہ عابدہ نے کمرے میں

داخل ہوتے ہی دیکھ لی تھی۔

"ہوں...... ہاں، وہ بات ہی کچھ ایسی ہے۔" وہ چونک کر پیشانی کو مسلتے ہوئے بولے۔

"اللہ خیر...... ہوا کیا ہے کچھ بتائیں تو سہی، پہلیاں کیوں بجھوار ہے ہیں؟" ان کا ہاتھ بھی پریشانی سے کلیجے پر جا پڑا تھا۔

"وہ دراصل بات یہ ہے کہ کمپنی والے مجھے کچھ مہینوں کے لیے دوسرے شہر بھیجنا چاہ رہے ہیں۔" انہوں نے عابدہ کو اپنی پریشانی کی وجہ بتائی۔ جس کو سن کر وہ بھی تھوڑی سی فکر مند ہوئیں۔

"لیکن کیوں...... کس لیے؟ کام تو یہاں بھی ہو رہا ہے۔"

"پتا نہیں مجھے۔"

"پھر آپ نے کیا کہا؟" وہ فکر مندی سے بولیں۔

"کچھ نہیں...... جانا تو پڑے گا مجبوری ہے اور پرموشن کے چانسز بھی کافی ہیں۔" انہوں نے تفصیل سے بتایا تو ان کے چہرے پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"تو صفدر صاحب آپ بے فکر ہو کر جائیں...... گھر کی فکر نہ کریں میں ہوں ناں۔"

"ہمم...... باقی باتیں کل کریں گے، ابھی مجھے نیند آرہی ہے۔" انہوں نے آہستہ سے کہا اور پھر خاموشی سے بیڈ پر لیٹ کر دوسری طرف کروٹ بدل لی۔

"صفدر صاحب...... بات سنیں۔" کچھ یاد آنے پر عابدہ نے انہیں پکارا۔

"ہاں اب کیا ہوگیا؟" انہوں نے بیزاری سے پوچھا۔ ان کا موڈ کافی خراب تھا کیونکہ وہ گھر کو ایسے چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے۔

"وہ آج نائمہ آئی تھی...... اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی تو وہ بیا کو اپنے گھر لے جانا چاہتی ہے کچھ دنوں کے لیے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو عابدہ؟ ایسے کیسے جوان لڑکی کو میں ان کے گھر بھیج دوں۔" وہ ان کی بات سن کر کرنٹ کھا کر اٹھ بیٹھے۔

"ارے صفدر صاحب وہ غیروں کا گھر تھوڑی ہے ہماری بیٹی کا گھر ہے اور دو سال بعد وہ ماں بننے والی ہے اگر کام کرتے ہوئے کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو......" انہوں نے صفدر صاحب کو دھیمی آواز میں بڑے رسانیت سے سمجھایا، وہ بھی اس کی باتیں سن کر سوچ میں پڑ گئے۔

"کیا ہوا...... اب کس سوچ میں پڑ گئے آپ؟"

"کک...... کچھ نہیں...... میں سوچ رہا ہوں بے شک وہ ہماری بیٹی کا گھر ہے، زمانہ بہت خراب ہو چکا ہے...... آج کل تو کسی اپنے پر بھی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔" ان کو اگلی فکر نے ستایا۔

"کچھ نہیں ہوگا آپ اللہ پر بھروسا رکھیں۔" وہ ان کو منانے کی کوشش کرنے لگیں۔

"ہوں...... لیکن ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا، ہم کل بات کریں گے اس موضوع پر۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا اور پھر سے لیٹ گئے۔

"لیکن آپ میری پوری بات تو سنیں۔" وہ صفدر علی کو سوتے دیکھ کر جھنجلا کر بولیں۔ انہیں نائمہ کی بہت زیادہ فکر تھی اور وہ ہر حال میں بیا کو وہاں بھیجنا چاہتی تھیں۔

"کہا ناں لائٹ بند کرو اور سو جاؤ، میرا دماغ خراب مت کرو، پہلے ہی بہت رات ہوگئی ہے، کل بات کریں گے۔" صفدر صاحب غصے سے بولے اور کمبل منہ تک اوڑھ کر کروٹ بدل گئے۔

"ہاں ہاں میری باتیں تو آپ کا دماغ خراب کرتی ہیں۔" وہ غصے سے کہتی لائٹ بند کر کے بیڈ کی دوسری طرف لیٹ گئی، انہیں اس بات کا یقین تھا کہ صفدر صاحب مان جائیں گے۔

❀ ❀ ❀

وہ اپنے شاندار آفس میں کرسی پر بیٹھا گہری سوچوں میں غرق تھا، تناؤ اس کے چہرے پر واضح تھا، اس کے سامنے لیپ ٹاپ ویسے ہی کھلا رکھا تھا لیکن اس کا ذہن وہاں حاضر نہیں تھا، تب ہی زین جس کا آج یونیورسٹی سے

آف تھا دستک دے کر اندر آیا اور اس کو سوچوں میں دیکھ پریشان سا ہوا۔

"کیا ہوا بھائی..... آپ کچھ ڈسٹرب سے ہیں؟"

"نن..... نہیں تو۔" وہ یک دم چونکا اور پھر کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"آپ کے چہرے سے صاف لگ رہا ہے کہ آپ ڈسٹرب ہیں۔" وہ کہاں پوری بات جانے بغیر پیچھے ہٹنے والا تھا۔

"چھوٹے تم جانتے تو ہو سب کچھ۔" وہ تھکے تھکے سے لہجے میں بولا۔

"آپ پاپا اور ماما کے روز روز ہونے والے جھگڑوں سے پریشان ہیں۔" وہ بھی سمجھ گیا تھا۔

"میں کسی بھی ایسے انسان کی وجہ سے پریشان نہیں ہوتا جس کو میری تو کیا خود کی اور اپنے سے جڑے کسی بھی رشتے کی پروا نہ ہو، پھر چاہے وہ میرے والدین ہی کیوں نہ ہوں۔" اس نے بہ مشکل خود پر ضبط کر کے بڑی سختی سے کہا اور لب بھینچ لیے۔

"لیکن بھائی۔" وہ بخوبی سمجھتا تھا کہ دارین غلط بیانی کر رہا تھا، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ پاپا اور ماما کے رویے کی وجہ سے ہر بار وہ پریشان ہوتا تھا۔

"تم لیکن ویکن کو چھوڑو اور میری بات غور سے سنو، آج میری غازی اینڈ کمپنی کے ساتھ میٹنگ تھی، میں نہیں جانا چاہتا۔ اب وہ میٹنگ تم اٹینڈ کرنے جاؤ گے۔" اس نے سنجیدگی سے بات پوری کر کے زین کی طرف دیکھا جو حیرانی سے منہ کھولے بیٹھا تھا۔

"ایسے منہ کھول کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں، گھر جا کر تیاری کرو یہ کنٹریکٹ ہر حال میں ہمیں ملنا چاہیے۔" وہ سنجیدگی سے بات کر رہا تھا، زین کے انکار کا تو اب کوئی جواز ہی نہیں بنتا تھا، وہ ایم بی اے فائنل کا اسٹوڈنٹ تھا، فارغ وقت میں دارین اس کو بھی آفس بلا لیتا تھا، وہ اسے بھی اپنی طرح مضبوط بنانا چاہتا تھا۔ وہ بھی دارین کے ہر کام میں اس کے ساتھ ساتھ ہی رہتا تھا، آج پہلی بار وہ اکیلے ہی میٹنگ اٹینڈ کرنے والا تھا اس لیے تھوڑا سا ہچکچا رہا تھا۔

"بھائی میں اکیلے کیسے؟" وہ تھوڑا پریشان ہوا۔

"دیکھو زین..... اگر تم کامیاب انسان بن کر خود کو کسی اعلیٰ مقام پر دیکھنا چاہتے ہو تو اپنے اندر سے یہ ڈر اور خوف نکال دو، دل میں عزم اور کچھ کر دکھانے کا جذبہ لے کر آگے بڑھو، بھول جاؤ لوگوں کو اور ان کی باتوں کو بس اس بات پر دھیان دو کہ تمہیں کچھ کر کے دکھانا ہے پھر دیکھنا ایک دن بہت کامیاب انسان بن جاؤ گے۔" وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر زین کے پاس آیا اور اس کے کندھے کو تھپک کر اس کو رسان سے سمجھانے لگا جبکہ وہ بھی بڑے غور سے اس کی بات سن رہا تھا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی، ان شاء اللہ اب ایسا ہی ہوگا میں پوری کوشش کروں گا۔" دارین کی باتوں سے اس کی ڈھارس بندھی۔

"ویری گڈ..... یہ ہوئی ناں بات۔" وہ بھی دھیرے سے مسکرایا۔

"اوکے بھائی اب میں چلتا ہوں..... پلیز آپ پریشان نہ ہوا کریں سب ٹھیک ہو جائے گا ایک دن۔" زین اٹھ کھڑا ہوا۔

"شاید..... پانچ بجے تک تیار رہنا، میں تمہیں پک کر لوں گا۔" اس نے تاکید کی۔

زین کمرے سے جا چکا تھا جبکہ وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس آیا اور کھڑکی سے پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے لگا، وہاں ٹریفک کا بہت شور تھا، بالکل ایسے ہی جیسے آج اس کے اندر بھی عجیب سا شور مچا ہوا تھا، جس کو وہ چاہ کر بھی ختم نہیں کر پا رہا تھا، اس کے والدین میں کافی دوریاں تھیں۔ ان دونوں میں زیادہ قصوروار کون تھا وہ یہ تو نہیں جانتا تھا لیکن ان کی ہونے والی لڑائیاں اس کو بہت زیادہ پریشان کر دیتی تھیں، وہ جتنا بھی بے حس اور کھٹور بن کر یہ سب کچھ نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا اتنا زیادہ اسے محسوس ہوتا تھا، وہ اپنی جگہ بہت پریشان تھا اور اس کے والدین اپنی جگہ لیکن

آج تک کسی نے بھی اس معاملہ کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

عابدہ مامی اپنے کمرے میں بیڈ پر نیم دراز بڑے مزے سے کوئی ٹی وی سیریل دیکھ رہی تھیں، جب وہ سست روی سے قدم اٹھاتی ان کے کمرے میں داخل ہوئی، ان سے کچھ بھی مانگتے وقت اس کے دانتوں تلے پسینہ آجاتا تھا لیکن پھر بھی ان سے مانگنا اس کی مجبوری تھی۔

"مامی بات سنیں۔"

"ہاں بولو...... اب کیا آفت آگئی ہے جو تم یوں میرے سر پر چڑھ آئی ہو؟" انہوں نے ٹی وی سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھ کر بیزاری سے کہا۔

"آج زرینہ خالہ کی بیٹی عاشی کی برتھ ڈے ہے۔ انہوں نے مجھے بلایا ہے۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو آپس میں مسلتے ہوئے دھیمی آواز میں بتایا۔

"تو پھر میں کیا کروں؟ مجھے کیوں بتا رہی ہو جاؤ چلی جاؤ۔" اب کے انہوں نے لاپروائی سے کہا اور ٹی وی کی آواز قدرے کم کردی۔

"وہ...... مم...... میں نے اس کے لیے تحفہ بھی لینا ہے...... گک...... کچھ پپ...... پیسے چاہیے تھے۔" اس نے اپنی آنکھوں میں امڈتے آنسوؤں کے سیلاب کو پلکیں جھپک کر اندر اتارتے ہوئے کہا، ایسا کرتے ہوئے وہ بے بسی کی انتہا پر تھی۔

"مجھے پہلے ہی پتا تھا تم پیسے ہی مانگو گی اور تو کوئی کام تجھے آتا نہیں۔" وہ ریموٹ بیڈ پر پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور پھر الماری کھول کر اس میں سے ہزار کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا، ان کا انداز ایسے تھا جیسے وہ کسی مانگنے والی کو بھیک دے رہی ہوں، وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے ان کے اس انداز کو دیکھ رہی تھی لیکن بولنے کی اس میں ہمت ہی نہیں تھی۔

"ہمیشہ ایسے ہی ہاتھ پھیلا کر مانگتی رہنا، کبھی باز نہ آنا تم اپنی اس مانگنے والی عادت سے۔" انہوں نے اس کی اچھی خاصی بے عزتی کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

جس کو سن کر وہ سر تا پاؤں شرمندہ ہوئی اور اس کی پانی سے بھری آنکھیں چھلکنے کو بے تاب ہو رہی تھیں، وہ جلدی سے ان کے کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس ڈر سے کہ کہیں اس کی آنکھیں عابدہ مامی کے سامنے ہی نہ چھلک پڑیں۔ مامی کے کمرے سے نکل اس نے اپنے ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کیے اور اپنے کمرے میں آگئی، ایک ہفتہ ہو گیا تھا روز ہی یہی ہوتا تھا مامی کسی نہ کسی بات کو بہانہ بنا کر اس کو خوب سناتیں اور وہ رونے کے سوا کچھ نہیں کرسکتی تھی، وہ کس سے اپنے دکھ درد بانٹتی بس ایک اللہ ہی تھا جو اس کی سنتا تھا اور وہ بھی اس کے سامنے اپنے سارے دکھ بیان کر کے پرسکون ہو جاتی تھی لیکن پھر اگلے ہی دن ایک نیا درد اس کے سامنے سر اٹھائے کھڑا ہوتا تھا، اب بھی وہ ایسے ہی دکھی سی اپنے کمرے میں بیٹھی تھی جب رائمہ اس کے کمرے میں آئی۔

"آپی کیا ہوا...... رو رہی ہیں آپ؟" وہ اس کی روئی روئی آنکھیں دیکھ کر فکرمندی سے بولی، اس گھر میں ایک وہی تو تھی جو اس کے ساتھ تھوڑا پیار سے بات کرتی تھی، اس کے لیے دل میں ہمدردی رکھتی تھی۔

"جانتی تو ہو تم سب کچھ پھر بھی پوچھ رہی ہو۔" اس نے تلخ لہجے میں کہا جبکہ وہ اس کا شکوہ سن کر شرمندہ ہوئی تھی۔

"ایم سوری آپی۔"

"چھوڑو اس بات کو یہ تو روز کا مسئلہ ہے...... تم بتاؤ تمہیں کوئی کام ہے مجھ سے؟" اس نے جلدی سے اپنے ہاتھوں کی پشت سے چہرے کو صاف کیا۔

"جی وہ مجھے بازار جانا ہے...... مجھے تھوڑا سا کام ہے کیا آپ میرے ساتھ چلیں گی؟" اس نے اپنے آنے کی وجہ بتائی۔

"ہاں...... مجھے بھی عاشی کے لیے گفٹ لینا ہے، آج اس کی برتھ ڈے ہے۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"تو بس پھر ڈن ہو گیا آپ میرے ساتھ بازار چل

رہی ہیں۔ مجھے بھی کچھ نوٹس کاپی کروانے ہیں اور اسائنمنٹ پیپر لینے ہیں، ہم دونوں ہی چلتے ہیں امی نے تو جانا نہیں۔" اس نے بھی اپنی چیزوں کی لسٹ گنوائی۔

"چلو صحیح ہے لیکن پلیز جانے سے پہلے تم مامی سے پوچھ لو۔" اس نے پریشانی سے کہا کیونکہ اگر ان سے نہ پوچھ کے جاتے تو انہوں نے ایک بہت بڑا ہنگامہ کھڑا کر دینا تھا۔

"میں ابھی امی سے پوچھ کر آتی ہوں..... آپ تیار ہو جائیں۔" رائمہ کہہ کر باہر نکل گئی جبکہ وہ پھر سے ویسے ہی بیٹھ گئی، اس نے کون سا زیادہ تیاری کرنا تھی بس شال ہی لینی تھی کچھ دیر بعد رائمہ بھی عابدہ بیگم کو بتا کر آ گئی تھی پھر وہ دونوں ہی قریبی بازار چلی آئی تھیں، رائمہ نے اپنا کام کیا اور اس نے عاشی کے لیے گفٹ لیا، تقریباً دو تین گھنٹے بعد وہ واپس بھی آ گئی تھیں لیکن گھر آتے ہی ایک نئی مصیبت اس کے انتظار میں تھی، اسرار بھائی اور نائمہ آئے ہوئے تھے۔

رائمہ سیدھی عابدہ کے کمرے میں چلی گئی تھی، نا چاہتے ہوئے اس کو بھی اندر جانا پڑا اور ان کو سلام بھی کرنا پڑا تھا، وہاں مامی، نائمہ آپی اور اسرار بھائی تینوں خوش گپیوں میں مصروف تھے، اس کو دیکھتے ہی نائمہ نے حکم جھاڑا۔

"بیا تم چائے بنا کر لاؤ اسرار کے لیے۔"

"جی ٹھیک ہے۔" وہ کہہ کر کھڑی ہوئی۔ آج اس کو نائمہ آپی کا یوں حکم چلانا برا نہیں لگا تھا۔

"ارے کچھ دیر بیٹھنے تو دو سالی صاحبہ کو۔" انہوں نے اس کا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے خبیث مسکراہٹ چہرے پر سجا کے کہا۔

"نن..... نہیں میں ابھی بنا کر لاتی ہوں چائے۔" کمرے سے باہر آ کر اس نے شکر ادا کیا اور گفٹ اپنے کمرے میں رکھ کر کچن میں گئی۔ اس نے چائے بنا کر رائمہ کو دی، اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اب کبھی بھی اسرار کے سامنے نہیں جائے گی۔ ایسے ہی سوچوں میں گم وہ کچن میں کھڑی تھی جب عاشی نے دیوار کے پار سے اس کو آواز لگائی۔

"بیا آپی بیا آپی..... کہاں ہیں آپ؟ اب آ بھی جائیں امی بلا رہی ہیں آپ کو۔" وہ عاشی کی آواز سن کر یک دم چونکی اور کچن سے نکل کر صحن میں آ گئی، جہاں دیوار سے سر نکالے عاشی کے ساتھ زرینہ خالہ بھی اس کو اشارے سے بلا رہی تھیں۔

"ابھی آتی ہوں خالہ..... نائمہ آپی آئی ہوئی ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"جلدی آ جاؤ بیٹا۔" وہ کہہ کر نیچے اتر گئیں جبکہ وہ شش و پنج میں مبتلا ہوئی کہ مامی سے اجازت لینے کے لیے کیسے ان کے کمرے میں جاؤں، وہاں تو اسرار بھائی اپنی ہوس بھری نظریں لیے بیٹھے تھے۔ وہ کچھ دیر تو کھڑی سوچتی رہی پھر اپنے کمرے میں چلی آئی اور حلیہ درست کر کے سادگی کے ساتھ گفٹ اٹھا کر بغیر کسی کو بتائے عاشی کے گھر چلی گئی اور یہی اس سے غلطی ہوگئی تھی۔

❁.....❁.....❁.....❁

جب سے وہ عاشی کی برتھ ڈے سے واپس آئی تھی، تب سے ہی گھر میں خاموشی کا راج تھا، اس بات کو آج دو دن ہو گئے تھے لیکن مامی نے اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا، اس کو تعجب کے ساتھ ساتھ فکر بھی ہو رہی تھی..... دو دن کے بعد صفدر ماموں بھی رات کو واپس آ گئے تھے، ان سب کی خاموشی کسی بہت بڑے طوفان سے پہلے کی خاموشی لگ رہی تھی جو اس کو اندر سے ڈرا رہی تھی، جب بھی مامی کسی کام کے لیے اسے بلاتیں تو اس کا دل ڈر کے مارے اچھل کر حلق میں آ جاتا تھا۔ آئمہ یونیورسٹی گئی ہوئی تھی۔ عابدہ مامی اور صفدر ماموں کچھ دیر پہلے ہی ناشتہ کر کے اپنے کمرے میں گئے تھے، اس نے ایک نظر ان کے کمرے کے بند دروازے پر ڈالی اور پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ اس نے پہلے برتن دھوئے، پھر کچن سمیٹ کر صفائی کی اور آخر میں صحن دھونے کے لیے کچن سے باہر آئی تب ہی مامی نے اسے پکارا۔

"بیااوبیا..... ادھر آ بات سن۔" پائپ لگاتے اس کے ہاتھ یک دم رکے، خوف سے اس کے ماتھے پر اتنی سردی میں بھی پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے، اس کو احساس ہو گیا تھا کہ عابدہ مامی، صفدر ماموں کو سب بتا چکی ہیں، وہ اپنی کانپتی ٹانگوں کو تقریباً گھسیٹتی ہوئی ان کے کمرے کی طرف بڑھی۔

"جی مامی آپ نے مجھے بلایا؟" اس نے دروازے میں ہی کھڑے کانپتی آواز میں پوچھا۔

"میں نے نہیں..... تمہارے ماموں نے بلایا ہے، اندر آؤ اور دروازہ بند کردو۔" انہوں نے اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔ وہ اندر آئی اور ایک نظر صفدر ماموں کے چہرے کی طرف دیکھا جو کڑے تیور کے ساتھ ماتھے پر شکنیں ڈالے پتا نہیں کس سوچ میں گم تھے۔

"آپ نے مجھے بلایا۔"

"تم پرسوں رات عاشی کے گھر کس کی اجازت سے گئی تھی؟" انہوں نے بغیر تمہید باندھے سیدھا سوال کیا، وہ ان کا سوال سن کر اندر سے لرز گئی، جس بات کا دو دن سے اس کو ڈر تھا وہی ہوا۔ ماموں کو یقیناً عابدہ مامی سب کچھ مرچ مصالحہ لگا کر بتا چکی تھیں۔ اس نے ایک نظر مامی کی طرف دیکھا جو ایسے لاپروائی سے بیٹھی تھیں جیسے اس کمرے میں موجود ہی نہ ہوں۔

"میں کچھ پوچھ رہا ہوں تم سے؟" اب کے وہ تھوڑا غصے سے بولے۔

"وہ..... مم..... نے..... کک..... کسی کو نہیں بتایا تھا، وہ..... مم..... مامی کے کمرے میں آپی اور اسرار بھائی بیٹھے تھے..... تت تو....." اس نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"اگر اسرار بیٹھا تھا تو وہ کون سا غیر تھا یا پہلی بار آیا تھا، اگر تم بتا کر چلی جاتی تو۔" وہ بات کرتے ہوئے ایک دم سے غصے میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے، وہ سہم کر دو قدم پیچھے ہوئی، وہ ان کو کیسے بتاتی کہ اسرار کی گندی نظریں اس کو اندر تک چھلنی کرتی تھیں، گھن آتی تھی اس کو اسرار بھائی سے۔

"وہ..... مم..... نے..... سس..... سوچا....."

"بس چپ کر..... ایک لفظ بھی اور مت نکالنا اپنی زبان سے، اتنی بار سمجھا چکے ہیں لیکن پھر بھی تم نہیں سمجھتی، بس اب بہت ہو گیا..... میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔" وہ اس کی بات کو بیچ میں کاٹ کر خفگی سے بولے۔

"کیسا فیصلہ؟ صفدر ماموں کس فیصلے کی بات کر رہے ہیں؟" اس نے دل میں سوچا، سگے ماموں کی بے اعتباری اور بے رخی دیکھ کر اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے، وہ بہ مشکل اپنے آنسو روکتی سر جھکائے کھڑی رہی۔

"کیسا فیصلہ صفدر صاحب؟" کب سے خاموشی سے تماشا دیکھتی عابدہ مامی بھی چونک کر بولیں۔

"بیا کو نائمہ کے گھر بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے میں نے۔" انہوں نے بیا پر گویا بم پھوڑا، ان کی بات سن کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جبکہ عابدہ مامی کی تو گویا دلی مراد بر آئی تھی خوشی سے ان کی باچھیں کھل گئیں، ان کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"سچ میں بھیج دوں بیا کو؟" عابدہ بیگم نے اپنے دل کی تسلی کے لیے دوبارہ پوچھا۔

"ہاں بھیج دو۔" انہوں نے سر جھٹک کر سنجیدگی سے کہا۔

"لل..... لیکن مم..... ماموں میری..... بات تو....."

"اب میں نے تمہاری کوئی بات نہیں سننی، آج کے بعد تم زرینہ اور عاشی سے بھی نہیں ملو گی اور نہ ہی وہ دونوں یہاں آئیں گی ہمارے گھر، ان دونوں نے ہی بگاڑا ہے تمہیں۔" وہ اس کے بولنے سے پہلے ہی غصے سے گرجے۔ پتا نہیں مامی نے انہیں کیا بتایا تھا جو وہ اتنے غصے میں تھے اتنی بڑی تو بات نہیں تھی جتنی اب بن گئی تھی اور جس کی وہ اسے اتنی بڑی سزا دے رہے تھے۔

"چلیں میں اسرار کو فون کرتی ہوں وہ آ کر لے جائے گا۔" عابدہ مامی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے کر دو کال۔" وہ عابدہ مامی سے مخاطب

ہوئے جبکہ بیا ساکت سی کھڑی ان دونوں کو دیکھ رہی تھی، وہ اس کو ایک ایسے شخص کے گھر بھیج رہے تھے جس کے نام سے ہی اس کو کراہیت ہوتی تھی، جس کی شکل سے اس کو گھن آتی تھی جس کو ایک پل بھی وہ اپنے سامنے برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ اس کے گھر میں چند دن گزارنا کتنا کٹھن اور دشوار تھا یہ صرف وہ ہی جانتی تھی۔

"جاؤ اب یہاں کیوں کھڑی ہو اور اپنا بیگ تیار کرو۔" ماموں نے حکم دیا۔

اس گھر کے سب فیصلے ہی صفدر صاحب کرتے تھے، لیکن اس بار ایسا فیصلہ کرنے پر ان کو عابدہ بیگم نے مجبور کیا تھا، یہ سب ان کے دماغ میں بھرا ہوا گند تھا جو انہوں نے مرچ مصالحہ لگا کر صفدر صاحب کو سنایا اور بہانا اس کا عاشی کے گھر جانا بن گیا تھا۔ وہ خود کو گھسیٹتی ہوئی ان کے کمرے سے نکلی، اس کا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا، اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا جو اس کے پورے چہرے کو بھگو رہا تھا۔ اس کی ساری ہمت دم توڑ گئی تھی، وہ کرتی بھی تو کیا، اس کے پاس اور کوئی راستہ بھی تو نہیں بچا تھا، اس وقت اس کو اپنے والدین کی بہت یاد آرہی تھی اگر آج وہ زندہ ہوتے تو وہ یوں بے بس نہ ہوتی اور نہ ہی ماموں اس کی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کرتے۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کو اتنی بڑی سزا ملے گی، اس کے پاس یہی سہارا تھا جو آج اس سے چھن گیا تھا۔

❀ ❀

"رجو..... شنو..... سکینہ بی..... کہاں ہو سب لوگ؟" شاہانہ بیگم اپنے تیکھے لہجے میں ملازموں کو پکارتی ڈائننگ ہال کی طرف آرہی تھیں، وہ اس وقت سیاہ سلیو لیس ساڑی جس کے بارڈر پر سفید نگوں کا دیدہ زیب کام تھا پہنے، کسی کانفرنس میں جانے کے لیے مکمل تیار تھیں۔

"کیا مصیبت آگئی؟ جو یوں صبح صبح ہی پورے گھر کو سر پر اٹھا رکھا ہے؟" لاؤنج میں اخبار کا مطالعہ کرتے حیدر علی شاہ نے ان کی آواز سن کر ایک اچٹتی نگاہ ان پر ڈال کر ناگواری سے پوچھا۔

"آپ تو چپ ہی رہیں۔" شاہانہ بیگم نے برا سا منہ بنایا۔

"جاہل عورت۔" وہ بڑبڑائیں۔

"جی بیگم صاحبہ۔" تب ہی وہ تینوں بھی ان کی آواز سن کر سب کام چھوڑ کر آگے پیچھے دوڑی آئیں۔

"سکینہ بی آج شام کو رمل اور رومانہ آرہی ہیں۔ ان کے لیے نیچے والے دونوں کمرے صاف کروا دینا اور کھانے میں بھی کچھ اہتمام کرلینا رمل اور رومانہ کی پسند کا تو تم لوگوں کو پتا ہی ہوگا؟" انہوں نے شنو، رجو اور سکینہ بی کو آرڈر دیا جبکہ شاہانہ بیگم کی بات سن کر حیدر علی شاہ کا حلق تک کڑوا ہوگیا تھا کیونکہ وہ دونوں ان کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔

"ج..... جی پتا ہے بیگم صاحبہ۔" شنو نظریں جھکائے بولی۔

"یہ تمہاری بہن کو اپنے گھر سکون نہیں آتا؟ جو روز روز منہ اٹھا کر یہاں ٹپک پڑتی ہے؟" وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولے۔

"سکینہ بی..... آپ سب کام اپنی نگرانی میں کروائیں اور رجو تم ناشتہ لگاؤ مجھے جلدی جانا ہے۔" انہوں نے حیدر علی شاہ کی بات کو نظر انداز کر کے سکینہ بی کو ہدایت دی، وہ اس گھر کی پرانی اور قابل اعتماد ملازمہ تھیں، اب وہ خود تو کام نہیں کرتی تھیں لیکن سب ملازموں سے اپنی نگرانی میں سارا کام کرواتی تھیں۔

"جی ٹھیک ہے میں کروادوں گی آپ بے فکر رہیں۔" انہوں نے بھی تابعداری سے کہا اور پھر وہ تینوں وہاں سے چلی گئیں۔

"ہاں تو کیا کہہ رہے تھے آپ اب بولیں؟" اب وہ ان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"میں نے جو کہا ہے اس میں غلط کیا ہے تم بتاؤ؟" وہ چہرے سے اخبار ہٹا کر بولے اور پھر سے مطالعے میں مصروف ہوگئے۔

"آپ کو اور آپ کے بیٹے کو میری بہن اور بھانجی سے

اللہ واسطے کا بیر ہے لیکن ایک بات کان کھول کر سن لیں یہ میرا گھر ہے اور میرے گھر میں جب بھی، جس کا بھی دل چاہیے گا وہ آئے گا، اگر کوئی روک سکتا ہے تو روک کر دکھائے۔" وہ بھی غصے سے تیوری چڑھا کر بولیں۔

"ہمیں کیا پڑی ہے کہ ہم ان کو روکیں، ان کو خود ہی شرم آنی چاہیے روز منہ اٹھا کر آتے ہوئے۔" حیدر علی شاہ نے پرسکون لہجے میں کہا اور اخبار پلیٹ کر ایک طرف رکھ کر میز کی طرف چل دیے کیونکہ ناشتہ لگ چکا تھا۔

"آپ انتہائی......"

"گڈ مارننگ پاپا اینڈ مسز شاہ۔" دارین اور زین جو ڈائننگ ہال کی طرف آرہے تھے وہ حیدر علی شاہ کی آخری بات سن کر ہنس دیے اور پھر مسز شاہ کے بولنے سے پہلے ہی انہوں نے جھٹ سے یک زبان ہو کر گڈ مارننگ کہا۔

"گڈ مارننگ ٹو بیٹا۔" انہوں نے مسکرا کر جواب دیا اور جوس کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگالیا۔ جبکہ مسز شاہ پیچ و تاب کھا کر خاموشی سے بریڈ پر جیم لگانے لگیں، ایک دم سے ڈائننگ ہال میں مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔

"ایک بریکنگ نیوز ہے آپ لوگوں کے لیے۔" انہوں نے طنزیہ انداز میں شاہانہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے زین اور دارین سے کہا۔

"وہ کیا پاپا؟" زین کو تجسس ہوا۔

"تم لوگوں کی آنٹی صاحبہ تشریف لا رہی ہیں۔" انہوں نے ان دونوں کو بھی اطلاع دی۔ ان دونوں ماں بیٹی کا ذکر سن کر دارین کا موڈ بھی خراب ہوا لیکن اس نے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"تو یہ کون سی نئی بات ہے پاپا۔" زین نے لاپروائی سے کہا اور ناشتے میں مصروف ہو گیا جبکہ مسز شاہ اس کے جواب پر کلس کر رہ گئیں لیکن بولی کچھ نہیں۔

"ہاں یہی بات میں نے بھی کہی ہے۔" اب کے انہوں نے بھی سنجیدگی سے کہا۔

"زین تم رومانہ اور رمل کو لینے ایئر پورٹ چلے جانا...... جب وہ آئیں گی تو میں تمہیں کال کر دوں گی۔" شاہانہ بیگم نے ان دونوں کی باتیں نظر انداز کر کے خاموشی سے ناشتہ کرتے زین کو مخاطب کر کے کہا۔

"جی ٹھیک ہے ماما۔" اس نے فرماں برداری سے جواب دیا۔

"اوکے...... اب میں چلتی ہوں مجھے دیر ہو رہی ہے۔" وہ اپنی بات کہہ کر وہاں سے اٹھ گئیں۔ دارین نے تاسف سے ماں کی طرف دیکھا جو رومانہ بیگم اور اس کی بیٹی رمل کے آنے پر اتنی زیادہ خوش ہو رہی تھیں، جیسے کہ وہ پہلی بار آرہی ہوں جبکہ جو لوگ ان کے گھر میں موجود تھے۔ ان کا حال تک پوچھنے کی انہوں نے کبھی زحمت نہیں کی تھی۔

رومانہ بیگم، شاہانہ کی کزن، دوست اور کلاس فیلو تھیں، ان دونوں کا بچپن اور جوانی ایک ساتھ ہی گزرا تھا، شادی کے بعد رومانہ بیگم کراچی چلی گئی تھیں لیکن پھر ایک بیٹی کے بعد ہی ان کی اپنے شوہر سے علیحدگی ہو گئی اور وہ دونوں اپنے گھر میں کم اور شاہانہ بیگم کے ہاں زیادہ رہتی تھیں، ان دونوں نے کراچی میں بیوٹی سیلون اور بوتیک بنایا تھا جو شاہانہ بیگم کے پیسوں سے ہی چل رہا تھا۔ وہ دونوں کچھ ماہ پہلے ہی یہاں سے ہو کر گئی تھیں لیکن اب پھر آرہی تھیں...... ہر بار وہ دونوں کسی نہ کسی مقصد سے آتی تھیں اس بار وہ کیوں اور کتنے دنوں کے لیے آرہی تھیں یہ کوئی نہیں جانتا تھا، دارین کو ان دونوں سے کوفت ہوتی تھی لیکن شاہانہ بیگم تو فدا تھیں ان پر۔ رومانہ بیگم، شاہانہ سے بھی زیادہ ماڈرن اور تقریبات کی دلدادہ تھیں جبکہ ان کی اکلوتی بیٹی رمل اکرم بھی ان سے کچھ کم نہ تھی، شاہانہ بیگم دل و جان سے اسے بہو بھی بنانا چاہتی تھیں لیکن دارین کو وہ ایک آنکھ نہ بھاتی تھی، وہ جب بھی یہاں آتی تھی اس کی نگاہوں کا مرکز دارین حیدر کی ذات ہی ہوتی تھی لیکن وہ اس کو گھاس تک نہیں ڈالتا تھا۔

صبح سے شام ہو گئی تھی۔

لیکن وہ اپنے کمرے میں ویسے ہی فرش پر گھٹنوں میں سر دیے بیڈ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی، رو رو کر اس کی

آنکھیں سوج گئی تھیں لیکن پھر بھی آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے، اس کا ذہن بھی بالکل مفلوج ہو گیا تھا، اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کیا کرے، کیا نہ کرے؟ اس کی ظہر اور عصر کی نماز بھی قضا ہو گئی تھی لیکن وہ ایسے ہی سوچوں میں گم بیٹھی تھی تب ہی اس کے اندر سے آواز آئی۔

"چھوڑ دوان بے حس لوگوں کے پیچھے رونا یہ تیری کوئی بات نہ سنیں گے اور نہ ہی مانیں گے تو بس اللہ سے مانگ وہ سب کی سنتا ہے اور سب کو نوازتا ہے۔" وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئی، آج وہ اپنے رب کو تو بھول ہی گئی تھی، اس نے جلدی سے اپنے ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کیے اور اٹھنے لگی، تب ہی اس کے کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا، رائمہ تیزی سے اندر آئی۔

"بیا آپی......" نائمہ نے بیتابی سے اسے پکارا لیکن وہ کچھ نہیں بولی اور ایک زخمی نظر اس پر ڈال کر سر جھکا گئی۔

"کیا ہوا ہے آپی، آج آپ کمرے سے باہر ہی نہیں آئیں؟" رائمہ نے اس کے بکھرے حلیے کو دیکھ کر سوال کیا۔ وہ پھر بھی کچھ نہیں بولی۔

"کچھ بولیں بھی بیا آپی؟ میں جب بھی آپ سے کچھ پوچھتی ہوں آپ یہی کہتی ہیں کہ کچھ نہیں ہوا لیکن آج میں آپ کی کوئی بات نہیں سنوں گی، آپ کو بولنا پڑے گا......بتائیں پلیز کیا ہوا ہے؟" اس نے بیا کے چہرے کو اپنی طرف موڑا اور اس کی سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر دنگ رہ گئی۔

"کیا بولوں، کیا بتاؤں میں؟ بس یہ میری بدقسمتی ہے اور کچھ نہیں۔" وہ بس اتنا ہی بولی۔

"ہوا کیا ہے آپی کچھ تو بتائیں۔" رائمہ نے پریشانی سے پوچھا۔

"ماموں پر بوجھ بن گئی ہوں میں، اس لیے اب وہ مجھے نائمہ آپی کے گھر بھیج رہے ہیں۔" وہ خلاؤں میں دیکھتے ہوئے تلخی سے نم آلودہ لہجے میں بولی۔

"لیکن وہاں کیوں؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"آپی کی طبیعت نہیں ٹھیک، اس لیے انہوں نے مجھے بلایا ہے لیکن رائمہ میں نہیں جانا چاہتی، وہاں جانے کے لیے میرا دل نہیں مانتا۔"

"تو آپ انکار کر دیں...... یہ آپ کا حق ہے آپی۔" رائمہ نے اس کو سمجھانا چاہا، وہ خود بھی پریشان ہو گئی تھی کیونکہ اسرار بھائی اسے بھی کچھ خاص پسند نہیں تھے اور وہ ان کی حرکتیں بھی دیکھ چکی تھی۔

"ہونہہ......انکار کس سے کروں، ماموں سے یا پھر مامی سے، کون مانے گا میری بات، بتاؤ؟ اگر میری مانی جاتی تو یہ نوبت ہی کیوں آتی۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنس کر تلخی سے بولی۔

"پلیز اب تم بھی جاؤ یہاں سے، چھوڑ دو مجھے میرے حال پر۔ اللہ کے واسطے۔" اس نے بے بسی سے اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔ ایک بار پھر سے اس کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔

"آپی پلیز آپ روئیں نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں بات کرتی ہوں امی سے۔" رائمہ اس کی اجڑی حالت دیکھ کر خود بھی دکھی ہو گئی تھی۔

"کیا ٹھیک ہوگا؟ کچھ بھی نہیں...... میں بہت بے بس ہو گئی ہوں نائمہ...... میں چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر پا رہی، میں نہیں جانا چاہتی وہاں...... تم بھی جانتی ہو اسرار بھائی بالکل بھی اچھے نہیں ہیں، مجھے ڈر لگتا ہے ان کی گندی نظروں سے، میں کیسے رہوں گی ان کے گھر اتنے دن تم بتاؤ؟" وہ ٹوٹ کر بکھری تھی، رائمہ نے آگے بڑھ کر اس کو اپنے ساتھ لگایا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی جبکہ رائمہ اس کو دلاسا بھی نہیں دے پائی تھی کیونکہ یہ فیصلہ اس کے باپ نے کیا تھا اور وہ جو ایک بار کہہ دیتے تھے، پھر پتھر پر لکیر ہوتی تھی۔ وہ چاہ کر بھی اس کے لیے کچھ نہیں کر پائی تھی۔

❀......❀......❀

"واہ کیا بات ہے......اس ولا میں مہمانوں سے سلام دعا کرنے کا یہ ان کو کمپنی دینے کا رواج نہیں ہے کیا؟" وہ

لاؤنج سے گزر کر تیزی سے سڑھیوں کی طرف بڑھ رہا تھا جب رمل کی طنزیہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی، وہ پچھلے دو دن سے آفس ورک میں بہت مصروف تھا اس لیے اس کی ملاقات رمل اور رومانہ سے نہیں ہوئی تھی اور آج وہ آفس سے جلدی آیا تھا کیونکہ رات انہوں کسی پارٹی میں جانا تھا، تب ہی اس کا سامنا رمل سے ہوا جو لاؤنج میں کہیں جانے کے لیے نک سک سے تیار سیل ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔

"قطعاً نہیں۔" رمل کے پوچھنے پر اس کا حلق تک کڑوا ہوا...... وہ آگے جانے کی بجائے اس کے پاس آ کر دو ٹوک لہجے میں بولا۔

"لیکن کیوں دارین؟" رمل اپنا سا منہ لے کر رہ گئی لیکن بولنے سے پھر بھی باز نہیں آئی۔ وہ جب بھی آتی تھی اس سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈتی تھی۔

"ویسے یہاں مہمان کون ہے مس رمل؟" وہ استہزایہ انداز میں ہنس کر عین اس کے مقابل آ کر بولا۔

"کیا مطلب میں سمجھی نہیں؟" وہ بھی اس کی بات سن کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

"مطلب مہمان ایک یا دو دن کا ہوتا ہے لیکن تم لوگوں نے تو ہر وقت ہی یہاں ڈیرے ڈالے ہوتے ہیں، اس لیے تم لوگ میرے مہمانوں کی لسٹ میں نہیں آتیں۔" اس نے پرسکون لہجے میں اس کو آئینہ دکھایا۔

"دارین یہ کیا بدتمیزی ہے؟" اپنے کمرے سے تیار ہو کر نکلتی شاہانہ بیگم نے اس کی آخری بات سن کر غصے سے اسے ٹوکا۔

"یہ بدتمیزی نہیں مسز شاہ میں نے حقیقت بتائی ہے آپ کی بھانجی صاحبہ کو، ویسے اس میں غلط ہی کیا ہے؟" وہ مسز شاہ کے روبرو کھڑا ہوا۔

"رمل میری بھانجی نہیں، بیٹی ہے۔ اس سے کوئی اس لہجے میں بات کرے یہ میں ہرگز برداشت نہیں کروں گی۔"

"تو نہ کریں برداشت، آئی ڈونٹ کیئر۔" وہ غصے سے بولا، شاہانہ بیگم کے لہجے میں رمل کے لیے پیار دیکھ کر اس کا موڈ یک دم مزید خراب ہو گیا تھا۔

"ایسے بھی کوئی کرتا ہے بھلا گھر آئے مہمان سے۔" وہ غصے سے بولیں۔

"میں ان جیسے روز روز منہ اٹھا کر آنے والے لوگوں کو مہمان نہیں مانتا اور اگر آپ کو اتنی پروا ہے اپنے ان مہمانوں کی تو انہیں کہیں وہ مجھ سے مت الجھیں، ورنہ ایسے ہی جواب ملیں گے ان کو مجھ سے۔" اس نے ایک اچٹتی سی نظر شاہانہ بیگم کے کندھے سے لگی رمل پر ڈال کر غصے سے کہا اور لب بھینچ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیڑھیاں چڑھ گیا۔

"شانہ مام دارین ایسے کیوں ہیں؟" رمل نے شاہانہ بیگم کے گلے میں باہیں ڈال کر معصومیت سے پوچھا، وہ ان کو پیار سے شانہ مام کہتی تھی۔

"میری جان وہ شروع سے ہی ایسا ہے اپنے باپ کی طرح ضدی، غصیل اور خود سر، تم بھی تو جانتی ہی ہو اسے۔" انہوں نے بھی لہجے میں اپنا پن سموتے ہوئے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم لیکن......"

"اب لیکن ویکن کو چھوڑو چلو ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔" انہوں اس کو پیار سے خود سے لگا کر اس کے گال کا بوسہ لے کر کہا۔

"اوکے شانہ مام۔" اس نے مسکرا کر سر جھٹکا اور اپنا بیگ اٹھا کر شاہانہ بیگم کے ساتھ باہر نکل گئی، آج وہ اکیلی ان کے ساتھ پارٹی میں جا رہی تھی، رومانہ بیگم کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھیں، ورنہ اس وقت وہ بھی ان دونوں کے ساتھ ہی جانے کے لیے تیار ہوتیں۔

"ماموں میں نے آپ سے کچھ بات کرنی ہے؟" وہ ساری رات سوچنے کے بعد پختہ فیصلہ کر کے صبح ان کے کمرے میں آئی تھی۔

"ہاں بولو اب کیا بات ہے؟" اس کو اپنے کمرے میں دیکھ کر عابدہ مامی کا ماتھا ٹھنکا، جبکہ بیا نے بھی فیصلہ کرلیا تھا کہ چاہے جو بھی ہو جائے وہ اسرار بھائی کے گھر کبھی نہیں جائے گی اور یہی بات کرنے وہ ان کے کمرے میں آئی تھی۔ عابدہ مامی، صفدر ماموں کے کپڑے بیگ میں رکھ رہی تھیں، وہ کہیں جارہے تھے شاید اور صفدر ماموں شیشے کے آگے کھڑے بال بنارہے تھے۔

"مجھے آپ سے نہیں ماموں سے بات کرنی ہے۔" اس نے عابدہ مامی کی بات سن کر دھیرے سے کہا۔

"ہاں بولوں کیا بات ہے؟" صفدر علی نے بال بناتے ہوئے مصروف انداز میں روکھے لہجے میں کہا۔

"وہ...... مم...... مجھے......"

"کیا میں...... میں لگا رکھی ہے اب آگے بھی بولو اتنا ٹائم نہیں تمہارے ماموں کے پاس۔" عابدہ مامی نے بھنویں چڑھا کر بیزاری سے کہا اور دوبارہ سے بیگ میں کپڑے رکھنے لگیں، صفدر علی فی الحال دو دن کے لیے شہر سے باہر جارہے تھے، ان کو اندازہ نہیں تھا وہ کیا بات کرنے آئی ہے۔

"ہاں جلدی بولو...... تمہاری مامی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔"

"وہ...... مم...... مجھے نہیں جانا نائمہ آپی کے گھر۔" اس نے ڈرتے ڈرتے ایک ہی سانس میں پوری بات کہہ دی، عابدہ مامی کو اس کی بات سن کر زوردار جھٹکا لگا اور یہی حال صفدر علی کا بھی ہوا تھا۔

"یہ کیا بکواس کررہی ہو؟" وہ بیگ چھوڑ کر اس کے پاس آئی اور اس کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولیں۔

"میں پورے ہوش و حواس میں ہوں مامی، مجھے نہیں پسند کسی کے گھر جانا...... آپ لوگ نائمہ آپی کو یہاں بلا لیں، میں ان کا ہر کام کروں گی اُف تک نہیں کہوں گی لیکن ادھر نہیں جانا میں نے۔" اب وہ روتے ہوئے صفدر علی کے آگے کھڑی ہوئی، آج اس میں بہت زیادہ ہمت آگئی تھی اور وہ اپنے حق کے لیے بول رہی تھی اور یہ سب اللہ سے کی ہوئی دعاؤں کا نتیجہ تھا۔

"ادھر کیوں نہیں جانا چاہتی تم، کوئی تو وجہ ہوگی۔" انہوں نے ناگواری سے پوچھا، عابدہ مامی نے بھی غصے سے اس کو گھورا ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ صفدر علی کو کوئی منتر پڑھ کر غائب کرکے اس کو پکڑ کر دو چار تھپڑ لگادیں۔

"مم...... میں نہیں بتا سکتی۔" اب وہ انہیں کیا بتاتی ان کے داماد کے بارے میں۔ نہ ہی انہوں نے اس کی بات کا یقین کرنا تھا۔

"کیوں...... کیوں نہیں بتا سکتی؟" وہ غصے سے دھاڑے، بیا اندر تک لرز گئی لیکن ناامید پھر بھی نہیں ہوئی تھی۔

"پتا نہیں بس میں وہاں نہیں جاؤں گی۔" وہ پھر سے ہمت مجتمع کرکے پختہ لہجے میں بولی اور بغیر ان دونوں کی طرف دیکھے تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

"یہ لڑکی تو نکل گئی ہمارے ہاتھوں سے صفدر صاحب۔" مامی بھی اس کی دیدہ دلیری پر دنگ رہ گئیں۔

"ہوں تم صحیح کہہ رہی ہو اس وقت تو میں جلدی میں ہوں، اب دو دن بعد ہی بات ہوگی۔ تم نائمہ کو یہی بلوالو۔" انہوں پر سوچ لہجے میں کہا لیکن بیا پر انہیں بہت غصہ آرہا تھا، کچھ دیر بعد صفدر علی چلے گئے تھے۔ عابدہ مامی نے اسرار احمد اور نائمہ کو کال کرکے گھر ہی بلوالیا تھا۔

❁......❁......❁......❁

اس نے مغرب کی نماز پڑھ کر دعا مانگی اور کمرے سے باہر آئی، اس کا رخ کچن کی طرف تھا کیونکہ مغرب ہوگئی تھی رائمہ کے آنے کا وقت ہوگیا تھا...... وہ سالن سلاد، رائتہ اور بریانی پہلے ہی تیار کرچکی تھی، بس اب اس نے روٹیاں پکانی تھی، جب سے صفدر ماموں گھر سے گئے تھے، اس وقت سے لے کر اب تک عابدہ مامی سے اس کا سامنا نہیں ہوا تھا اور نہ ہی وہ گھر تھیں، وہ نائمہ آپی کے ساتھ ہاسپٹل چلی گئی تھیں اس نے بھی شکر کیا اور وقت دیکھا۔

❁......❁......❁......❁

"ابھی تک رائمہ نہیں آئی۔" وہ خود سے بڑبڑائی۔

"پہلے تو وہ اس وقت آجاتی تھی۔" سردیوں کے چھوٹے دن تھے سرے شام ہی رات کا گمان ہورہا تھا وہ تھوڑی پریشان ہوئی لیکن پھر سر جھٹک کر کچن میں آگئی۔

"کیسی ہیں آپ سالی صاحبہ؟" وہ فریج سے آٹے والا باول نکال رہی تھی، جب اسرار بھائی کی آواز اس کے کانوں میں پڑی، وہ کرنٹ کھا کر پیچھے مڑی اور ان کو کچن کے دروازے میں ایستادہ دیکھ کر آٹے کا باول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین بوس ہوگیا۔ وہ ہونق بنی ان کو دیکھتی رہی۔

"آپ یہاں کیا کررہے ہیں؟" وہ بہ مشکل بولی، خوف سے اس کی آواز لرزی...... وہ ان کی بے باکی پر حیران ہوئی۔

"یہ میرا اسرال ہے، میں یہاں کسی بھی وقت آسکتا ہوں۔" وہ اس پر ہوس بھری نظریں گاڑھے بولے اور اس کے قریب ہوئے۔

"آپ جائیں یہاں سے پلیز...... مامی اور نائمہ آپی گھر پر نہیں ہیں۔" اس نے اپنے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"ہاہاہاہا...... جانتا ہوں...... یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسے اور دو قدم کا فاصلہ طے کرکے اس کے بالکل پاس آئے، وہ ڈرتے ڈرتے پیچھے ہوتی سینک کے ساتھ لگ گئی۔

"یہ...... کک...... کیا کررہے ہیں آپ؟ جائیں یہاں سے پلیز۔" وہ اپنے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر رکھ کر اس کو پوری قوت سے پیچھے دھکیلتے ہوئے چیخی لیکن وہ ایک انچ بھی نہیں ہلا، خوف و بے بس سے اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن یہ وقت رونے کا نہیں، ہوش و حواس میں رہ کر خود کو بچانے کا تھا، اس نے پیچھے سینک میں ہاتھ مارا، کفگیر اس کے ہاتھ میں آگیا اس نے وہ اٹھا کر پوری قوت سے اس کے منہ پر دے مارا۔

"اوچ......" اس کے منہ سے چیخ نکلی اور یہی موقع تھا، انابیہ نے اس کو زور سے پیچھے دھکیلا اور باہر صحن کی طرف بھاگی اور جلدی سے بھاگ کر کچن کی دیوار کے ساتھ رکھے اسٹول کو اٹھا کر دوسری دیوار کے ساتھ رکھا اور اس پر چڑھ کر عاشی کو بلانے لگی۔

"عاشی...... عاشی...... زرینہ خالہ پلیز میری مدد کریں۔" وہ روتے ہوئے ان کو پکار رہی تھی تب ہی اسرار احمد نے اس کو بالوں سے پکڑ کر کھینچا وہ درد سے کراہ اٹھی۔

"کوئی بھی نہیں کرے گا مدد...... تیری مامی اور آپی کو میں ان کی دوست کے گھر چھوڑ کر آیا ہوں، وہ تب آئیں گی جب میں ان کو لینے جاؤں گا۔" اس کی بات سن کر وہ سکتے میں رہ گئی جبکہ وہ اس کو گھسیٹتے ہوئے برآمدے کی طرف لے آیا۔

"چھوڑو میرے بال ذلیل انسان...... یااللہ مجھے بچا لے اس درندے سے۔" وہ یک دم ہوش میں آئی اور اس سے اپنا بازوں چھڑوا کر باہر کی طرف بھاگی۔

"چٹاخ...... کب سے بچ رہی ہے تو مجھ سے لیکن آج نہیں...... تو میرے گھر نہیں جاسکتی تو میں نے سوچا ادھر ہی ٹھیک ہے۔" اس کا بھاری ہاتھ اٹھا اور بیا کے گال پر اپنا نشان چھوڑ گیا، وہ تیورا کر گری اور اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔

"میں نے تو سوچا تھا کہ تو میری بات جلدی مان جائے گی لیکن تو نہیں چاہتی کہ میں تجھ پر نرمی کروں۔" وہ حیوانوں کے طرح اس پر جھپٹا اور اس کو بازوں سے پکڑ کر اندر کمرے میں لے جا کر بیڈ پر پٹخ دیا۔

"یہ آپ ٹھیک نہیں کررہے، مم...... میں ماموں کو بتاؤں گی، وہ آپ کو چھوڑیں گے نہیں، جان سے ماردیں گے۔" وہ ہمت مجتمع کرکے تقریباً چیخی اور بیڈ سے اتری کیونکہ یہ وقت جوش سے نہیں ہوش سے کام لینے کا تھا وہ بہت ڈری اور سہمی ہوئی تھی۔

"ہاہاہاہا...... تمہاری ماننے گا کون؟ جانتا ہوں کتنی چلتی ہے تیری اس گھر میں۔" اس نے خباثت سے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کی طرف بڑھا، جبکہ وہ صدمے سے گنگ کھڑی تھی، کوئی اتنا بھی گر سکتا ہے، جتنا وہ گر چکا تھا۔ وہ

کچھ بول ہی نہ پائی۔
"بہت زیادہ انتظار کیا ہے میں نے اس دن کا...... اب وقت آیا ہے تو کیسے جانے دوں میں تمہیں...... تمہاری وجہ سے آتا تھا میں اس گھر میں، تو مجھے نخرے دکھاتی تھی اب تو میں سارے بدلے لوں گا تجھ سے۔" اس نے بولتے ہوئے بیا کے اوپر سے شال کھینچی، تب وہ ہوش میں آئی اور اس کو دھکا دے کر وہاں سے بھاگی لیکن دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی اس نے دوبارہ دبوچ لیا تھا۔

"چھوڑو مجھے کمینے انسان...... تمہیں تو میں تمہارے گندے ارادوں میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔" اس نے چیخ کر کہا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے منہ پر زور سے مارے اس کی انگلیاں اسرار احمد کی آنکھوں میں چبھ گئی تھی، وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو تھام کر پیچھے ہٹا تو وہ جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکل کر کچن کی طرف بڑھی اور اس کے دروازے کی اوٹ میں رکھے موٹے سے ڈنڈے کو اٹھا کر ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام لیا، جیسے ہی اسرار احمد آنکھوں کو مسلتا اس کی طرف بڑھا، اس نے اپنی پوری قوت لگا کر ڈنڈا اس کے سر پر مارا۔

"آ...... مر گیا۔" اس کا وار اتنا زوردار کا تھا کہ اسرار احمد جیسا مضبوط بندہ بھی تڑپ کر منہ کے بل گر پڑا تھا۔

"تمہیں چھوڑوں گا نہیں بیا۔" وہ درد سے تڑپتے ہوئے بھی اس کو دھمکی دے رہا تھا اور پھر کچھ دیر ایسے ہی درد سے تڑپنے کے بعد ڈھیر ہو گیا جبکہ وہ ہکابکا رہ گئی اس کے ہاتھ پاؤں خوف سے کانپ رہے تھے، اس کے سر پر شال اور پاؤں میں چپل بھی نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا، اس نے ڈنڈے کو پھینکا اور شال کو مضبوطی سے پکڑ کر دروازے کی سمت بھاگی۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی، اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا وہ ننگے پاؤں دروازے کی طرف لپکی اور گھبراہٹ میں کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھول کر سامنے والے کو دیکھے بغیر دھکا دے کر اندھا دھند باہر بھاگ گئی تھی۔

❀ ❀
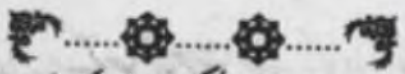
دارین غصے کا بہت تیز تھا لیکن ہر دکھ کی طرح اپنا غصہ بھی اپنے اندر ہی رکھتا تھا، کبھی گھر کے کسی فرد پر ظاہر نہیں کرتا تھا لیکن پتا نہیں کیوں آج جب اسے شاہانہ بیگم پر بہت زیادہ غصہ آیا تو اس نے دل میں رکھنے کی بجائے ان دونوں پر غصہ نکال دیا تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ شاہانہ بیگم نے اس کو نظر انداز کر کے اپنی بھانجی رِبل کی طرف داری کی تھی، تب سے ہی اس کا موڈ بھی خراب ہو گیا تھا...... وہ فریش ہو کر واش روم سے نکلا تو زین بلیک تھری پیس سوٹ میں ملبوس نک سک سے تیار پہلے سے ہی اس کے کمرے میں بیٹھا اپنے موبائل میں مصروف تھا، اس نے ایک نظر زین پر ڈالی آج پہلی بار وہ اس کے ساتھ کسی بزنس پارٹی میں جا رہا تھا۔ خراب موڈ کے ساتھ ہی اس نے اپنے گیلے بال صاف کر کے تولیہ بیڈ پر پھینک کر شرٹ اٹھا کر پہنی اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں کو سیٹ کر کے اپنے مخصوص پرفیوم کا چھڑکاؤ کیا، کوٹ پہنا اور ریسٹ واچ باندھ کر ایک بار پھر سے آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"چلیں زین؟" وہ ڈیشنگ اور اسمارٹ لگ رہا تھا۔

"جی بھائی۔" وہ بھی تیزی سے کھڑا ہوا۔

پورچ میں آ کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تب تک زین بھی گاڑی میں بیٹھ گیا تھا، اس نے گاڑی گیٹ سے نکال کر روڈ پر ڈالی اور اس کی اسپیڈ بڑھائی۔

"کیا بات ہے بھائی آپ کا موڈ کچھ آف ہے؟" زین نے لب بھینچ کر ڈرائیونگ کرتے دارین کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں تو۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"پھر بھی بھائی میں نے نوٹ کیا ہے، آپ بڑی بے دلی سے تیار ہو رہے تھے۔ کچھ ہوا ہے کیا؟" اس نے پھر سوال کیا۔

"نہیں۔" اس نے جواب دے کر پارکنگ میں گاڑی کو بریک لگائے اور خاموشی سے باہر نکل آیا...... زین بھی

خاموشی سے اس کے ساتھ ہی باہر نکل آیا، وہ دونوں جب اندر پہنچے تو سب لوگ پہلے ہی آچکے تھے۔

"ویلکم مسٹر دارین حیدر شاہ۔" مسٹر سبحان نے بڑی خوش دلی سے ان کا استقبال کیا۔

"مسٹر دارین یہ آپ کے ساتھ کون ہیں؟" وہ سب سے مل کر مسٹر سبحان علی سے محو گفتگو تھا جب ان کے کسی دوست نے زین کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔

"یہ میری جان، میرا سب کچھ ہے۔" اس نے زین کی طرف دیکھ کر پیار سے کہا۔

"ہم سمجھے نہیں مسٹر شاہ؟" وہ سب چونکے۔ کافی لوگ ان کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔

"یہ زین حیدر شاہ ہے، میرا چھوٹا بھائی۔" اس نے زین کو اپنے پاس بلا کر اس کا سب سے تعارف کروایا، زین اتنے بڑے بزنس ڈنر میں آج پہلی بار آیا تھا، اس لیے اس کے بارے میں جاننے کا سب کو تجسس تھا۔

"وری نائس...... دونوں بھائی ہی بڑے ہینڈسم، اسمارٹ اینڈ ڈیشنگ ہیں۔" ان لوگوں کے جواب دینے سے پہلے ہی زونش سبحان ان کے قریب آکر شوخی سے بولی۔ سب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"ارے زونش بیٹا تم آگئی؟" سبحان علی بھی بیٹی کو دیکھ کر چہکے۔

"جی پاپا۔" وہ بھی مسکراتی ہوئی ان کی طرف بڑھی۔

دارین اور زین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر زونش کی طرف دیکھا جس نے بلیک ڈیپ گلے والی سلیو لیس میکسی پہنی ہوئی تھی، جس سے اس کے دودھیاں بازو عیاں ہورہے تھے اور بلیک پینسل ہیل سے اس کا قد نمایاں ہورہا تھا، باتیں کرتے ہوئے وہ اپنے ڈائی کیے شولڈر کٹ بالوں کو کبھی ادھر تو کبھی ادھر جھٹک رہی تھی، اس کی ادائیں دیکھ کر دارین کا موڈ اور زیادہ خراب ہوگیا تھا۔

"دارین میٹ مائی لولی ڈاٹر زونش اینڈ زونش ہی از دارین حیدر شاہ آور نیو بزنس پارٹنر۔" سبحان علی نے بڑی گرم جوشی سے اس کا تعارف کروایا۔

"نائس ٹو میٹ یو مسٹر شاہ۔" زونش نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے کیا تو نا چاہتے ہوئے بھی دارین نے اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔

"ہمم...... تھینکس۔"

"ایکسکیوز می میں ابھی آتا ہوں، جب تک آپ لوگ باتیں کریں۔" مسٹر سبحان ان کو وہاں چھوڑ کر کسی اور کی طرف بڑھ گئے تھے، اب وہاں وہ تینوں کھڑے تھے۔

"رئیلی مجھے آپ سے مل کر بہت اچھا لگا دارین۔" زونش نے پرجوش لہجے میں مسکراتے ہوئے بات کا آغاز کیا لیکن دارین کچھ نہیں بولا۔

"جی مجھے بھی اچھا لگا۔" دارین کو چپ دیکھ کر زین مروتاً بولا۔

"لیکن مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔" دارین نے اس کا سرتاپا جائزہ لینے کے بعد سنجیدگی سے کہا، زونش کے چہرے پر ایک سایا سا آ کر گزرا تھا۔

"لیکن کیوں؟"

"یہ بتانا میں ضروری نہیں سمجھتا۔" اس نے بے رخی سے کہا اور معذرت کرتا وہاں سے ہٹ گیا۔

"واہ بھئی مسٹر دارین حیدر کے بارے میں جو سنا تھا یہ تو بالکل ویسے ہی ہیں۔" اس کے جانے کے بعد وہ زین کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

"کیا سنا تھا آپ نے بھائی کے بارے میں؟" زین نے چونک کر پوچھا۔

"یہی کہ دارین حیدر بڑا مغرور، گھمنڈی اکڑو اور کھڑوس سا انسان ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"یہ آپ ان کی تعریف کررہی ہیں یا انسلٹ؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"آف کورس تعریف۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"ہمم...... میرے بھائی بہت پیارے ہیں، لیکن لوگ ان کو سمجھنے میں ہر بار غلطی کرجاتے ہیں۔ بٹ اس بات سے ان کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اب کے زین نے سنجیدگی سے کہا اور اس سے معذرت کرتا دارین کے پیچھے

ی چلا گیا۔
پھر وہ کچھ دیر ہی وہاں رکے تھے، دارین نے طبیعت خراب کا بہانہ کر کے سبحان علی سے جلدی گھر جانے کی اجازت چاہی، لیکن وہ جب تک وہاں رہا، زونش سبحان اس کے اردگرد ہی منڈلاتی رہی اور اس بات سے دارین کو اور زیادہ چڑ ہو رہی تھی، اس کا بس چلتا تو وہ اس کو وہاں سے غائب کر دیتا، ایسی لڑکیوں کی وجہ سے ہی تو اسے عورت ذات پر اعتبار نہیں رہا تھا اور ابھی تک اسی وجہ سے اس نے شادی بھی نہیں کی تھی، گھر میں اس کی ماں، رملہ اور رومانہ اور باہر جاتا تو کوئی نہ کوئی ایسی مل جاتی تھی، غصے سے اس کے سر میں درد شروع ہو گیا تھا، اس نے زین کو گاڑی ڈرائیو کرنے کا کہا اور خود فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا، زین نے بھی بغیر کوئی سوال کیے گاڑی اسٹارٹ کی اور پھر راستے میں حادثہ ہو گیا تھا۔

❁ ❁

اس لڑکی کی پوری کہانی سننے کے بعد وہ تذبذب کا شکار تھا، وہ لڑکی سچ کہہ رہی ہے یا جھوٹ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن پتا نہیں کیوں اس کا دل کہہ رہا تھا وہ سچ بول رہی ہے اور اگر وہ جھوٹ بھی بول رہی تھی تو پھر بھی اب وہ اس کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اس لیے وہ اس کو لے کر اپنے فلیٹ میں چلا آیا تا کہ وہ کچھ دن ٹھہر سکے اور جب تک اس کا زخم بھی ٹھیک ہو جاتا...... اس کو وہاں چھوڑ کر وہ گھر چلا آیا تھا۔

❁ ❁

سات دنوں سے وہ اسی فلیٹ پر تھی...... دارین حیدر جب سے اس کو چھوڑ کر گیا تھا اس کے بعد سے واپس نہیں آیا تھا، اس کے ذہن میں عجیب عجیب سے خیالات آ رہے تھے، وہ اتنے دنوں سے گھر سے غائب تھی۔
"عابدہ مامی نے اس کے بارے میں صفدر ماموں کو کیا بتایا ہوگا، اور وہ سب سن کر ان کا کیا ردعمل ہوگا، کیا سوچ رہے ہوں گے میرے بارے میں، کتنی بدنامی ہوئی ہوگی میری؟" یہ سب سوچ کر اس کے اندر خوف کی لہر دوڑ گئی اور ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔ وہ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی، تب ہی ڈور بیل بجی، وہ بری طرح چونکی لیکن اٹھی پھر بھی نہیں، ڈور بیل پھر سے بجی۔ نا چاہتے ہوئے بھی وہ وہاں سے اٹھی اور دروازے تک پہنچی۔
"ک...... کون ہے؟" اس نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔
"میں ہوں دارین حیدر۔" باہر سے دارین حیدر کی رعب دار آواز آئی تو اس نے جلدی سے دروازہ کھولا اور پیچھے ہٹ کر اس کو اندر آنے کا راستہ دیا۔
"کیا ہوا...... اتنا ڈر کیوں رہی ہیں آپ؟" اس نے انابیہ کے ڈرے ہوئے چہرے کو دیکھا، وہ شال میں لپٹی ہوئی تھی لیکن اس کی گھبراہٹ اور کپکپاہٹ اس کو صاف نظر آ رہی تھی۔
"وہ...... م...... مجھے لگا کہ کوئی اور آ گیا ہے اس لیے میں ڈر گئی تھی۔" وہ ہاتھوں کو آپس میں مسلتے ہوئے گھبرائی بولی۔
"یہاں میرے علاوہ کوئی نہیں آتا ڈونٹ وری۔" اس نے بیا کو تسلی دی اور پھر دونوں ڈرائینگ روم میں آ گئے۔
"میں نے آپ کے گھر والوں کا پتا کروایا ہے۔" اس نے انابیہ کو بتایا، وہ پچھلے چھ سات روز سے دفتری کام میں مصروف تھا لیکن اس لڑکی سے غافل نہیں ہوا تھا اس نے اپنے بندوں سے کہہ کر صفدر علی کے بارے میں سارا پتا کروا لیا تھا اور پھر اس نے خود بھی وہاں جا کر ساری بات کی تصدیق کی تھی لیکن محلے والوں نے اسے اور ہی کہانی سنائی تھی...... جو اس کو انابیہ نے بتایا تھا اس سے مختلف۔
"پھر کیا پتا لگا آپ کو؟" اس نے نا سمجھی سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
"وہی جو آپ نے بتایا لیکن......"
"لیکن کیا دارین جی؟" وہ چونکی۔
"آپ کی مامی نے آپ کے بارے میں محلے میں کوئی غلط افواہ پھیلائی ہوئی ہیں۔"
"افواہ......! پلیز دارین صاحب آپ پوری بات

بتائیں..... کیا معاملہ ہے؟" پریشانی سے اس کے اندر ہول اٹھنے لگے تھے۔

"یہی کہ آپ کا کسی لڑکے کے ساتھ چکر تھا اور جب گھر میں کوئی نہیں تھا تو آپ اپنے آشنا کے ساتھ گھر سے بھاگ رہی تھی تب ہی آپ کا بہنوئی آ گیا اس نے آپ کو روکنے کی کوشش کی لیکن آپ لوگوں نے اس کو راستے سے ہٹانے کے لیے زخمی کیا اور وہاں سے بھاگ گئیں۔ آپ کے ماموں نے بھی کہہ دیا ہے کہ اب ان کی کوئی بھانجی نہیں ہے۔" دارین حیدر نے اس کو ساری تفصیل بتائی اور وہ ساکت رہ گئی۔

"افف..... میرے اللہ۔" وہ سر تھام کر زمین پر بیٹھتی چلی گئی، اب تو اس کے واپس جانے کا کوئی راستہ ہی نہیں بچا تھا۔

"اب بتائیں کیا اب بھی آپ وہاں جانا چاہتی ہیں؟"

"نن..... نہیں..... کیسے جاؤں گی میں وہاں۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"تو پھر کہاں جائیں گی آپ؟"

"پتا نہیں..... لیکن اب اس گھر میں نہیں جاؤں گی۔" اس نے اپنے آنسو صاف کر کے کہا اور کھڑی ہوئی۔

"آپ کا اس شہر میں اور کوئی نہیں؟" اس نے اس کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"تو پھر آ....." ابھی بات اس کے منہ میں ہی تھی جب وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔

"کوئی نہیں ہے میرا، میرے بابا اور امی دونوں مجھے اس ظالم دنیا میں تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ میں اکیلی رہ گئی۔ میں نے بھی جانا ہے ان کے پاس۔" وہ ایسے ہی چیختی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی، وہ ہوش و حواس میں نہیں تھی، دراین اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا تب ہی اس کو بازو سے تھام کر اپنی جانب کھینچا۔

"پلیز انابیہ ریلیکس۔"

"چھوڑیں مجھے۔" اس نے دارین کے ہاتھوں کو جھٹک کر خود سے دور کیا۔ "مجھے مرنے سے کوئی نہیں روک سکتا، میں خود کو ختم کر لوں گی۔" وہ آنسوؤں کے بیچ چیختے ہوئے بولی۔ وہ ہر طرف سے ناامید ہو چکی تھی اس لیے وہ خود کو ختم کرنے کا سوچ چکی تھی۔

"جسٹ شٹ اپ انابیہ..... ایسے بزدلوں والی باتیں کیوں کر رہی ہیں آپ؟" اس نے انابیہ کو جھنجوڑ کر ہوش دلایا۔

"تو کیا کروں میں دارین صاحب آپ ہی بتائیں، میں بالکل تنہا ہو گئی ہوں، نہ میرا گھر رہا نہ ہی ماں باپ، ایک ماموں تھے وہ بھی مجھے اپنانے کو تیار نہیں اور آپ جانتے ہیں کہ یہ دنیا اکیلی اور گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کو کبھی عزت سے جینے نہیں دے گی۔ اب کون اپنائے گا مجھے آپ بتائیں؟" وہ زمین پر بیٹھ گئی اور ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

"میں اپناؤں گا آپ کو۔" دارین نے بغیر سوچے سمجھے جھٹ سے فیصلہ کر کے کہا..... انابیہ نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اپنے سامنے کھڑے اس خوبرو انسان کو دیکھا۔

"کیا آپ مجھ جیسے انجان شخص پر اعتبار کریں گی؟" دارین نے حیران بیٹھی انابیہ سے پوچھا اور سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں جانتا ہوں آپ کے لیے کسی بھی اجنبی پر اعتبار کرنا مشکل ہے اور نہ ہی میں اتنا اچھا ہوں کہ مجھ پر اعتبار کیا جائے۔ اس لیے میں آپ سے اتنا ہی کہوں گا کہ آپ جو بھی فیصلہ کریں سوچ سمجھ کر کریں۔" اس نے صاف گوئی سے کہا اور فیصلہ اس پر چھوڑ دیا، وہ خاموشی سے اس کو دیکھتی رہی۔

"اگر آپ مجھ جیسی گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کو اپنا رہے ہیں تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔" اس نے بھی فوراً ہامی بھری کیونکہ وہ اس پر اعتبار کر چکا تھا، حالانکہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے انجان تھے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ دارین حیدر کو اس سے بس ہمدردی تھی، جب وہ ہمدردی

میں اتنا بڑا قدم اٹھا رہا تھا تو اس نے بھی ہاں کر دی...... سب سے پہلے اس نے انابیہ سے نکاح کیا تھا۔
اس کا ارادہ تھا بیا کو فلیٹ میں رکھنے کا لیکن رِئل اور مسز شاہ نے ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ لیا تھا، اس لیے اس نے بھی فلیٹ میں جانے کا ارادہ ملتوی کیا اور گاڑی کا رخ ''شاہ ولا'' کی طرف موڑ دیا۔ وہ جانتا تھا وہاں ہنگامہ کھڑا ہو چکا ہوگا، اب اس کے ذہن میں بہت سی سوچیں بیک وقت چل رہی تھیں۔

......❁......❁......

رات کے گیارہ بج رہے تھے، پورے شہر میں رات جاگ رہی تھی، ہر طرف روشنیوں اور گاڑیوں کا سیلاب بکھرا ہوا تھا، سب کو ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی جلدی مچی تھی لیکن ایک وہ ہی تھا جس کی گاڑی کی اسپیڈ بالکل کم تھی۔ وہ اس کے برابر والی سیٹ پر مجرموں کی طرح چپ چاپ سی سر جھکائے بیٹھی تھی، وہ بے دلی سے ڈرائیو کر رہا تھا، ڈرائیو کرتے ہوئے اچانک ہی اس کی نظر اپنی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے وجود پر گئی تو اس کے لب بھینچ گئے۔
وہ مظلوم تھی لیکن اس وقت مجرم سی نظر آ رہی تھی، چند سیکنڈ اس کو دیکھنے کے بعد اس نے دوبارہ ونڈ واسکرین پر نظریں جما کر گیئر بدلا اور گاڑی کی اسپیڈ بڑھائی۔ انابیہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا جو لب بھینچے سختی سے اسٹیئرنگ پر ہاتھ جمائے ڈرائیو کر رہا تھا، وہ اس کے چہرے کو دیکھ کر کچھ بھی اندازہ نہیں لگا پائی تھی کہ وہ کیا سوچ رہا ہے اور کس موڈ میں ہے۔ گاڑی بہت ہی عالیشان و خوب صورت بنگلے جس کے ماتھے پر ''شاہ ولا'' لکھا تھا کی کشادہ اور وسیع روش پر ایک جھٹکے سے رکی۔ دارین اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور انابیہ کی طرف آ کر اس کا دروازہ کھولا، وہ اترنے میں دیر کرتی لیکن اس کے خراب موڈ کے پیش نظر وہ فوراً اتری، اس کے پیچھے اس نے دھڑم سے دروازہ بند کیا۔
''چلیے۔'' وہ اس کو آگے بڑھنے کا اشارہ کر کے خود بھی آگے بڑھا، اس کے قدم مضبوط تھے لیکن وہ سست رفتاری سے چل رہی تھی۔ وہ بیرونی گیٹ عبور کر کے کوریڈور میں داخل ہوئے تھے۔
''آخر وہ ہے کہاں؟ میں نے اتنی بار کال کی ہے وہ اٹھا ہی نہیں رہا...... شاید اس نے میری کال نہ اٹھانے کی قسم کھائی ہوئی ہے۔'' مسز شاہ کی غصے سے بھری آواز اس کو بھی سنائی دی اور وہ سمجھ گیا کہ وہ اس کی بات کر رہی تھیں لیکن اس کو حیرت نہیں ہوئی، یہ تو ہونا ہی تھا۔
''کیا بات ہے میں یہاں ہوں مسز شاہ...... خیر تو ہے آج مجھے کیسے یاد کیا جا رہا ہے؟'' اس نے بلا ارادہ انہیں مخاطب کیا۔
''وہ لڑکی......'' وہ اس کی آواز سن کر پلٹیں لیکن قدم اور زبان وہیں تھم گئے کیونکہ دارین کے ساتھ وہی لڑکی بڑی سی شال میں لپٹی کھڑی تھی، جس کو انہوں نے شام کو دارین کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کا ہاتھ دارین کے ہاتھ میں تب بھی تھا اور اب بھی...... دارین کے ساتھ لڑکیوں کا ہونا بڑی بات نہیں تھی کیونکہ اس کی پرسنیلٹی ہی ایسی تھی لیکن اس لڑکی کا حلیہ اور دارین کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ ان کو حیرت و پریشانی میں کر رہا تھا، ان کا یہ انداز بہت کچھ کہہ رہا تھا۔
''میں نے اسی لڑکی کا ہی پوچھنا تھا، کون ہے یہ؟'' شاہانہ بیگم آگے بڑھیں اور انہوں نے سوال کیا۔
''یہ مسز دارین حیدر شاہ ہے۔'' دارین نے بڑے سکون سے بم بلاسٹ کیا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس بلاسٹ سے اچھی خاصی تباہی ہوگی۔
''واٹ......! یہ کیا بکوس ہے؟'' وہ بری طرح چیخیں۔
''بکواس نہیں...... یہ انابیہ دارین حیدر شاہ ہیں، اس گھر کی بڑی بہو اور میری بیوی...... ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے اس سے نکاح کیا ہے۔'' دارین نے بہت اطمینان سے کہا۔
''ہوش میں تو ہو تم؟'' اب کی بار رومانہ بیگم نے پوچھا۔
''جی الحمدللہ...... میں مکمل ہوش و حواس میں ہوں اور

پلیز آپ بیچ میں نہ ہی بولیں تو اچھا ہے۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہہ کر ان کو خاموش کروالیا۔

"یہ کیا مذاق ہے دارین؟" شاہانہ بیگم غصے سے تلملاتی ہوئی اس کے سامنے کھڑی ہوئیں۔

"میرا آپ کے ساتھ کوئی مذاق نہیں مسز شاہ، یہ میری بیوی ہے اور میں بہت سے لوگوں کے سامنے اس سے نکاح کرکے یہاں لایا ہوں...... آپ نے دیکھا ہی تھا ہمیں۔" اس نے شاہانہ بیگم کو اطلاع دی جو آج اس کی ماں بنی کھڑی تھیں۔ اب کی بار وہ بھی پھٹ پڑیں۔

"کون سی بیوی اور کیسا نکاح؟ تم جانتے ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو، یہ کون ہے، کہاں سے آئی ہے؟ ہم نہیں جانتے، یہ جہاں کا گند ہے اس کو وہیں پھینک کر آؤ ابھی اور اسی وقت۔" غصے میں بات کرتی ان کی تیز زبان عابدہ مامی کو بھی پیچھے چھوڑ گئی تھی۔

"اِنف از اِنف مسز شاہ...... بہت ہوگیا، میں آپ کو صرف بتارہا ہوں کہ یہ میری بیوی ہے، اگر اس کو وہاں چھوڑنا ہوتا تو اپنے ساتھ یہاں کیوں لے کر آتا؟" اس نے غصے سے اونچی آواز میں کہا، اس کی آواز سن کر زین بھی آگیا تھا۔

"انابیہ؟" اس کے منہ سے حیرانی سے نکلا۔ اس نے گڑبڑا کر دارین کی طرف دیکھا لیکن اس کے ہاتھ میں انابیہ کا ہاتھ دیکھ کر اس کو ساری بات سمجھ میں آگئی تھی، وہ خاموشی سے ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

"یہ لڑکی ہے کون...... کس خاندان کی ہے؟" اب کے رومانہ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"یہ لڑکی پہلے کون تھی، کہاں تھی؟ اس بات سے آپ کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے، نہ ہی مجھے کوئی ایشو ہے، اب یہ میری بیوی ہے، میں اس کو پسند کرتا ہوں اور میں نے اپنی پسند سے اس سے شادی کی ہے، یہ گھر جتنا میرا ہے اتنا اس کا بھی، اب یہ لڑکی اس گھر سے کہیں نہیں جائے گی۔ ادھر ہی رہے گی میرے ساتھ میرے کمرے میں۔" وہ بڑی مضبوطی اور ثابت قدمی سے اس کے سامنے ڈٹ گیا تھا اور انابیہ اپنے سامنے ڈھال بن کر کھڑے دارین حیدر کو دیکھتی رہی، وہ اس کے کردار کو بے داغ رکھنے کے لیے اس کو اپنے نکاح میں لے آیا اور اس مجبوری کی شادی کو اپنی پسند کا نام دے رہا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم دارین؟" حیدر علی شاہ بھی اس کی بات سن چکے تھے اور ان کے پیچھے آتی رمل اکرم بھی انجان نہیں رہی تھی۔

"پاپا میں یہ کہہ رہا ہوں کہ انابیہ میری بیوی ہے، بس یہی بات مسز شاہ کی سمجھ میں نہیں آرہی۔ رجو...... رجو؟" اس نے حیدر علی شاہ کو جواب دے کر ملازمہ کو آواز دی۔

"جی صاحب۔" وہ دوڑی آئی۔

"انہیں میرے روم میں چھوڑ آؤ۔" اس نے انابیہ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی۔

"یہ لڑکی میرے گھر میں نہیں رہے گی۔" شاہانہ بیگم غصے سے پھنکارتی ہوئی آگے بڑھیں۔

"دارین تم نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا بیٹا؟" حیدر علی شاہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ان کو دکھ ہوا تھا، دارین نے اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ ان کو بتائے بغیر کرلیا تھا۔

"اس کے لیے سوری پاپا۔" اب کے وہ تھوڑا نرمی سے بولا۔

"اس لڑکی میں ایسی کیا خاص بات ہے؟" شاہانہ بیگم غصے سے بولیں، ان کی کٹیلی نظریں انابیہ کے وجود کے پار ہورہی تھیں۔

"بہت خاص ہے یہ میرے لیے...... اس کے جیسی تو آپ کی سو کالڈ بھانجی مر کر دوبارہ بھی زندہ ہو تو بھی نہیں بن سکتی۔" اس نے بڑے پرسکون انداز میں کہا۔

"لیکن آج سے دس دن پہلے تو تمہیں اپر کلاس لڑکیاں اٹریکٹ کرتی تھیں پھر اچانک تمہیں یہ احساس کیسے ہوا؟" رومانہ بیگم نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"کیونکہ آج سے دس دن پہلے تک میری انابیہ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اینڈ یور کائنڈ انفارمیشن مسز اکرم جن لڑکیوں کی آپ بات کررہی ہیں ان کے پیچھے میں نہیں

جاتا تھا بلکہ وہ میرے آگے پیچھے منڈلاتی رہیں اور ان کو بھی میں اتنی ہی امپورٹنس دیتا ہوں جتنی کہ آپ کی رِل کو لیکن جب میں بیا سے ملا تو مجھے احساس ہوا کہ یہ دنیا تو بہت زیادہ خوب صورت ہے۔" اس نے ایک اور سنگین وار بھی کردیا، اس کی بات پر رِل کے ساتھ ساتھ رومانہ اور شاہانہ بیگم بھی بلبلا اٹھیں، دارین یہ سب باتیں کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن انابیہ کے قدم اس گھر میں جمانے کے لیے اس نے وہ سب کہا کیونکہ رِل شاہانہ کی منظور نظر تھی۔

"شٹ اپ دارین تم حد سے بڑھ رہے ہو...... انسلٹ کررہے ہو میری بیٹی کی۔" اب کے رومانہ بیگم غصے سے بولیں۔

"مسز رومانہ اکرم آپ کو بار بار ٹوکنا مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا لیکن پھر بھی میں آپ سے یہی کہوں گا کہ آپ بیچ میں نہ بولیں یہ آپ کا نہیں میرا اور میرے پیرنٹس کا پرسنل میٹر ہے، آپ کو اس میں بولنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے رومانہ بیگم کو بڑی شائستگی سے بیچ میں بولنے سے روکا۔

"یہ تم مجھے کہہ رہے ہو؟" وہ غصے سے بولیں۔

"جی آپ کو ہی کہہ رہا ہوں۔" وہ بھی دارین حیدر تھا اپنی بات سے پیچھے نہ ہٹنے والا۔

"تم انتہائی......" انہوں نے کچھ کہنا چاہا تو حیدر علی نے ان کو اشارے سے روک دیا۔

"دارین بیٹا بہو کو روم میں لے جاؤ۔" انہوں نے کہا۔

"اوکے پاپا۔" اس نے سکون کا سانس لیا۔ دارین بیا کو لے کر اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔

......

وہ سوئی نہیں تھی نہ ہی اسے نیند آئی تھی...... فجر کی نماز پڑھی اور قرآن پاک کی تلاوت کرکے پھر سے صوفے پر پاؤں رکھ کر بیٹھ گئی اور گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں مسلسل رونے کی وجہ سے لال ہوگئی تھیں اور پپوٹے بھی سوج گئے تھے۔ وہ سوچوں میں غرق تھی...... ایک لمحہ لگا تھا جس میں اس کی پوری زندگی بدل دی تھی، جو کچھ اس نے کبھی اپنے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا وہ ہوگیا تھا، ساری پرانی یادیں اور باتیں اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں جن کو وہ چاہ کر بھی اپنے ذہن سے جھٹک نہیں پا رہی تھی۔

سوچتے سوچتے اچانک ہی غیر ارادی طور پر اس کی نظر دارین کی طرف اٹھی تھی۔ بے شک وہ وجیہہ شخص تھا اور کوئی بھی اس کی کلاس کی لڑکی خوشی سے اس کی ہمراہی قبول کرلیتی پھر بھی اس نے اس کا انتخاب کیا تھا۔ صرف اس کو تحفظ دینے کے لیے۔ اس کی نظریں دارین پر جمی تھیں جب ہی اس نے کروٹ بدلی اور ذرا سی آنکھیں کھول کر اس کو دیکھا۔

"آپ سوئی نہیں؟" وہ جو گہری نیند میں تھا اس نے اپنی آنکھوں کو مسل کر انابیہ کو دیکھا۔

"نہیں۔" وہ کہہ کر نظروں کا زاویہ بدل گئی۔

"لیکن کیوں...... آپ کیوں نہیں سوئیں، آپ اپنے ساتھ ایسے کیوں کررہی ہیں؟"

"وہ مم...... مجھے نیند نہیں آرہی تھی تو......" اس نے بہانا بنانا چاہا لیکن دارین جانتا تھا کہ اس کو نیند کیوں نہیں آئی اور وہ کیا سوچ رہی تھی۔

"ہمم...... سہی۔" وہ بھی لب بھینچ گیا اور دوبارہ سونے کے بجائے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"سوری میں نے آپ کی نیند خراب کی۔" وہ خاصی شرمندہ لگ رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں...... ویسے بھی نارملی میں اس وقت تک اٹھ جاتا ہوں، زیادہ دیر تک سونے کی عادت نہیں مجھے۔" وہ وال کلاک پر وقت دیکھ کر نرمی سے بولا۔

دارین وارڈ روب سے کپڑے نکال کر فریش ہونے کے لیے واش روم میں گھس گیا۔ انابیہ نے ایک نظر واش روم کے بند دروازے پر ڈالی اور پھر کچھ سوچ کر کمرے سے باہر نکل آئی، سیڑھیاں اتر کر وہ نیچے آئی لیکن اب اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کہاں جائے اور کیا کرے؟ پورے گھر میں خاموشی کا راج تھا اس نے کمروں

کے بند دروازوں کو دیکھا۔

"لگتا ہے سب سوئے ہوئے ہیں؟" اس نے دل میں سوچا اور پھر باہر جانے کے لیے کوریڈور کی طرف بڑھی، تب ہی اس کی نظر ڈائننگ ہال کی طرف اٹھی تو وہ باہر جانے کی بجائے اس طرف آ گئی۔

"رجو تم جوس بنا کر توس سینک لینا، میں آملیٹ بنا کر پراٹھا بنالوں گی بڑے صاحب کے لیے، پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے آج۔" اس کے کانوں میں کچن سے آتی آوازیں پڑیں تو وہ آوازوں کی سمت بڑھی لیکن پھر دروازے میں ہی رک گئی۔

"ارے آپ یہاں؟" اس کو وہاں دیکھ کر شنو حیران ہوکر بولی۔ اس کی بات سن کر اورنج جوس بناتی رجو اور اسٹول پر بیٹھی تسبیح کرتی سکینہ بی نے بھی جھٹ سے آنکھیں کھول کر اس کو دیکھا۔ وہ کچھ نہیں بولی۔

"کچھ چاہیے تھا کیا آپ کو؟" سکینہ بی نے پوچھا۔

"مم...... میں بھی ناشتہ بنانے میں آپ لوگوں کی مدد کر دیتی ہوں۔" بیا نے ڈرتے ہوئے آملیٹ بناتی شنو سے کہا۔

"ارے نہیں چھوٹی بی بی آپ رہنے دیں، ہم خود کرلیں گی۔" وہ گھبرا کر جلدی سے بولیں۔

"چھوٹی بی بی؟" وہ بڑبڑائی۔

"جی بی بی شنو ٹھیک کہہ رہی ہے، اگر دارین صاحب کو پتا چلا تو وہ بہت غصہ ہوں گے۔" رجو نے جوس بنا کر فریج میں رکھتے ہوئے کہا۔

"وہ نہیں کہیں گے کچھ بھی...... میں کرلوں گی ویسے بھی مجھے فارغ رہنے کی عادت نہیں ہے۔"

"شنو...... شنو۔" تب ہی شاہانہ بیگم کی تیز آواز آئی، وہ شنو کو بلارہی تھیں، ان کی آواز سن کر شنو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جلدی سے ان کی طرف بھاگی، انابیہ چولہے کے پاس آئی اور خاموشی سے آملیٹ بنانے لگی۔

"سکینہ بی میں ابھی آتی ہوں۔" رجو بھی توس سینکنے کے لیے ٹوسٹر میں رکھ کر باہر نکل گئی۔ اب کچن میں وہ اور سکینہ بی رہ گئی تھیں، اس نے آملیٹ پلیٹ میں نکال کر جلدی سے ٹوسٹر میں سے توس نکالے پھر پراٹھا بنانے کے لیے فریج میں سے آٹا نکالنے لگی، وہ یہ سب کام بہت تیزی سے کررہی تھی۔ جیسے وہ اپنے گھر میں کرتی تھی جبکہ سکینہ بی اس کو اتنی تیزی سے کام کرتے دیکھ کر حیران ہورہی تھیں، بیا کو اس گھر میں دیکھ کر ان کو اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ اب "شاہ ولا" کی قسمت چمکنے والی ہے کیونکہ اب اس کو بدلنے والی آ گئی تھی۔ ان کو دارین کی پسند بہت زیادہ پسند آئی تھی...... وہ ایسے ہی ٹکٹکی باندھے بیا کو دیکھ رہی تھیں، تب ہی ریک سے کفگیر اٹھاتے ہوئے اس کی نظر سکینہ بی پر پڑی تو وہ چونکی۔

"کیا ہوا...... آپ ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟"

"کچھ نہیں بیٹا۔" وہ مسکرا کر بولیں۔

"پھر بھی کچھ تو ہے، بتائیں ناں پلیز؟" وہ ذرا سا مسکرا کر دھیمے لہجے میں بولی۔

"میں تو دارین بیٹے کی پسند دیکھ رہی ہوں...... اس نے ہیرا چنا ہے ہیرا...... اللہ تعالیٰ نظر بد سے بچائے۔" انہوں نے اس کی تعریف کی، لیکن وہ تو ان کے منہ سے نکلنے والے لفظ "پسند" پر ہی الجھ گئی تھی۔

"آمین۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔

"میں دارین اور زین کی آیا ماں ہوں، بہت زیادہ عزت کرتے ہیں وہ دونوں میری۔" انہوں نے اس کو اپنے بارے میں بتایا۔ وہ خاموش کھڑی رہی۔

"کیا ہوا؟" سکینہ بی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونکی تھی۔

❀ ❀

اس کو شاہ ولا آئے تین دن ہوگئے تھے اور ان تین دنوں میں اس کا معمول بن گیا تھا کہ وہ صبح سویرے اٹھ کر نماز پڑھ کر قرآن پاک کی تلاوت کرتی اور پھر کچن میں چلی آتی، وہ رجو اور شنو کی مدد سے ناشتہ تیار کر کے پھر سے اپنے کمرے میں آجاتی تھی یہ بھی شکر تھا کہ ابھی تک گھر میں کسی کو معلوم نہیں ہوا تھا کہ ناشتہ وہ بناتی ہے، ان تین دنوں

میں سکینہ بی سے اس کی کافی دوستی ہوگئی تھی۔ رجو اور شنو کو بھی انابیہ بہت زیادہ اچھی لگی تھی۔ وہ دونوں اس کے ساتھ ڈھیروں باتیں کرتیں اور وہ بھی اپنے نرم اور دھیمے لہجے میں ان کو جواب دیتی رہتی تھی۔

آج بھی اس نے معمول کے مطابق نماز پڑھ کر قرآن پاک کی تلاوت کی اور پھر نیچے آگئی۔ دارین ابھی سو رہا تھا، ان دنوں میں اس کو پتا معلوم ہوگیا تھا کہ دارین نماز نہیں پڑھتا، وہ کچن میں آئی اور ناشتہ بنانے میں مصروف ہوگئی تھی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" رمل کی آواز پر انابیہ اور سکینہ بی نے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ رمل بی بی......"

"چپ کرو تم...... میں ابھی جا کر شاہانہ مام کو بتاتی ہوں۔" وہ کہہ کر کچن سے نکل گئی، سکینہ بی اور وہ جلدی سے اس کے پیچھے باہر نکلیں۔

"شانہ مام...... شانہ مام؟" وہ اونچی آواز میں ان کو پکارتی ہوئی لاؤنج میں آئی۔

"کیا ہوگیا رمل، ایسے کیوں چیخ رہی ہو؟" رومانہ بیگم منہ بگاڑتی ہوئی اپنے کمرے سے نکلی، اس کی آواز سن کر ان کی نیند خراب ہوگئی تھی، اس لیے ان کا منہ بنا ہوا تھا۔

"کیا ہوا رمل میری جان؟" شاہانہ بیگم بھی اپنے کمرے سے نکل آئیں، ان کے پیچھے حیدر علی شاہ بھی، وہ سب سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"یہ آپ مجھ سے نہیں۔ اپنی اس سو کالڈ بہو انابیہ سے پوچھیں اور سکینہ بی سے۔" وہ بیا کو غصے سے گھورتے ہوئے بولی۔

"کیا ہوا، کیا مصیبت آگئی ہے، پہلے کیا اس گھر میں تھوڑے تماشے ہوتے جواب تم لوگ بھی اس میں شامل ہوگئے ہو؟" حیدر شاہ نے غصے سے کہا اور بیا کی طرف دیکھا جو سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔

"آپ چپ کریں شاہ صاحب اور آپ بتائیں سکینہ بی کیا بات ہے؟" شاہانہ بیگم جھنجھلا کر سکینہ بی سے بولیں۔

"وہ بڑی بیگم صاحبہ بات اتنی سی ہے کہ چھوٹی بہو جب سے آئی ہیں۔ تب سے وہ کچن میں آکر ناشتہ بنانے میں مدد کرتی ہیں۔ آج رمل بی بی نے انہیں کچن میں دیکھ لیا اور بس......" انہوں نے ایک نظر رمل کو دیکھا اور پھر پوری بات شاہانہ بیگم کے گوش گزار کردی۔

"تو اس میں کون سی بری بات ہے اگر اس نے ناشتہ بنا ہی دیا ہے تو وہ اس گھر کی بہو ہے۔" حیدر علی شاہ بولے۔ بیا نے چونک کر ان کی طرف دیکھا، اب اس کو کچھ حوصلہ ہوا تھا۔

"یہ آپ کے لیے بڑی بات نہیں ہوگی لیکن میرے لیے ہے، میں اس لڑکی کے ہاتھوں کا پکا ہوا نہیں کھا سکتی۔" شاہانہ بیگم غصے اور حقارت سے بولیں۔ انابیہ نے ان کی طرف دیکھا، ان کی سوچ کے بارے میں جان کر اس کو بہت دکھ ہوا۔

"کیوں...... کیا ہے اس کے ہاتھوں کو؟ کیوں نہیں کھا سکتیں آپ مسز شاہ؟" دارین بھی ان سب کی آوازیں سن کر کمرے سے باہر نکل آیا اور شاہانہ بیگم کی آخری بات سن کر غصے سے بولا۔

"کیونکہ میں نہیں مانتی اس کو اپنی بہو۔" وہ غصے سے چلائیں۔

"آپ کے ماننے یا نا ماننے سے فرق نہیں پڑتا مسز شاہ، بیا میری بیوی ہے اور اس گھر کی مالکن بھی، وہ یہاں جو بھی کرنا چاہے کرے اس کو ہر چیز کی آزادی ہے۔" اس نے بھی ان کو دوبدو جواب دیا۔

"میں بھی دیکھتی ہوں یہ لڑکی کب تک ٹکتی ہے یہاں۔" وہ غصے سے چلائیں۔

"دراین بیا کو لے کر کمرے میں جاؤ...... صبح صبح ہی دماغ خراب کر کے رکھ دیا، جاؤ باقی سب بھی یہاں سے اپنا کام کرو۔" حیدر علی شاہ نے ماں اور بیٹے کو الجھتے دیکھ کر بات ختم کرنے کے لیے کہا، وہ یہ بات جانتے تھے کہ ناشتہ بیا بنانی تھی کیونکہ انہوں نے اسے ایک دوبار کچن سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔ دارین بیا کو لے کر کمرے میں چلا گیا اور رمل

تلملا کر رہ گئی تھی۔

٭……٭……٭

بیا کو گھر سے گئے ہوئے تقریباً چار ماہ ہو گئے تھے…… اس دن جب وہ واقع پیش آیا، جس نے بیا کو گھر سے بھاگنے پر مجبور کیا تھا۔ اس دن نائمہ اور عابدہ مامی جلدی گھر آ گئی تھیں۔ ان کو بھاگتے وقت بیا نے دیکھا ہی نہیں تھا، جب وہ دونوں اندر آئیں تو اسرار بے ہوش پڑا تھا، اس نے ہوش میں آنے کے بعد بیا کے خلاف سب کو جھوٹی کہانی سنائی تھی، جس پر عابدہ مامی کو اعتبار تھا لیکن نائمہ بہت اچھے سے جانتی تھی کہ اسرار احمد جھوٹ بول رہا ہے۔ عابدہ مامی نے اسے محلے میں بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی…… سارے محلے والوں کی زبان پر بیا کے بھاگ جانے کی خبر تھی۔ جو کوئی بھی عابدہ سے بیا کے بارے میں پوچھتا وہ ساری کہانی شروع سے لے کر آخر تک سنا دیتی تھیں۔ اس سارے قصے سے انہوں نے اپنے داماد کو ایسے نکال لیا تھا جیسے دودھ میں سے بال نکالا جاتا ہے لیکن زرینہ خالہ، عاشی اور نائمہ کو یقین نہیں آیا تھا کہ بیا ایسا کر سکتی ہے، وہ تینوں ہی اسرار احمد کی گھڑی ہوئی کہانی ماننے کے لیے تیار نہیں تھیں لیکن عابدہ نے داماد پر یقین کر کے ان دونوں ماں بیٹی کو بھی اس سارے قصے میں گھسیٹ لیا تھا، وہ بیچاریاں بھی محلے والوں سے منہ چھپاتی پھر رہی تھیں، صفدر علی کو بھی عابدہ نے اتنا زیادہ بھرا تھا کہ وہ بھی بیا کا نام تک نہیں سننا چاہتے تھے…… ان کی محلے میں خوب بے عزتی ہوئی تھی۔ اس واقعے کے بعد صفدر علی نے دوسرے شہر جانے سے معذرت کر لی اور گھر بھی جلدی آنا شروع کر دیا تھا۔

ان چار مہینوں میں جہاں بہت کچھ بدلا تھا وہیں ایک بات بہت اچھی ہوئی تھی اور وہ یہ تھی کہ رائمہ کی بہت اچھے گھرانے میں شادی ہو گئی تھی۔ اس کا رشتہ صفدر علی کے ایک کولیگ حسن احمد کے توسط سے ہوا تھا، اسفر کے والدین وفات پا چکے تھے۔ بس ایک بڑی بہن تھی وہ بھی شادی شدہ۔ اسفر خود ایک بہت اچھی کمپنی میں ملازمت کرتا تھا۔ وہ سانولی رنگت کا خوش شکل اور خوش اخلاق نوجوان تھا، ان کا رشتہ آناً فاناً طے ہوا پھر چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا تھا، رائمہ کو بھی اس رشتے سے کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ لڑکا بہت اچھا، سمجھدار اور سلجھا ہوا۔ اچھا کھاتا، کماتا تھا اور وہ خود بھی اس گھر سے نکلنا چاہتی تھی، اس گھر میں اب اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ بیا نے گھر کیوں چھوڑا تھا؟ اس کی اصل وجہ کسی کو پتا نہیں تھی اور نہ ہی کسی نے جاننے کی کوشش کی تھی لیکن رائمہ جانتی تھی اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ غلط ہوا تھا جو وہ یوں انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہوئی تھی…… اس نے سوچ لیا تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ بیا کو ضرور ڈھونڈ نکالے گی…… وہ اس کو بہت یاد کرتی تھی اور اس کے لیے بہت اداس تھی۔

٭……٭……٭

”بیا آپ کی کافی۔“ وہ اپنے کمرے میں کاؤچ پر بیٹھا نجانے کن خیالوں میں گم تھا، جب بیا نے کافی کا کپ اس کے آگے رکھ کر اسے متوجہ کیا۔

”ہوں ہاں…… کچھ نہیں۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”کیا سوچ رہے ہیں آپ؟ بتائیں۔“

”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ مسز اکرم اور رِیل پہلے تو صرف ایک ہفتے کے لیے آتی تھیں لیکن اب چار ماہ ہونے کو ہیں وہ یہاں سے گئیں نہیں، کچھ تو گڑبڑ ضرور ہے، کوئی نہ کوئی کھیل تو ضرور کھیل رہی ہیں یہ دونوں ماں بیٹی۔“ اس نے کہا۔

”مطلب وہ لوگ شروع سے اس گھر میں نہیں رہتیں؟“ بیا نے تعجب سے پوچھا وہ تو یہی سمجھتی تھی کہ وہ دونوں ماں بیٹی شروع سے ہی اسی گھر میں رہتی ہیں۔

”نہیں…… وہ کراچی رہتی ہیں لیکن ہر ہفتے یہاں ہوتی ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”اوہ اچھا…… میں تو سمجھی وہ یہاں ہی رہتی ہیں۔“

”نہیں یار ان کا یہ آنے جانے والا ڈراما لگا ہے رہتا ہے لیکن اس بار مجھے گڑبڑ لگ رہی ہے۔“ وہ پرسوچ انداز میں بولا۔

"کیا پتا جو آپ سوچ رہے ہیں ویسا نہ ہو۔"

"ایسا ہی ہے جیسا میں سوچ رہا ہوں اور آپ بھی دیکھ لینا۔ بہت شاطر ہیں یہ دونوں میں انہیں بہت اچھے سے جانتا ہوں، بہت لوٹ چکی ہیں یہ مسز شاہ کو۔" وہ تلخی سے بولا اور سیل اٹھا کر کوئی نمبر ملانے لگا، بیا خاموشی سے اس کو دیکھتی رہی، وہ بلیک شلوار سوٹ میں ملبوس آستین کہنیوں تک فولڈ کیے، رف حلیے میں بھی بڑا خوب صورت لگ رہا تھا۔

"علی دارین بات کر رہا ہوں ایک کام کر مجھے ... لوگوں کے بارے میں انفارمیشن چاہیے کل تک...... دو کے میں ان کے نام اور پکس سینڈ کر دیتا ہوں۔" کال منقطع کر کے اس نے رمل اور رومانہ بیگم کے نام اور پکس واٹس ایپ کیے اور پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھے بڑی فرصت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا...... ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟" اس نے بیا کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔

"کک...... کچھ بھی نہیں...... آپ کافی پی لیں ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" اپنی چوری پکڑی جانے پر اس کی نظریں جھک گئیں اور چہرہ خفت کے مارے لال ہو گیا تھا۔ وہ خود کو ڈپٹتی جلدی سے وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

❁ ❁ ❁ ❁

"کیا ہوا ماما...... کس کا فون ہے؟" رمل نے رومانہ بیگم کو فون پر کسی سے الجھتے دیکھ کر تشویش سے پوچھا۔ وہ ابھی تیار ہو کر ان کے کمرے میں آئی تھی۔ آج صبح سے ہی وہ دونوں گھر پر تھیں لیکن اب انہوں نے کسی پارٹی میں جانا تھا۔ شاہانہ بیگم کے ساتھ۔

"ان ہی لوگوں کا فون تھا۔" کال بند کر کے وہ اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"واٹ...... کیا کہہ رہے تھے وہ؟" یک دم سے اس کے چہرے کا رنگ بھی بدلا۔

"کہنا کیا ہے، دھمکیاں دے رہے تھے کہ اگر دو دن کے اندر اندر ہم نے ان کے پیسے نہ دیئے تو وہ سیلون اور بوتیک سیل کر دیں گے۔" انہوں نے تشویش سے کہا۔

"اوہ نو ماما...... اب کیا ہوگا؟" اپنا ذاتی بوتیک اور سیلون بنانا اس کا بچپن کا خواب تھا جو کہ بہت مشکل سے پورا ہوا تھا اور اب وہ اسے ایسے ختم ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

"کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا رمل...... نہیں تو سب کچھ ختم ہو جائے گا اور ہم سڑک پر آ جائیں گے۔" وہ پریشانی سے ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے بولیں۔

"ایک تو یہ کم بخت شاہانہ بھی میری بات نہیں سن رہی، مجھے ہی ایٹی ٹیوڈ دکھا رہی ہے اور مسلسل نظر انداز کر رہی ہے۔" اب وہ غصے میں اپنی پرانی ٹون میں واپس آ کر شاہانہ بیگم کو کوسنے لگیں۔

"واٹ...... ! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ ماما؟" اس نے ماں کا ایسا روپ پہلی بار دیکھا تھا اس لیے تعجب سے کہا۔

"صحیح تو کہہ رہی ہوں؟" رومانہ بیگم نے غصے سے تیوری چڑھا کر کہا۔

"ایک طرف تو آپ شانہ مام سے اتنی محبت جتاتی ہیں اور دوسری طرف آپ کا یہ انداز...... ایسے کیوں ماما ایم شاکڈ؟" اس نے الجھ کر سوال کیا۔

"وقت آنے پر سب کچھ بتا دوں گی تمہیں، لیکن ابھی نہیں۔" وہ تیکھے لہجے میں بولیں اور رک کر کچھ سوچنے لگیں۔

رومانہ بیگم نے اپنے کسی جاننے والے سے بہت بڑی رقم ادھار لے کر گورنمنٹ کو ٹیکس ادا کیا تھا لیکن ان کو اتنی بڑی رقم واپس نہیں کر سکی تھیں، وہ لوگ اپنی رقم لینے کے لیے بار بار انہیں کالز کرتے تھے، ان کے گھر آتے لیکن ہر بار ہی وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے انہیں ٹال دیتیں لیکن جب انہوں نے روز روز ان کے دروازے پر آنا شروع کیا تو رومانہ بیگم ڈر گئیں اور کراچی چھوڑ کر شاہانہ بیگم کے پاس آ گئیں، یہاں آ کر وہ دارین کو پھانسنا چاہتی تھیں تاکہ اس سے رقم نکلوا کر قرض اتار سکیں پر یہاں معاملہ ہی الٹ گیا تھا اور آج ان لوگوں کی پھر کال آئی تھی اور اب وہ لوگ دھمکیوں پر اتر آئے تھے کہ "اگر دو دن میں انہوں نے

ساری رقم نہ لوٹائی تو وہ لوگ ان کی بوتیک اور سیلون نیلام کر دیں گے۔" شاہانہ بیگم ہر ماہ بہت بڑی رقم انہیں بوتیک اور سیلون کے لیے دیتی تھیں۔ وہ دونوں اس کو بھی اپنی عیاشیوں میں اڑا جاتیں اور پھر سے اس کے پاس دوڑی آتیں۔

"آپ ابھی اور اسی وقت بتائیں مجھے۔ ایسی کون سی بات ہے جو آپ مجھ سے چھپا رہی ہیں۔" اس نے اصرار کیا۔

"تو پھر سنو...... میں شاہانہ سے نفرت کرتی ہوں، شدید ترین نفرت۔" انہوں نے حقارت سے کہا تو رُبل کو شاک لگا۔

"واٹ...... یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ آپ تو شاہانہ مام سے بہت پیار کرتی ہیں پھر یہ نفرت کہاں سے آ گئی۔"

"وہ سب جھوٹ اور دکھاوا ہے۔"

"لیکن کیوں؟ کوئی تو وجہ ہوگی۔" وہ ان کی باتوں سے بہت حد تک پریشان ہو چکی تھی۔

"ہاں بہت بڑی وجہ ہے، میں اس کو کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ اس نے مجھ سے میری خوشیاں، میرا پیار، میرا سب کچھ چھین لیا۔" آج انہوں نے رُبل کے سامنے اپنا راز فاش کر ہی دیا تھا۔

"پیار، خوشیاں، میں سمجھی نہیں؟ آپ مجھے صاف صاف بتائیں پلیز۔" وہ ماں کی بھید بھری باتیں سن کر چڑ کر بولی۔

"میں، شاہانہ اور حیدر علی تینوں کلاس فیلو تھے۔ یہ دونوں بہت امیر تھے، میں تھی تو شاہانہ کی کزن لیکن والد کے انتقال کے بعد شاہانہ کے گھر آ گئی تھی اور اس کے ٹکڑوں پر پل رہی تھی۔ ہر چیز اس کی استعمال کرتی تھی لیکن یہ مجھے شروع سے ہی اچھی نہیں لگتی تھی...... مجھے اس جلن اور حسد محسوس ہوتا تھا کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ پیاری تھی اور امیر بھی پھر بھی میری مجبوری تھی اس کے ساتھ رہنا، اس کے علاوہ ہمارے پاس اور کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ پھر یونیورسٹی میں مجھے حیدر علی سے محبت ہو گئی، وہ ہمارا کلاس فیلو ہونے کے ساتھ ساتھ انکل (شاہانہ کے پاپا) کے بیسٹ فرینڈ اور بزنس پارٹنر کا اکلوتا بیٹا بھی تھا، میں نے اس بارے میں شاہانہ کو بتایا اور یہی میری بے وقوفی تھی۔ ان کی شروع سے ہی آپس میں نہیں بنتی تھی۔ اسی وجہ سے شاہانہ نے مجھے بھی روک دیا کہ میں حیدر کو اپنی فیلنگز کے بارے میں نہ بتاؤں، میں بھی اس کی باتوں میں آ گئی لیکن پھر جب ان دونوں کے گھر والوں نے ان کا رشتہ طے کیا تو شاہانہ نے سب کچھ جاننے اور میرے روکنے کے باوجود بھی حیدر سے شادی کے لیے ہاں کر دی...... میں نے بہت روکا شاہانہ کو، لیکن اس نے باپ کی ضد مان لی اور بیاہ کر "شاہ ولا" چلی آئی، اس دن مجھے اس سے شدید نفرت ہو گئی اور میں اس سے ہر تعلق ختم کر کے کراچی چلی گئی، وہاں جا کر میں نے تمہارے پاپا سے شادی کر لی۔ شاہانہ کو شادی کے بعد جب پتا چلا کہ میں اس سے ناراض ہو کر سب کچھ چھوڑ کر چلی گئی ہوں تو وہ مجھے منانے میرے پیچھے کراچی آئی تھی۔ میں بڑی مشکل سے مانی اور ساتھ ہی میں نے اس سے بدلہ لینے کا پلان بھی تیار کر لیا تھا، تمہارے پاپا مجھ سے بہت پیار کرتے تھے لیکن مجھ سے انہوں نے گھر والوں کے خلاف جا کر شادی کی تھی تو ان کو باپ نے جائیداد سے عاق کر دیا اور وہ پوری طرح سے کنگال ہو گئے تھا۔ میرے تمہارے پاپا سے جھگڑے شروع ہو گئے اور پھر میں نے خود ہی ان سے طلاق لے لی لیکن میں نے شاہانہ کو یہی بتایا کہ اکرم بہت برے تھے مجھ پر ظلم و ستم کرتے تھے۔ اس نے میری بات پر یقین کر لیا، مجھے اس بات کا بھی پتا تھا کہ شاہانہ اور حیدر کی شادی کے بعد بھی نہیں بنتی، میں نے اس بات کا فائدہ اٹھایا اور پلان کے مطابق اس کو حیدر کے خلاف کرنا شروع کر دیا اور وہ اتنی بیوقوف تھی میری ہر بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کرتی گئی، اس کا اپنا بیٹا دارین بہت زیادہ خوب صورت تھا لیکن میں نے اس کو شوہر سے تو دور کیا ہی کیا اس کے بیٹے سے بھی دور کر دیا اور پلان کے مطابق اس کو تمہارا دیوانہ بنا دیا اور پھر جو میں کہتی گئی وہ کرتی گئی،

اس نے مجھ سے میرا پیار چھینا تھا، میں نے اس سے اس کا بیٹا اور شوہر سب کچھ دور کردیا۔ اب ان تینوں میں اتنی دوریاں ہیں جن کو وہ چاہ کر بھی ختم نہیں کرسکتے اور دیکھو ہمارا کام بھی ہورہا ہے۔ ہم بھی عیش کررہے ہیں، ورنہ تمہارے باپ کے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی ہمیں دینے کے لیے اور ہم کب سے مر کھپ گئے ہوتے۔" رومانہ بیگم نے آہستہ آہستہ اپنے ماضی سے پردہ اٹھایا جبکہ وہ سب کچھ سن کر حیران رہ گئی تھی، اس کی ماں نے اتنی بڑی پلاننگ کی تھی جس کی اس کو بھی کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔

"لیکن ماما...... شانہ مام تو آپ کو اپنی سگی بہنوں سے بھی بڑھ کر پیار کرتی ہیں۔" اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

"ہونہہ کرتی رہے مجھے کیا...... مجھے تو اس سے نفرت تھی، نفرت ہے اور نفرت ہی رہے گی۔" وہ حقارت سے بولی جبکہ دروازے کے باہر کھڑی شاہانہ بیگم جو نک سک تیار ہوکر ان دونوں کو بلانے آئی تھیں، وہ ان کی باتیں سن کر دروازے پر ہی پتھرا گئی تھیں۔ ان کا چہرہ دھواں دھواں اور قدم من من بھاری ہوگئے تھے، وہ تو ہلنے سے بھی قاصر تھیں، کوئی اتنا زیادہ بھی گر سکتا ہے۔ اس بات کا اندازہ انہیں آج ہوا تھا۔ ان کے ساتھ کھڑی بیا کی بھی یہی حالت تھی...... وہ کب وہاں آئی تھی انہیں اس بات کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔

"اُفف...... ماما اتنی نفرت...... مجھے یقین نہیں ہوتا۔" وہ تحیر بھری نظروں سے ماں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"نہیں ہوتا یقین تو بھی کرلو کیونکہ یہی سچ ہے۔" رومانہ بیگم بے تاثر لہجے میں بولیں اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اُفف...... میرے اللہ اتنا بڑا دھوکا۔" شاہانہ بیگم نے دیوار کا سہارا لیا تو ان کو ایسے لڑکھڑاتے دیکھ کر بیا نے سرعت سے آگے بڑھ کر ان کو کندھوں سے تھاما۔

"پلیز سنبھالیں خود کو؟"

"لیکن ماما میں دارین سے سچ میں بہت پیار کرتی ہوں۔" اس نے ماں کا ہاتھ اپنے کندھوں سے جھٹک کر تیکھے لہجے میں کہا۔

"لیکن وہ نہیں کرتا...... یونو تم بھی چھوڑو پیار ویار میں کیا رکھا ہے۔ ہمارے لیے ہمارا کام زیادہ ضروری ہے، جس کے لیے ہم چار ماہ سے یہاں ہیں۔" وہ اس کو سمجھاتے ہوئے بولیں۔

"کیا کام ماما؟" اس نے بھنویں سکیڑ کر تعجب سے پوچھا، وہ نہیں جانتی کہ کیا کرنا تھا اب آگے۔

"یہی کہ تم نے کسی نہ کسی طریقے سے شاہانہ سے پچاس لاکھ کا چیک لینا ہے، یہ سب تم کیسے کرو گی یہ تو تم بھی اچھی طرح سے جانتی ہو۔" رومانہ بیگم نے شاطرانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ہمم......" وہ بھی مسکرائی۔

"گڈ...... ویسے کافی تیز ہو تم بھی۔" رومانہ بیگم نے آنکھ مار کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"آخر بیٹی کس کی ہوں۔" اس نے بھی سر جھٹک کر ایک ادا سے کہا اور پھر دونوں ہی قہقہہ لگا کر ہنس دیں۔ اس بات سے بے خبر کہ باہر بیا اور شاہانہ بیگم ان کی ساری باتیں سن چکی ہیں۔ بیا حیران اور بے یقین سی کھڑی تھی، وہ تو یہی سمجھتی تھی کہ صرف غریب لوگ ہی پیسوں کے پیچھے بھاگتے ہیں لیکن یہاں تو سارا کا سارا جہاں ہی فریب، مکاری اور دھوکا دہی پر لگا ہوا تھا۔

"آپ چلیں یہاں سے پلیز۔" اس نے شاہانہ بیگم کو بہ مشکل سہارا دے کر ان کے کمرے میں لے جانا چاہا۔

"چھوڑو مجھے بیا۔" انہوں نے ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ چھڑوائے اور خود کو سنبھال کر اشتعال سے دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوگئیں۔

"واہ...... واہ...... کیا خوب ایکٹنگ کرتی ہو تم رومانہ، تمہیں تو بہترین اداکارہ کا ایوارڈ ملنا چاہیے، میں تو تمہاری ایکٹنگ کی فین ہوگئی ہوں سچی۔" انہوں نے تالی بجا کر طنزیہ لہجے میں ان کو داد دیتے ہوئے کہا اور رمل کے عین

مقابل جا کر رک گئیں۔ وہ دونوں دم سادے شاہانہ بیگم کو دیکھنے لگیں۔

"ارے شش...... شانہ مام آ......" رمل نے خوشامدی لہجے میں کچھ بولنا چاہا۔

"چٹاخ......" شاہانہ بیگم کا بھاری ہاتھ اٹھا اور اس کے چہرے پر نشان چھوڑ گیا، وہ جو اس کے لیے تیار نہیں تھی لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہوئی اور اپنے گال پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی، یہی حال بیا اور رومانہ کا بھی تھا، رومانہ جیسی شاطر عورت کو بھی گڑبڑ کا احساس ہوا...... وہ بھی خود کو سنبھال کر شیریں لہجے بولیں۔

"کیا ہوا شانہ میری جان...... اتنے غصے میں کیوں ہو؟"

"جسٹ شٹ اپ رومانہ وہیں رک جاؤ اور خبردار جو تمہاری گندی زبان پر میرا نام بھی آیا ورنہ تمہارا بھی وہی حشر کروں گی جو تمہاری بیٹی کا کیا ہے۔" انہوں نے شعلہ بار نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا اور ہاتھ کے اشارے سے اس کو اپنے پاس آنے سے بھی روکا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔" وہ چہرے پر معصومیت لیے سارے اگلے پچھلے ریکارڈ توڑ کر بولیں۔

"اف...... اتنی بھولی نہیں ہو تم، جو تمہیں میری بات سمجھ ہی نہیں آئی...... میں تمہاری ساری بکواس سن چکی ہوں، تم لوگ اتنے گھٹیا اور گرے ہوئے ہو یہ مجھے آج پتا لگا، رومانہ تم تو میری آستین کا وہ سانپ ہو، جس کو میں نے ساری زندگی دودھ پلایا، لیکن تو پھر بھی ڈسنے سے باز نہیں آئی۔" وہ انتہائی غصے سے جو منہ میں آ رہا تھا بول رہی تھیں۔ رمل اور رومانہ کے تو ہوش ہی اڑ گئے، ان کا ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔

"شانہ مام پلیز آپ پہلے ریلیکس ہو جائیں پھر بات کرتے ہیں، شاید آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" رمل اپنا درد بھول کر ایک بار پھر سے ان کو ٹھنڈا کرنے کی ناکام سی کوشش کرنے لگی۔

"بکواس بند کرو...... مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی رمل اور رومانہ تم کیا نفرت کرو گی مجھ سے، میں تو تمہیں اپنی نفرت کے قابل بھی نہ سمجھوں، ابھی تک تم نے میرا پیار دیکھا ہے نفرت نہیں۔" وہ اس کو جواب دے کر ایک جھٹکے سے رومانہ بیگم کی طرف مڑیں اور اس کا سرتاپا جائزہ لینے کے بعد حقارت سے بولیں۔

"نکل جاؤ تم دونوں میرے گھر سے، میرے گھر میں تم جیسے گھٹیا اور دھوکے باز لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔" انہوں نفرت بھری نظر دونوں پر ڈال کر گھر سے نکلنے کا حکم جاری کیا۔ رومانہ اور رمل نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کا گیم الٹ گیا تھا اور اب سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔

"لل...... لیکن شاہانہ ہم......" رومانہ بیگم نے روتے ہوئے ایک آخری کوشش کرنی چاہی۔

"بس رومانہ بہت سن لی میں نے تمہاری...... اب اور نہیں۔" وہ غصے سے کہتیں تیزی سے مڑیں، بیا جوان کے عین پیچھے کھڑی باتیں سن رہی تھی، وہ جلدی سے ایک طرف ہوئی۔ انہوں نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔ وہ ڈر کر خود میں سمٹ گئی۔

"رجو...... شنو...... سکینہ بی، کہاں ہو سب کی سب؟" وہ ان کے کمرے سے نکل کر غصے سے اونچی آواز میں رجو، شنو اور سکینہ بی کو پکارتی لاؤنج میں آئیں، وہ تینوں بھی ان کی غصے بھری آواز سن کر دوڑی آئی تھیں۔

"جج...... جی بڑی بیگم صاحبہ۔" رومانہ اور رمل بھی حواس باختہ سی ان کے پیچھے بھاگتی ہوئی آئیں، وہ کسی نہ کسی طرح سے شاہانہ بیگم کو ایسا کرنے سے روکنا چاہتی تھیں۔

"بلوائیں گارڈز کو اور نکالیں ان دونوں کو یہاں سے۔ اب میں ان کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔" انہوں نے ایک نیا حکم جاری کیا اور خونخوار نظروں سے دونوں کو گھورا، شرم کے مارے ان کی نظریں زمین میں گڑھ گئیں، جن ملازموں کی وہ سب کے سامنے بے عزتی کرتی تھیں، آج انہی کے سامنے وہ دونوں بے عزت ہو رہی تھیں...... یہ

ان کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔
”لل...... لیکن ماما آپ ایک بار ان کی بات تو سن لیں۔ وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہیں...... کچھ کہنا چاہتی ہیں آپ سے۔“ کب سے خاموش کھڑی بیا نے بولنے کی ہمت کی، سکینہ بی نے بھی کچھ کہنا چاہا۔
”تم چپ رہو بیا تم نہیں جانتی ان کو، جو اتنے عرصے میں نہیں بدل سکیں وہ ایک پل میں کیسے بدل جائیں گی اور سکینہ بی میں نے جو کہا ہے آپ اس پر فوراً عمل کریں۔“ انہوں نے تھوڑا نرم لہجے میں کہا، اتنی غصے میں بھی انہوں نے بیا سے نرمی سے بات کی تھی وہ تو حیرت سے گنگ رہ گئی، اس نے آج دوسری بار شاہانہ بیگم کو اتنے غصے میں دیکھا تھا، وہ ان کے غصے سے خائف تھی۔
”یہ سارا تماشا جلدی ختم کرو، دارین، زین اور حیدر صاحب آنے والے ہوں گے...... رات تک یہ لوگ مجھے یہاں نظر نہ آئیں۔“ انہوں نے ایک اچٹتی نگاہ ان پر ڈال کر سکینہ بی سے دوبارہ کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں...... غصے سے ان کے دماغ کی رگیں پھٹنے والی ہو رہی تھیں، انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی ایسا وقت بھی آئے گا اور وہ جان سے پیاری دوست کو شام کے وقت گھر سے نکالیں گی اس طرح۔
”شاہانہ میری بات تو سنو......“ رومانہ بیگم ان کی پیچھے آئیں۔
”یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے آپ لوگوں نے، جب وہ آپ کی شکل ہی نہیں دیکھنا چاہتی تو پھر کیوں جا رہی ہیں آپ ان کے پیچھے، پلیز ابھی چلی جائیں یہاں سے۔“ بیا نے آہستہ سے کہا، اس کی بات پر رُبل کے تو تلوؤں سے لگی اور سر پر بجھی وہ تن فن کرتی اس کے سر پر پہنچ گئی۔
”تم اپنی بکواس بند کرو بجی۔“
”رسی جل گئی پر بل نہیں گئے، سچ کہہ رہی تھیں ماما تم لوگ کبھی نہیں سدھر سکتیں۔“ بیا نے ان کی حالت پر افسوس کرتے ہوئے کہا۔ رومانہ بیگم تو سب نوکروں کے سامنے اتنی تذلیل اور بے عزتی کے بعد اب رونے لگی تھیں۔
”اب رو کیوں رہی ہیں ماما...... یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے، اب بھگتیں اور کریں پلاننگ سب کچھ ختم ہو گیا اب۔ سڑکوں پر آ گئے ہیں ہم۔ کچھ نہیں بچا اب ہمارے پاس۔“ رُبل شعلہ بار نظروں سے ماں کو گھورتی اول فول بکتی وہاں سے چلی گئی۔ اس نے تاسف سے رومانہ بیگم کی ایسی اجڑی ہوئی حالت دیکھی تو اس کو افسوس ہوا تھا۔

❀......❀......❀

رات کو وہ کافی لیٹ گھر آیا تھا۔ اس نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا چونک گیا اور وہیں رک گیا۔ وہ صوفہ پر گم صم بیٹھی تھی۔ اسے دارین کے آنے کی خبر بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔
”کیا ہوا...... ایسے کیوں بیٹھی ہیں آپ؟“ وہ اس کو ایسی حالت میں دیکھ کر کافی پریشان ہوا لیکن اس کے وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ وہ فکرمندی سے اس پر جھکا اور اس کے چہرے کو تھپتھپا کر پوچھا۔
”طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟“ اس نے تھوڑا سا سر اٹھا کر دارین کی طرف دیکھا۔ اس کو اپنے لیے فکرمند دیکھ کر بیا نے اپنے آنسو صاف کیے۔
”کیا ہوا، رو کیوں رہی ہیں آپ؟ کچھ بتائیں تو سہی پلیز۔“ اس نے بیا کے بالوں میں آہستہ سے ہاتھ پھیرتے ہوئے ملائمت سے کہا۔
”دکھ ہو رہا ہے مجھے۔“ وہ دھیرے سے بولی۔
”کس بات کا دکھ؟“
”یہ دیکھ کر کہ کوئی اتنا دھوکے باز کیسے ہو سکتا ہے۔“
”کیا مطلب...... میں سمجھا نہیں، کس دھوکے کی بات کر رہی ہیں آپ؟ صاف صاف بتائیں۔“ وہ اس کی باتوں سے الجھا۔
”دھوکے کا انجام یہی ہوتا ہے دارین، جو ان لوگوں کا ہوا۔“ وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔
”کن کا انجام...... گھر میں کچھ ہوا ہے کیا؟“
”جی۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

''رمل نے پھر سے کچھ کہا؟ پہلیاں نہ بجھوائیں مجھے ٹینشن ہورہی ہے۔'' وہ اس کو اپنے ساتھ لگائے فکر مندی سے پوچھ رہا تھا۔

''نہیں...... وہ دونوں تو چلی گئیں۔'' اس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ دارین کو تعجب ہوا، شام کو جو کچھ بھی ہوا تھا، اس کے بارے میں سوچ سوچ کر وہ اچھی خاصی پریشان تھی...... وہ نارمل لہجے میں بولا۔

''تو اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے، یہ تو اچھی بات ہے کہ انہیں چار ماہ بعد جانے کا خیال تو آیا۔''

''پریشانی والی بات ہے دارین...... کیونکہ وہ دونوں خود نہیں گئیں، بلکہ ماما نے انہیں خود گھر سے نکالا ہے۔''

''واٹ......! ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟'' اب کے اسے بھی شدید قسم کا جھٹکا لگا۔

''انہوں نے ماما کو دھوکا دیا ہے دارین جی۔'' پھر اس نے آہستہ آہستہ ساری بات تفصیل سے اس کو گوش گزار کردی۔

''اوہ...... مطلب مسز شاہ کو بھی ان کی اصلیت کا پتا چل ہی گیا۔'' ساری باتیں سننے کے بعد اس نے نارمل لہجے میں کہا۔ اس کو نارمل دیکھ کر ہیا کو حیرت ہوئی۔

''آپ اتنے نارمل کیسے رہ لیتے ہیں دارین؟ میں نے آپ کو اتنی بڑی بات بتائی اور آپ کو ذرا سی بھی حیرت نہیں ہوئی...... کیوں؟''

''کیونکہ مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ وہ دونوں کوئی نہ کوئی گیم ضرور کھیل رہی ہیں اور یہ بات میں نے آپ کو بھی بتائی تھی۔ دیکھیں ویسے ہی ہوا۔ اس لیے تو مجھے حیرت نہیں ہوئی، میں نے بہت بار مسز شاہ کو بھی وارن کیا تھا لیکن ان کی آنکھوں پر تو بہن اور بھانجی کی محبت کی پٹی بندھی ہوئی تھی...... انہیں کچھ نظر ہی نہیں آیا، ایسے تو پھر ہونا ہی تھا ناں۔'' وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''اوہ...... مطلب آپ کا شک سچ ہی نکلا۔''

''جی...... مجھے علی نے ان کی اصلیت کل ہی بتادی تھی۔''

''لیکن دارین جی سارا قصور ان کا بھی نہیں، کہیں نہ کہیں تو غلطی آپ لوگوں سے بھی ہوئی، انہیں تو بس موقع کی تلاش تھی جوان کو بڑی آسانی سے مل گیا۔'' وہ آہستہ سے گویا ہوئی۔

''شاید ایسا ہی ہے کیونکہ مسز شاہ نے کبھی پاپا پر یقین ہی نہیں کیا تھا، ان دونوں کی ساری زندگی لڑائی جھگڑوں اور ایک دوسرے کو نیچا دیکھانے میں گزر گئی، جبکہ میری زندگی وہ سب کچھ سنتے اور برداشت کرتے...... آپ نے ٹھیک کہا تھا اگر میں چاہتا تو ان دونوں کی دوریوں کو ختم کرنے کی کوشش کرسکتا تھا لیکن میں نے بھی ایسا نہیں کیا اور ان دونوں کو ہی ان کے حال پر چھوڑ دیا اور دیکھو آج ہم لوگوں کے درمیان ہزاروں میل کے فاصلے ہیں اور یہ سب ہماری ضدی طبیعت اور انا کی وجہ سے ہوا ہے۔'' وہ ملائمت سے بولا۔

''دارین آپ لوگ سارے اختلافات اور رنجشیں بھلا کر ایک ہوجائیں اور بھول جائیں ان لمحوں کو جنہوں نے آپ کو اذیت دی تھی، آپ آگے بڑھ کر اپنے ماما، پاپا کو سنبھال لیں، انہوں نے اپنی زندگی میں جو بھی کیا اس کا انہیں بھی پچھتاوا ضرور ہوگا...... پلیز ایک بار اپنی ضد چھوڑ کر ان کی طرف قدم بڑھائیں اور دیکھیں کتنی خوشیاں آپ کی منتظر ہیں۔'' اس نے دارین کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر رسانیت سے کہا۔ وہ بھی اس کی حالت سمجھ رہا تھا۔

''سب کچھ ایک پل میں بھول جانا آسان نہیں ہوتا ہیا۔'' وہ فقط اتنا کہہ کر خاموش ہوا، اس کے چہرے پر گزرے وقت کی داستان رقم تھی۔ جس کو چاہ کر بھی وہ نہیں بھول سکتا تھا، کچھ دیر ایک گہری خاموشی ان دونوں کے درمیان حائل رہی، جانتی تو وہ بھی تھی کہ اتنا سب کچھ ایک پل میں بھول جانا آسان نہیں تھا، لیکن ناممکن بھی نہیں تھا۔

''لیکن دارین ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔'' اس نے کہا۔

''میں ابھی فریش ہوکر آتا ہوں، پھر نیچے چلتے ہیں۔''

اس نے بات بدل کر کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"ویسے اس سارے ڈرامے کے بعد پاپا اور زین کا کیا ری ایکشن تھا؟" واڈ روب کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے اچانک رک کر پوچھا۔

"مجھے نہیں پتا..... آپ خود ہی نیچے جا کر پاپا سے پوچھ لیجیے گا۔" اس نے نروٹھے پن سے کہا اور منہ دوسری طرف پھیر کر بیٹھ گئی۔

"ارے اب آپ کو کس بات کا دکھ ستا رہا ہے، ان دونوں نے ماما کو دھوکا دیا اس بات کا یا انہوں نے ان کو گھر سے نکال دیا اس بات کا؟" اس نے شرارت سے مسکراتے ہوئے پوچھا، اتنے عرصے میں پہلی بار اس نے شاہانہ بیگم کو ماما کہا تھا۔ بیا کو خوشگوار حیرت نے گھیرا۔

"دونوں باتوں کا، نہ وہ دھوکا دیتیں اور نہ ہی ماما اتنا سخت قدم اٹھاتیں، وہ تو ان سے بہت پیار کرتی تھیں۔" وہ اداس لہجے میں بولی، شام سے ہی وہ اپنے کمرے میں بند تھی، جب وہ لوگ گھر سے گئی تھیں، تب بھی وہ نیچے نہیں آئی تھی، اس نے کھڑکی سے ان کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

"لیکن میرے خیال میں جو بھی ہوا اچھا ہی ہوا، شاید اب ماما کو ریلائیز ہو جائے کہ ساری عمر انہوں نے جو کیا وہ غلط تھا۔"

"جی انسان کو سنبھلنے کے لیے ایک ٹھوکر ہی کافی ہوتی ہے۔" وہ ہولے سے بولی۔ دارین باتھ روم میں گھس گیا لیکن وہ ویسے ہی بیٹھی رہی تھی۔

❀.....❀.....❀

"بات سنو۔" شاہانہ بیگم نے کچن سے نکلتی اناببیہ کو دیکھ کر دھیرے سے پکارا، وہ بھی ان کی آواز سن کر چپ چاپ ان کی طرف آ گئی۔

"جی کوئی کام تھا آپ کو؟" اس نے آہستہ سے پوچھا اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی، کل شام کے بعد وہ اس کو اب نظر آئی تھیں۔

"نہیں کام تو کوئی نہیں..... ایم سوری بیا میں نے تمہیں بہت ہرٹ کیا۔" انہوں نے کچھ توقف کے بعد نرم لہجے میں کہا۔ اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کی سرخ اور بوجھل آنکھیں رت جگے کی چغلی کھا رہی تھیں، ٹوٹا لہجہ اور بکھرا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ اب بھی کافی مضطرب ہیں، ان کی حالت دیکھ کر اسے افسوس ہوا۔

"آپ مجھ سے معافی مانگ کر مجھے شرمندہ نہ کریں، آپ دارین کی ماں ہیں اور میں ان سے جڑے ہر رشتے کی دل سے قدر کرتی ہوں چاہے پھر کوئی مجھے اچھا سمجھے یا برا۔" اس نے دھیرے سے جواب دیا۔ اس کو وہ پل یاد آ گئے جب اس نے اس گھر میں قدم رکھا تھا۔

"اتنا پیار کرتی ہو دارین سے؟" انہیں تعجب ہوا لیکن اس بات کی خوشی بھی ہوئی کہ دارین کو بہت پیار کرنے والی بیوی ملی۔

"جی لیکن پیار سے زیادہ میں ان پر اعتبار کرتی ہوں، ان کی عزت کرتی ہوں کیونکہ اس دنیا میں اللہ کے بعد ایک وہی تو میرا سہارا ہیں۔" اس نے اپنی آنکھوں میں آئی نمی کو پلک جھپک کر اندر دھکیلا اور دھیرے سے مسکرائی۔

"پھر بھی مجھے معاف کر دو میں اپنے گزشتہ رویے پر بہت شرمندہ ہوں، میں نے لوگوں کو سمجھنے میں بہت غلطی کی۔" شاہانہ بیگم نے اس سے اپنے گزشتہ رویے کی معذرت کی۔ انہیں بہت کچھ سمجھ آ چکا تھا۔

"مجھے آپ کے رویے سے کوئی شکوہ نہیں۔ تب حالات ہی ایسے تھے، آپ نے جو بھی کیا یا مجھ سے کہا وہ آپ کا حق تھا کیونکہ جس طرح میری اور دارین کی شادی ہوئی تھی، وہ برداشت کرنا کسی بھی ماں کے لیے مشکل ہوتا ہے اور آپ کا ایسے ری ایکٹ کرنا بنتا تھا۔" اس نے شاہانہ بیگم کے پاس بیٹھ کر ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر رسانیت سے کہا تو وہ خاموش رہیں۔

"ایک بات پوچھوں آپ سے؟"

"ہاں۔"

"آپ نے اتنی زندگی گزار دی پاپا کے ساتھ..... کیا آپ کو ان سے محبت نہیں ہوئی؟" اس کے سوال پر وہ

افسردہ سی مسکرائیں۔

''یہ محبت ہی ہے بیا جس نے آج تک مجھے ان کے ساتھ جوڑا ہوا ہے اور میں اس گھر میں موجود ہوں ورنہ یہ جائیداد سے عاق کردینے والی دھمکی میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی تھی، اگر میں چاہتی تو شادی کے بعد کسی بھی وقت حیدر سے طلاق لے سکتی تھی لیکن میں نے ایسا کچھ نہیں کیا اور نہ ہی میں کرسکتی تھی کیونکہ میں ان دونوں سے بہت پیار کرتی ہوں لیکن پھر حالات نے ایسا رخ اختیار کیا اور ہم سمجھ ہی نہ پائے اور یہ کیا سے کیا ہوتا گیا...... یہ بھی سچ ہے کہ میں نے پہلے حیدر سے شادی کرنے سے انکار کردیا تھا لیکن پھر اپنے بابا کی ضد کے آگے ہار مان لی تھی، میری شاہ صاحب سے نہیں بنتی تھی لیکن یہ سب تو شروع کی باتیں ہیں، بعد میں مجھے ان سے محبت ہوگئی تھی اور جب دارین پیدا ہونے والا تھا میں بہت خوش تھی، ان ہی دنوں رومانہ بھی میرے پاس آئی تھی، حیدر اس بات سے خوش نہیں تھے۔ اس کی وجہ سے ہمارے درمیان لڑائیاں ہونے لگیں اور ان کے مزاج میں اچانک ہی چڑچڑاپن آ گیا تھا...... وہ بات بات پر غصہ کرنے لگ گئے اور پھر کچھ دنوں بعد ہی انہوں نے دیر سے گھر آنا شروع کردیا تھا پھر ساری ساری رات گھر سے باہر رہنے لگے تھے۔ میں ان کی عادتوں سے تنگ آ گئی تھی پھر مجھے رومانہ نے مشورہ دیا کہ میں بھی باہر نکلوں، پارٹیز میں جاؤں، انجوائے کروں، میں نے بھی اس کی بات مان کر باہر نکلنا شروع کردیا اور پھر آہستہ آہستہ مجھے بھی گھر سے زیادہ باہر سکون ملنے لگا، پارٹیز اور فنکشنز میں جانا اچھا لگنے لگا اور جلد ہی میں بھی اس ماڈرن ورلڈ کا حصہ بن گئی...... جب دارین پیدا ہوا میں اس کو بھی بھول گئی صرف اور صرف ضد میں حیدر سے بدلہ لینے کے لیے میں نے اپنا گھر خراب کرلیا، نہ میں نے ان سے وجہ پوچھی ان کے چڑچڑے پن کی اور نہ ہی انہوں نے مجھے کچھ بتایا، جب وہ مجھے کچھ سمجھاتے یا روکتے تو میں الٹا ان سے لڑ پڑتی، اس طرح لڑائیاں بڑھتی گئیں اور ساتھ ہی ہمارے درمیان دوریاں بھی اور اس کے بعد سب حالات تمہارے سامنے ہیں، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے چکر میں ہم لوگ رشتوں سے کتنے دور ہوگئے، اس سب میں قصوروار صرف رومانہ ہی نہیں، میں بھی ہوں۔'' انہوں نے افسوس سے کہا۔ وہ چپ چاپ ان کی باتیں سن رہی تھی، وہ ان کو دلاسا دینا چاہتی تھی لیکن اس کے لب خاموش تھے اس وقت وہ اسے ایک ایسی بے بس ماں نظر آرہی تھیں جو اپنے بچے سے دور ہونے کی وجہ سے دکھی تھی۔

''دارین نے آج تک مجھ سے میرا حال نہیں پوچھا، ماں کہہ کر نہیں بلایا، وہ بھی مجھ سے بہت ناراض ہے۔ نفرت کرتا ہے مجھ سے۔'' انہوں نے روندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''شاید انہیں بھی دکھ ہے کیونکہ آپ نے انہیں کبھی کوئی امپورٹنس نہیں دی، بس رال کو ہی عزیز سمجھا، یہ بات ان میں احساس محرومی پیدا کرگئی اور وہ اپنے ہی خول میں سمٹ گئے، ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیموں کی سی زندگی گزارنا کسی اذیت سے کم نہیں ہوتا ماما۔'' اس نے آگے بڑھ کر ان کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا، وہ اس کی بات سن کر شرمندگی سے سر جھکا گئیں۔

''دارین کو رال سے بہت چڑ تھی کیونکہ آپ ان کو اگنور کرکے رال سے پیار کرتی تھیں، اس لیے وہ آپ سے دور ہوئے، وہ جتنے بھی ماڈرن سہی لیکن اندر سے ایک روایتی مرد ہی ہیں، ان کی بھی ایک عام انسان کی طرح چھوٹی چھوٹی خواہشات تھیں کہ ان کی ماں ان کا خیال رکھتی، ان سے پیار کرتی، اسے دعائیں دے کر گھر سے رخصت کرتی اور پھر شام کو اس کے آنے کا انتظار کرتی، لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا، جب کسی انسان کے خواب ٹوٹ کر چکنا چور ہو جائیں اور خواہشیں دم توڑ جائیں تو وہ اندر سے خالی ہوجاتا ہے پھر اس کے سامنے جو کچھ مرضی ہوتا رہے اس پر اثر نہیں ہوتا، وہ اپنے ہی خول میں بند ہوجاتا ہے اور اندر ہی اندر کلستا رہتا ہے لیکن کسی سے کچھ نہیں کہتا، دارین کے ساتھ بھی ایسے ہی ہوا، اب آپ نے وہ خول توڑنا ہے اپنی انا، ضد اور خودداری کو پس پشت ڈال کر، ویسے بھی اگر

رشتوں کو بچانے کے لیے جھکنا بھی پڑے تو اس میں کیا شرم کیونکہ کبھی کبھی جھک جانے میں ہی بہتری ہوتی ہے۔" اس نے دھیرے دھیرے کہا۔ وہ شاہانہ بیگم سمجھا رہی تھی۔

"بہت بڑی غلطی ہوئی ہے مجھ سے، میں واقعی ہی ماں کہلانے کے لائق نہیں ہوں، بہت بری ہوں میں۔" وہ روتے ہوئے خود کو کوس رہی تھیں۔

"اب بھی وقت ہے آپ کے پاس سدھار لیں اپنی غلطیاں اور سنبھال لیں رشتوں کو ورنہ پھر یہ موقع ہاتھ نہیں آئے گا اور پھر کوئی اور رومانہ اور رل آجائیں گی اگر پاپا اور دارین کچھ نہیں کہہ رہے تو آپ آگے بڑھ کر سمیٹ لیں ان کو۔" وہ اپنی بات کر کے ان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی جہاں دکھ ہی دکھ لکھا ہوا تھا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم...... بہت شکریہ بیا، ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔" انہوں نے دھیرے سے کہا۔

"آپ ایسے نا کہیں ماما...... میں بھی اس گھر کا حصہ ہوں اور سب کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔" اس نے بھی دھیرے سے کہا اور وہاں سے اٹھ گئی، جب کہ شاہانہ بیگم اب بھی وہیں بیٹھیں پتا نہیں کیا سوچ رہی تھیں۔

❁ ❁
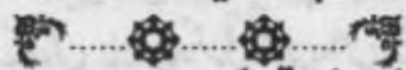
رات کافی گزر چکی تھی لیکن وہ لان میں اکیلے بیٹھے نجانے کیا سوچ رہے تھے، کل سے ان کی شاہانہ بیگم سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی، نہ ہی انہوں نے کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ بات وہ اچھے سے جانتے تھے کہ شاہانہ بہت بے حد پریشان تھی، جو کچھ بھی ہوا تھا انہوں نے ایسا کبھی بھی نہیں سوچا تھا۔

"شاہ صاحب...... کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" ان کو گہری سوچوں میں غرق دیکھ کر شاہانہ بیگم نے بات کا آغاز کیا۔ وہ کمرے کی کھڑکی سے ان کو لان میں تنہا بیٹھا دیکھ چکی تھیں۔ اس لیے وہ بھی ادھر چلی آئیں۔

"ہوں...... ہاں کچھ بھی تو نہیں...... بس تھک گیا ہوں۔" وہ چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

"مجھے معاف کر دیں حیدر۔" شاہانہ بیگم نے بغیر تمہید باندھے ان سے اپنے گزشتہ رویے کی معافی مانگی اور شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

"کس بات کی معافی شاہانہ؟" انہوں نے بھی تھکے ہوئے لہجے میں پوچھا، کیونکہ قصوروار تو وہ بھی تھے۔

"میری ہر اس بات کے لیے جس نے آپ کو تکلیف دی۔" وہ شرمندگی سے بولیں لیکن سر ان کا اب بھی جھکا ہوا تھا، حیدر شاہ کچھ دیر تو ان کے شرم سے جھکے سر کی طرف دیکھتے رہے پھر انہوں نے الٹا ان سے ہی سوال کیا۔

"کیا تم مجھے معاف کر دو گی؟"

"پہلے کہا ہوتا تو شاید نہ کرتی لیکن اب کر دوں گی۔" انہوں نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"صحیح کہا...... ہم نے اپنی زندگی کے اتنے سال بچوں کی طرح لڑتے جھگڑتے گزار دیے لیکن پھر بھی شکر ہے زندگی کے اس موڑ پر ہمیں عقل تو آئی۔" بات کرتے ہوئے ان کے لہجے میں نمی سی گھل گئی، شاہانہ بیگم کی آنکھیں بھی نم تھیں۔ انسان چاہے جتنا بھی مضبوط ہو، کبھی نہ کبھی اپنوں کے سامنے ٹوٹ کر بکھر ضرور جاتا ہے۔

"جی...... لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی میں نے کبھی آپ کو چھوڑنے کی بات نہیں کی، بے شک لڑتی، جھگڑتی رہی لیکن ہمیشہ آپ کے ساتھ ہی رہی۔ جانتے ہیں کیوں؟" انہوں نے خفیف سی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر کہا، حیدر شاہ بھی دھیرے سے مسکرائے کیونکہ وہ صحیح تو کہہ رہی تھیں اور اس بات پر انہیں حیرت بھی ہوئی تھی۔

"جانتا ہوں یہ محبت ہی ہے...... جس نے تمہیں مجھ سے دور نہیں ہونے دیا۔"

"مجھے تو محبت نے آپ سے دور نہیں ہونے دیا لیکن آپ کیوں نہیں ہوئے مجھ سے دور...... میری اتنی بدتمیزیوں، زبان درازیوں کے باوجود بھی آپ نے مجھے نہیں چھوڑا، کیوں ابھی تک جڑے ہوئے ہیں میرے ساتھ؟" انہوں نے اپنے دل میں امڈتے سوال کو زبان

دی اور ان کی طرف دیکھا جو ہلکی سی مسکان چہرے پر سجائے انہیں ہی دیکھ رہے تھے۔

"مجھے اس محبت نے تم سے جوڑا ہوا ہے جو پہلی نظر میں مجھے تم سے ہوئی تھی۔ اگر یہ نہ ہوتی تو میں کب کا تمہیں چھوڑ چکا ہوتا کیونکہ جس طرح تم میرے ساتھ زبان درازی کرتی تھی، آئے دن مجھ پر الزام لگاتی رہتی تھی، وہ سب برداشت کرنا کسی بھی مرد کے لیے آسان نہیں تھا لیکن پھر بھی میں نے کیا وہ سب برداشت، صرف محبت کی خاطر جو مجھے تم سے اور دارین سے ہے۔" بات کرتے ہوئے ان کا لہجہ نرم تھا اور ایسا اتنے عرصے میں پہلی بار ہوا تھا۔

"پہلی نظر کا پیار؟ لیکن آپ کے رویے سے تو کبھی ظاہر نہیں ہوا کہ آپ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں، نہ ہی آپ نے کبھی اظہار کیا...... مجھے آپ کی یہی بات زیادہ غصہ دلاتی تھی۔" انہوں نے نم لہجے میں شکوہ کیا، وہ ان کے اس شکوے پر خوشگوار حیرت میں گھر گئے۔

"مطلب آپ کو انتظار رہتا تھا میرے اظہار کا؟" بیا جو دارین اور زین کو لے کر ان کی طرف آ رہی تھی۔ ان کی باتیں سن کر تینوں کے قدم رک گئے، دارین نے ان دونوں کو واپس چلنے کا اشارہ کیا، لیکن بیا نے اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا کیونکہ پہلے ہی وہ مشکل سے اس کو لے کر آئی تھی۔

"جی ہاں......" انہوں نے دھیرے سے اعتراف کیا۔

"میں نے بہت بار کوشش کی تھی تمہیں بتانے کی لیکن پھر میری انا اور تمہاری ضد آڑے آ گئی اور میں اظہار نہیں کر سکا، مجھے شروع سے ہی رومانہ اچھی نہیں لگتی تھی اور جب مجھے پتا لگا وہ مجھے لائک کرتی ہے تب تو مجھے اس سے اور زیادہ چڑ ہو گئی تھی۔ اسی وجہ سے میری کلاس میں بھی تم لوگوں سے نہیں بنتی تھی، اوپر سے تمہارا ہر بات میں اس کی سائیڈ لینا مجھے اور زیادہ غصہ دلاتا تھا پھر جب ہماری شادی ہوئی تو مجھے لگا کہ اب وہ ہمارے بیچ کبھی نہیں آئے گی اور میں تمہیں سب کچھ اچھے سے سمجھا پاؤں گا لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا، تمہاری ضد تھی اسے پھر سے گھر واپس لانا اور تم ضد پوری کر کے اسے ساتھ لے بھی آئی، تب مجھے تم پر بہت زیادہ غصہ آیا تھا اور میں نے تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیا لیکن یہ بھی میری ہی غلطی تھی میں نے خود ہی ان لوگوں کو موقع دیا اور انہوں نے اس بات کا خوب فائدہ اٹھایا...... جس کے نتائج آج ہمارے سامنے ہیں، خود دیکھ لو آج ہم کس دوراہے پر کھڑے ہیں۔" انہوں نے بھی اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا، وہ تینوں بھی ان کے پاس پہنچ گئے تھے۔

"پاپا صحیح کہہ رہے ہیں...... ہم لوگ بھی اس سب کے لیے قصوروار ہیں، مجھے بھی رومانہ بیگم بالکل پسند نہیں تھیں کیونکہ ان ہی کی وجہ سے میں ماما سے دور ہوا اور اپنا سارا بچپن ماں، باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیموں کی طرح گزارا اور وہ دونوں میری ماما کے دیے پیسوں عیش سے زندگی گزارتی رہیں۔" دارین نے آگے بڑھ کر حیدر علی شاہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھیمے لہجے میں کہا، وہ دونوں چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"اگر آپ لوگ شروع میں ہی سارے مسئلے سلجھا لیتے تو ایسا کبھی نہ ہوتا کیونکہ رشتوں میں دوریاں بڑھ جائیں تو انہیں کم کیا جاتا ہے، ایسے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دوسروں کو اپنی زندگیاں برباد کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا، جیسے آپ لوگوں نے کیا۔" بیا نے رسانیت سے کہا اور شاہانہ بیگم کے پاس آ کر کھڑی ہوئی۔

"بھابی غلطیاں ہمیشہ انسانوں سے ہی ہوتی ہیں اور انسان ہی اپنی غلطی کو تسلیم کر کے اس کو سدھارتے ہیں اور بہتر انسان وہی ہوتا ہے جو اپنی غلطیوں سے سیکھے۔"

"ہمم...... دیر آید درست آید...... اب چھوڑو سب گلے شکوے، میرے خیال میں تو یہ جو کچھ بھی ہوا بہت اچھا ہوا ہے کیونکہ اس سے ان کی اصلیت تو سامنے آئی تو ساتھ میں ہماری آنکھیں بھی کھل گئیں اور ہم سب کو بھی اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا۔" حیدر صاحب نے کھڑے

ہوتے ہوئے مسکرا کر کہا، زین نے آگے بڑھ کر ان کو پیار سے گلے لگایا، دارین بھی خاموشی سے ان کے ساتھ لگ گیا، شاہانہ بیگم اور بیا بھیگی آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔

"لیکن شاہ صاحب انہوں نے جو بھی کیا، اس کا مجھے بہت زیادہ دکھ ہے۔ میں نے ان دونوں کے لیے اپنا گھر تک تباہ کرلیا...... اپنے پیارے بیٹے اور شوہر تک کی فکر نہیں کی اور انہوں نے میرے ساتھ کیا کیا؟ بہت دکھ ہوتا ہے تب جب کسی بہت اپنے پر ہم نے اپنا دکھ سکھ، مان، یقین اور پیار لوٹایا ہو اور بدلے میں ہمیں صرف وصرف دھوکا ملا ہو۔" وہ سب کچھ یاد کر کے ایک بار پھر سے رونے لگ گئیں...... ان کے دل پر بہت زیادہ بوجھ تھا جو کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

"جی میں جانتی ہوں جب اپنوں سے دھوکا ملتا ہے تو کتنی تکلیف ہوتی ہے لیکن پھر بھی ماما آپ خود کو الزام نہ دیں اور صبر کریں۔ آپ نے تو ان کو عزت، مان اور پیار دیا لیکن پھر بھی انہوں نے اپنی اصلیت دکھا کر ثابت کردیا کہ وہ اس پیار اور عزت کے لائق ہی نہیں تھیں لیکن یہ بھی شکر ہے کہ انہوں نے آپ کو کوئی جانی نقصان نہیں پہنچایا۔" بیا نے آگے بڑھ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"دارین میری جان، میرے بچے مجھے معاف کردو، میں نے ماں ہو کر تمہارے ساتھ بہت غلط کیا، تم سے تمہاری خوشیاں چھین لیں، پلیز مجھے معاف کردو۔" انہوں نے روتے ہوئے کہا، دارین نے آہستہ سے ان کے گرد اپنے بازو حمائل کیے، بیا تھوڑا سا پیچھے ہٹ گئی تھی۔

"جو کچھ ہونا تھا ہو گیا ماما، اب آپ مجھ سے معافی نہ مانگیں پلیز۔" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"ماما یہ سچ ہے کہ میں آپ سے بہت ناراض تھا، بہت شکوے تھے مجھے آپ سے لیکن اب وہ سب ختم ہوگئے ہیں، پلیز آپ مجھ سے معافی مانگ کر مجھے شرمندہ نہ کریں اور مجھے بھی معاف کردیں۔" اس نے ان کے آنسو صاف کر کے ماتھے پر بوسہ دے کر ملائمت سے کہا۔ آج اتنے عرصے بعد حیدر علی شاہ بھی بہت مطمئن تھے کیونکہ "شاہ ولا" اب صحیح معنوں میں ایک گھر بن گیا تھا۔ اس کی خوشیاں اور بہاریں لوٹ آئی تھیں۔

"زین...... ادھر آؤ تم بھی۔" انہوں نے اپنے آنسو صاف کر کے اس کو بھی اپنے پاس بلایا، وہ بھی مسکراتا ہوا ان کے پاس آ گیا۔

"سوری ماما میری طرف سے بھی۔" زین نے ان کے گلے لگ کر مسکراتے ہوئے کہا، ماحول خوشگوار ہو گیا تھا، وہاں موجود لوگوں میں پچھلی دوریاں آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھیں، سب مطمئن تھے کیونکہ دکھ کے بادل چھٹ رہے تھے اور آنے والی صبح ان کے لیے خوشیوں کی نوید لے کر آنے والی تھی۔

بیا کا دل تھوڑا اداس ہو گیا تھا۔ ان چاروں کو آپس میں مصروف دیکھ کر وہاں سے اٹھ گئی تھی، اس کو اپنے امی، بابا بڑی شدت سے یاد آرہے تھے وہ سوئمنگ پول کے پاس آ کر زمین پر بیٹھ گئی اور چہرہ گھٹنوں پر ٹکا لیا تھا۔ دارین نے اس کو وہاں سے جاتے دیکھ لیا تھا اس لیے کچھ دیر بعد وہ بھی اس کے پیچھے آ گیا تھا۔

"کیا ہوا...... آپ یہاں کیوں آ گئی؟"

"وہ مجھے امی بابا کی بہت یاد آرہی تھی تو میں یہاں آ گئی۔" وہ آسمان کو تکتے ہوئے افسردہ لہجے میں بولی۔

"میں سمجھ سکتا ہوں آپ کا دکھ کیونکہ میں نے بھی ماں باپ کے ہوتے ہوئے یتیموں کی طرح اپنی آدھی زندگی بسر کی ہے۔" وہ اس کے قریب بیٹھ گیا اور محبت سے اس کو دیکھنے لگا۔ کتنی شفاف دل کی مالک تھی یہ لڑکی جو کوئی بھی بات دل پر لائے بغیر رشتوں کو آپس میں جوڑ رہی تھی۔ پہلی بار دارین کو اپنی قسمت پر رشک آیا تھا۔

"ایک بات کہوں آپ سے۔" اس نے بیا کو کندھوں سے تھام کر اپنے سامنے کیا۔

"جی۔" وہ اس کی طرف منہ کر کے نظریں جھکائے بولی۔

”ماضی میں جو کچھ بھی ہوا بھول جائیں اس کو اور معاف کردیں اپنی مامی کو، انہوں نے جو کیا آپ کے ساتھ اس کا حساب اللہ ان سے لے گا، آپ کو اللہ نے ہر شر سے محفوظ رکھا شکر کریں اس کا اور نئے سرے سے اپنی آنے والی زندگی کی شروعات کریں، بس یہ یاد رکھیں کہ جو گزر گیا وہ ماضی تھا، اپنے آج پر دھیان دیں، جن لوگوں سے سارے رشتے ہی ختم کردیے ہیں آپ نے تو ان کے بارے میں سوچ کر خود کو ہلکان کیوں کررہی ہیں...... انہیں معاف کرکے سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیں، وہ بہت بڑا انصاف کرنے والا ہے۔“ وہ اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے رسانیت سے سمجھا رہا تھا جبکہ بیا خاموشی سے سن رہی تھی، ان چار ماہ میں وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں بھولی تھی۔

”میں مانتا ہوں ان لوگوں نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا، تمہارے کردار کو داغ دار کرنے کی کوشش کی، وہ سب بھولنا ناممکن ہے لیکن پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ تم معاف کردو ان کو، میں تمہیں ایسے پریشان اور دکھی نہیں دیکھ سکتا...... پلیز ایک بار میری بات مان کر دیکھو۔“ دارین جانتا تھا اس کے لیے ان کو معاف کرنا آسان نہیں لیکن پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ بیا ان کو معاف کردے، وہ ایسے کبھی نہ کہتا بیا کو اگر وہ خود ایسے حالات سے نہ گزرا ہوتا، اس نے بھی معاف کردیا تھا شاہانہ بیگم کو، اس کے لیے بھی اتنا آسان نہیں تھا لیکن کبھی کبھی جھکنے میں ہی بہتری ہوتی ہے۔ یہی بات وہ بیا کو سمجھا رہا تھا وہ جھکنے کا نہیں کہہ رہا تھا اسے بس معاف کرنے کا کہہ رہا تھا۔

”ٹھیک کہا آپ نے...... وہ سب کچھ بھولنا میرے لیے ممکن نہیں لیکن میں مطمئن ہوں یہ سوچ کر کہ شاید ایسے ہونا میری قسمت میں لکھا تھا اور اگر وہ سب نہ ہوتا تو میں آپ سے کبھی نہ مل پاتی اور نہ ہی مجھے آپ سے محبت ہوتی اور نہ میں یوں آپ کے ساتھ......“ بات کرتے ہوئے اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ وہ کیا بول گئی، اس نے جلدی سے اپنے لب بھینچے، دارین جو بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا، وہ بھی اس کی محبت والی بات سن کر چونکا

آنکھوں میں چمک لیے شرارت سے گویا ہوا۔
"کیا ہوا مسز آپ بولتے بولتے خاموش کیوں ہوگئی؟
اچھا تو بول رہی تھیں آپ۔"
"وہ...... کچھ بھی نہیں...... ہم اندر چلتے ہیں رات
ہوگئی ہے۔" وہ گھبراہٹ میں بولی، تیزی سے اس
کے پاس سے گزرنے لگی، دارین نے اس کو بازو سے پکڑ
کر اپنی طرف کھینچا وہ اس کے سینے سے جا لگی، دارین نے
جلدی سے اس کے گرد بازو حمائل کر کے اس کو اپنے اور
قریب کیا اور اس کے بھاگنے کے سارے راستے بند
کر دیے۔
"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ کوئی دیکھ لے گا۔" وہ اس کی
گرفت میں کسمسائی۔
"کوئی نہیں دیکھے گا۔ محترمہ اپنے دل کی بات تو کہہ
دی آپ نے، اب میرے دل کی بھی سنتی جائیں۔" وہ
شوخ لہجے میں دھیرے سے اس کے کان کے قریب بولا،
جبکہ شرم سے لال ہوتی وہ اپنا سر جھکا گئی، وہ جانتی تھی
دارین اب اس کو چھوڑنے والا نہیں۔
"پپ...... پتا ہے مجھے آپ کے دل کی بات۔" وہ
دھیرے سے بولی۔
"کیا پتا ہے آپ کو؟" اس نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔
"یہی کہ آپ نے میرے کہنے پر مجھ سے شادی کی
ہے، آپ کو مجھ سے ذرا سا بھی پیار نہیں۔ بس ہمدردی ہے
مجھ سے۔" اس کی بات سن کر دارین چونکا۔
"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"
"جو سچ ہے وہی کہا۔" وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی، دارین
کو اس کی بدگمانی پر حیرت کے ساتھ ساتھ افسوس بھی ہوا۔
"مسز دارین حیدر شاہ میں اتنا اچھا نہیں ہوں کہ
ہمدردی میں شادی کر لوں اور پھر اسے نبھاؤں بھی۔" وہ
غصے سے لال پیلا ہوتے ہوئے بولا۔
"تو پھر کیوں نبھا رہے ہیں آپ؟" وہ بھی خاموش
نہیں رہی۔
"کیونکہ پیار کرتا ہوں میں آپ سے، یہ سچ ہے کہ
میں نے آپ کے کہنے پر آپ سے شادی کی تھی لیکن اس
میں ہمدردی بالکل بھی نہیں تھی، مجھے آپ سے پیار ہو گیا تھا
لیکن افسوس کہ آپ کو میرا پیار صرف ہمدردی لگ رہا
ہے۔" اس نے بیا کو کندھوں سے پکڑ کر اپنے سامنے
کر کے تاسف سے کہا جبکہ وہ اس کے اظہار پر کھلکھلا کر
ہنس دی۔
"اب ہنس کیوں رہی ہو؟" اس نے گھورتے ہوئے
سوال کیا۔
"سوری دارین...... میں نے جان کے ہی ایسا کہا۔
پلیز اب مجھ سے ناراض مت ہوں۔" وہ نظریں جھکائے
آہستہ سے بولی، وہ اس کو سر جھکائے دیکھ کر آگے بڑھا، بیا
اس کے ارادے بھانپ کر دو قدم پیچھے ہوئی۔
"اب یہ سب کیا ہے؟" اس نے بیا کی حرکت دیکھ کر
خفگی سے پوچھا۔
"کچھ بھی نہیں دارین، بس یہ کہنا تھا کہ ہم روم میں
نہیں باہر کھڑے ہیں۔ سنبھالیں خود کو۔" وہ ہنستی ہوئی،
اسے پیچھے دھکیل کر اندر کی طرف بھاگ گئی۔
"اوہ شٹ یار...... کتنا بیوقوف ہوں میں۔" وہ زور
سے سر پر ہاتھ مار کر بولا۔ اندر کی طرف جاتی بیا اس کی
بات سن کر کھلکھلا کر ہنس دی اور پھر منہ بنا کر اس کو چڑاتے
ہوئے بھاگ کر اندر چلی گئی۔
"چھوڑوں گا نہیں اب تمہیں۔" وہ بھی منہ پر ہاتھ پھیر
کر دھمکی دینے والے انداز میں کہتا اس کے پیچھے بھاگا
جبکہ آسمان پر اپنی پوری آب و تاب سے چمکتا روشن چاند بھی
ان کی کھلکھلاہٹیں دیکھ کر مسکراتے ہوئے بادلوں کی اوٹ
میں چھپ گیا تھا۔ بے شک انابیہ کو اس کا مسیحا مل گیا تھا۔

گوہر نایاب

انعم توصیف

''کیا کر رہی ہیں آپ؟'' موبائل اسکرین پہ گول دائرے میں خوب صورت تصویر ابھری تو اس نے فوراً اس کو چھوا اور میسج پڑھ کے مسکرانے لگی۔
''کچھ بھی نہیں۔'' میرب نے مختصر جواب دیا۔ جتنا وہ مختصر جواب دیتی معارج آگے سے ایسا سوال کرتا کہ وہ طویل جواب دینے پر مجبور ہو جاتی۔
''آپ جیسی عظیم شخصیت کچھ نہ کرے یہ تو ظلم ہوگا ہمارے معاشرے پہ...... فراغت میں بھی آپ کا دماغ چلتے رہنا چاہیے۔''
''جی کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں۔ میں کچھ سوچ ہی رہی تھی لکھنے کا۔''
''پھر کیوں کہا آپ نے کہ کچھ نہیں...... کیا سوچنے سے زیادہ ضروری کوئی کام ہو سکتا ہے؟'' اپنے مخصوص انداز میں میرب کی کہی بات پہ اس نے سوال کیا۔
''جی بہت معذرت، غلطی ہو گئی...... آئندہ دھیان رکھوں گی۔'' مسکراتے ہوئے اس نے میسج ٹائپ کیا۔
میرب اور معارج کی دوستی فیس بک کے ذریعے ہوئی تھی۔ میرب ایک معروف قلم کار تھی۔ اس کے سحر انگیز الفاظ میں ہر ایک شخص کھو سا جاتا تھا۔ معارج کو بھی ادب سے بے حد لگاؤ تھا۔ میرب کی چند تحریریں پڑھ کے وہ اس کا فین بن گیا تھا۔ فیس بک پہ ''میرب نیازی'' کو سرچ کرتے ہی اس نے دوستی کی درخواست بھیج دی تھی۔ سلام، دعا اور تعریف کے بعد بھی وہ وقتاً فوقتاً میسج کرتا رہتا تھا۔ اپنی عادت کے برخلاف میرب اسے ہر بات کا جواب دیتی تھی۔ رفتہ رفتہ باتیں کرتے ہوئے وہ کب دوست بنے اسے پتا ہی نہ چلا۔ پھر ان کی بات چیت موبائل فون کے ذریعے بھی

ہونے لگی لیکن زیادہ تر فیس بک پر میسج ٹائپ کر کے مزا آتا۔ میرب کا دن معارج سے بات کیے بنا ادھورا رہتا تھا۔ وہ ہر موضوع پر ایک دوسرے سے بات کرتے۔ باتیں کرتے ہوئے وقت اتنی تیزی سے گزرتا کہ کئی گھنٹے بھی لمحوں کے برابر لگتے۔ میرب گھنٹوں معارج کی باتوں کو سوچتی رہتی اور ڈھیروں سکون اس کے دل پہ اترتا۔ وہ نہیں جانتی تھی وہ کس سمت چل پڑی ہے۔ معارج کا اس سے بات کرنا، اس کا خیال رکھنا اسے اچھا لگتا تھا۔ والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے وہ کسی حد تک تنہائی پسند بھی تھی۔ اپنی باتیں اپنی ذات تک محدود رکھنے والی، بلا کی حساس میرب، معارج کے پوچھنے پہ ہر وہ بات بتا دیتی جو وہ خود اپنے آپ سے بھی چھپا جاتی تھی۔ زندگی کی محرومیوں کے زخم جو والدین کی ناچاقیوں کی وجہ سے اس کی ذات کا حصہ بن چکے تھے۔ اب معارج کی دوستی سے مندمل ہونے لگے تھے۔

''آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟'' آج کئی مہینوں بعد اچانک معارج نے سوال کیا، وہ بھی میرب کی عمر معلوم ہونے کے بعد اس کا لہجہ حیرت لیے ہوئے تھا۔

''بس ایسے ہی۔'' اپنی عادت سے مجبور ہو کر میرب نے مختصر جواب دیا۔

''ایسے کیسے؟ مطلب آپ اتنی پیاری ہیں۔ اتنا اچھا لکھتی ہیں۔ میں سمجھا منگنی شنگنی تو کر رکھی ہوگی۔ آپ تینتیس سال کی لگتی بھی نہیں۔ مجھے تو آپ بیس سال کی لگتی ہیں۔'' وہ ڈی پی پر لگی میرب کی تصویر دیکھتے ہوئے میسج ٹائپ کرنے لگا۔

''اچھا...... بہت شکریہ۔'' میرب نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''تعریف کا جواب تو آپ نے دے دیا لیکن ایسے کیسے کا جواب ابھی باقی ہے۔'' ٹائپ کرتے ہوئے معارج کے ماتھے پہ سوچ کی لکیریں واضح تھیں۔

''بس ایسے ہی۔ کوئی ملا نہیں۔'' میرب نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے پاس خود اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ والدین نے کبھی اس پہ توجہ نہ دی تھی۔ جب وہ بیس سال کی تھی تو ماں اسے چھوڑ کر جا چکی تھی اور اپنا نیا گھر بسا لیا تھا۔ باپ نے بھی دوسری شادی کر لی تھی۔ چند سالوں بعد باپ کی ایک حادثے میں ہونے والی اچانک موت نے اسے بھری دنیا میں تنہا کر دیا تھا۔ دوسری ماں، باپ کی موت کے فوراً بعد ہی گھر سے اپنے حصے کی دولت لے کر جا چکی تھی۔ اب وہ اتنے بڑے گھر میں تنہا رہتی تھی۔ انسانی رویوں سے بے زار رہنے والی لڑکی بس پڑھائی اور گھر تک خود کو محدود رکھتی۔ کوئی پہلی مرتبہ بات کرنے کی کوشش بھی کرتا تو میرب کا رویہ اسے اس قابل نہ چھوڑتا کہ وہ دوسری مرتبہ بات بھی کرے۔ پڑھائی سے فراغت کے بعد اس نے گھر پہ ہی رہنا شروع کر دیا تھا۔ باپ کی اتنی دولت تھی کہ وہ گھر بیٹھے کھائے تب بھی ختم نہ ہو۔ ادب سے اس کو جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ اس نے لکھنا شروع کیا تو اس کے قلم نے گویا تھکنے سے انکار کر دیا۔ چند سالوں میں وہ ملک کی معروف ناول نگار بن چکی تھی۔

''آپ کو نہیں ملا؟ آپ نہیں ملی ہوں گی کسی کو۔ گوہر نایاب ہیں آپ...... آپ کو ڈھونڈنا تو ہے ہی مشکل کام۔'' موبائل فون کی میسج ٹون نے میرب کو سوچ کے بھنور سے نکالا۔ اس کا میسج پڑھ کر وہ یک ٹک اسکرین کو دیکھتی رہی۔

''کہاں گئیں؟''

''کہیں نہیں...... یہیں ہوں۔''

''گوہر نایاب......''

''ویسے میری جگہ آپ کو قلم کار ہونا چاہیے تھا۔ نئی نئی باتیں لاتے ہیں آپ۔'' اداسی سے اسکرین کو دیکھتے ہوئے میرب نے ٹائپ کیا۔ اس کے لیے

لاکھوں قارئین ایسے الفاظ استعمال کرتے تھے لیکن اس کو ذاتی طور پہ جان کر ایسا لفظ استعمال کرنے والا وہ پہلا شخص تھا۔

''شکریہ شکریہ...... ویسے آپ مجھ سے بڑی ہیں۔ پورے چھ سال لیکن خیر عمر سے کیا ہوتا ہے۔'' معارج کے انداز پہ وہ چونکی۔ اس نے سر جھٹکا اور نیند کا کہہ کر موبائل ایک طرف رکھ دیا۔

''گوہر نایاب......'' وہ سونے سے پہلے کتنی مرتبہ زیر لب اس لفظ دہراتی کرتی رہی۔

❀ ❀

''کیسی ہیں، آج پورا دن بہت مصروف رہیں؟ کوئی میسج نہیں کیا۔'' رات گیارہ بجے معارج نے میرب کو میسج بھیجا۔

''جی مصروف تھی۔'' میرب نے زندگی میں پہلی بار جھوٹ بولا، وہ شام میں ہی اس کا میسج دیکھ چکی تھی لیکن جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔

''آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟'' وہ فکر مند ہوا تھا۔ اتنے ماہ سے وہ اس سے باتیں کر رہا تھا اس لیے اس کے جھوٹ سچ سے بھی واقف تھا اور اس کے مزاج سے بھی۔

''الحمدللہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ معارج مزید کچھ پوچھ نہ سکا۔

''مجھے آفس کے کام سے اسلام آباد جانا ہے۔ اگلے کچھ دنوں تک مصروفیت کی وجہ سے شاید بات نہ ہو سکے۔'' موبائل اسکرین پہ جھلملاتا ہوا معارج کا میسج میرب کی دنیا کو تاریک کرنے کے لیے کافی تھا۔

❀ ❀

ایک ہفتہ...... یہ ایک ہفتہ میرب نے جیسے گزارا تھا صرف وہ ہی جانتی تھی۔ وہ سارا دن موبائل ہاتھ میں تھامے بیٹھی رہتی۔ ہر آواز پہ چونک اٹھتی۔ کئی سالوں میں پہلی بار میرب نے اتنے دنوں میں ایک لفظ بھی نہ لکھا تھا۔ اس کیفیت کو نام دینا، اس کے لیے ناممکن

نہیں تھا۔ وہ لفظوں کی کھلاڑی تھی۔ الفاظ اس کے قلم اٹھاتے ہی اس کی سمت دوڑے چلے آتے تھے۔

''السلام علیکم! کیسی ہیں؟'' میسج کی آواز پہ وہ چونکی۔ موبائل کی اسکرین پہ نگاہ پڑتے ہی بے اختیار اس کے آنسو اس کے نرم گالوں کو بھگونے لگے۔

''وعلیکم السلام! میں ٹھیک۔'' میرب نے کپکپاتے ہاتھوں سے میسج ٹائپ کیا۔

''مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' بنا کسی حال احوال اور تمہید کے معارج نے کہا۔

''جی۔''

''آپ میرے لیے بہت اہم ہیں میرب۔ شاید میری زندگی میں میری ماں کے بعد سب سے اہم......'' معارج کے لفظوں نے اس کے آنسوؤں کی رفتار کو بڑھا دیا تھا۔

''آپ واقعی گوہر نایاب ہیں۔ جسے میں نے تلاش کرلیا ہے۔ میں آپ سے آج کال یہ بات کرنا چاہتا ہوں لیکن پہلے آپ ایک تصویر دیکھیے۔'' وہ اسکرین کو تک رہی تھی۔ میرب کے جواب کا انتظار کیے بنا اس نے فوراً ہی ایک تصویر بھیج دی۔

''یہ ایمن ہے، میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بات میں نے امی کے بعد آپ کو بتائی ہے۔'' میرب کی جانب سے کوئی جواب نہ پاکر اس نے خود ہی سوال کیا۔

''کیسی لگی؟'' موبائل اسکرین کو تکتی میرب، جس کی سفید رنگت کو دیکھ کر یہ اندازا لگانا مشکل تھا کہ وہ زندہ، سانس لیتی ہوئی لڑکی ہے یا ایک نعش۔

''اچھی ہے۔'' سرد پڑتے ہاتھوں سے اس نے بہ مشکل لکھا۔ آنسو اب ہوش وحواس کھو رہے تھے۔ وہ آنکھوں کے رستے بہنے کے بجائے اب ہونٹوں پہ مسکان بن کر میرب کے لبوں پر بکھر گئے تھے۔

''مجھے پتا تھا آپ کو پسند آئے گی۔ ایک اور تصویر بھی دکھانی ہے آپ کو......''

''کس کی؟''

''یہ شازیب ہیں میرے بڑے بھائی۔ آپ سے ذکر کیا تھا ایک بار۔''

''مجھے یاد نہیں۔'' غائب دماغی سے اس نے جواب دیا۔

''چلیں کوئی بات نہیں۔ اب یاد رہیں گے۔'' ہنستے ہوئے چہرے کے ساتھ معارج نے ٹائپ کرکے بھیجا۔

''ہمم......''

''کیا ہمم...... مجھے آپ سے ایک التجا کرنی ہے۔''

''جی کہیے۔''

''میں نے آپ کو ہمیشہ اپنی بہن مانا ہے بلکہ بہنوں سے بڑھ کر۔ آپ گوہر نایاب ہیں۔ میں چاہتا ہوں آپ کی روشنی سے میرے بھائی کی زندگی روشن ہوجائے۔'' لفظ ''بہن'' کو پڑھ کر اس نے خود کو پاتال کی گہرائیوں میں گرتا محسوس کیا۔ اس کو اپنے وجود سے گھن آنے لگی تھی۔

''بتایئے میرب...... کیا آپ میری بھابی......'' معارج نے قصداً اپنی بات کو ادھورا چھوڑا۔

''معارج...... آپ مجھ سے تعلق رکھنا چاہتے ہیں تو آئندہ کبھی ایسی بات مت کیجیے گا۔ مجھے سونا ہے۔ شب بخیر۔'' آج پہلی بار اس نے معارج کو نام لے کر مخاطب کیا تھا۔ معارج ہکابکا موبائل اسکرین کو تکتا رہ گیا جب کہ میرب نے اپنی ''انا'' کا بھرم قائم رکھا تھا۔ وہ گوہر نایاب تھی اور اسی لمحہ میں زندہ رہنا چاہتی تھی۔

bazsuk@naeyufaq.com

بزمِ سخن

سمیہ عثمان

ڈاکٹر جانبہ عباسی...... مری

وہ اب اپنے سہانے دنوں کے عوض
میرے حصے کی راتیں بیچتا ہے

مریم منور...... سمندری

نہیں مجھے کوئی شکایت اب کسی سے
بس اپنے آپ سے روٹھی ہوئی ہوں
بظاہر خوش ہوں لیکن ایک سچ بتاؤں؟
میں اندر سے بہت ٹوٹی ہوئی ہوں

فاطمہ انابیہ...... ساہیوال

کاش وہ آج خود مجھ سے رابطہ کر کے کہے
کہ میرا بھی دل نہیں لگتا تمہارے بغیر

نادیہ بتول...... پتوکی

ہٹ کر چلیں وہ ہم سے جنہیں سر عزیز ہو
ہم سر پھروں کے ساتھ کوئی سر پھرا چلے

سونیا اداس...... نامعلوم

اے کارواں اشک بس اتنا بتا کر جانا
ہونٹوں کی مسکراہٹیں لائیں کہاں سے ہم

مدیحہ مہک نورین...... گجرات

منتظر ہوں کہ ستاروں کی ذرا آنکھ لگے
چاند کو چھت پہ بلا لوں گا اشارا کر کے
میں وہ دریا ہوں کہ ہر بوند بھنور ہے جس کی
تم نے اچھا ہی کیا مجھ سے کنارا کر کے

پروین افضل شاہین...... بہاولنگر

چار سو پھیلی خوش بو کی حفاظت کرنا
اتنا آسان تو نہیں تجھ سے محبت کرنا

عائشہ شکیل...... گوجرہ

اداس کونے میں چپ تھی بیٹھی ہوئی
تیرے خیال نے زندگی بے زباں کردی

شہزادی فرخندہ...... خانیوال

بے خود تھے کیا غیر سے وعدہ مجھے منظور
آیا ہے اگر ہوش مگر کیوں نہیں جاتے

گلشن چودھری گل...... گجرات چک مسعود

بزم خیال میں تیرے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا ہجر کی رات ڈھل گئی
جب تجھے یاد کرلیا صبح مہک مہک اٹھی
جب تیرا غم جگا لیا رات مچل مچل گئی

تانیہ الطاف...... حیدر آباد

کوئی بھی شکل مکمل نظر نہیں آتی
یہ کس نے توڑ دیا ہے نظر کا آئینہ

ماہا بشیر حسین...... ٹنگہ

زمانہ جس کو دریا کہہ رہا ہے
ہماری آنکھ سے ہو کر گیا ہے

ارم کمال...... فیصل آباد

بتاؤ جس تجارت میں خسارہ ہو
بنا سوچے خسارے کی تجارت کون کرتا ہے
ہمیں ہی غلط فہمی تھی کسی کے واسطے ورنہ
زمانے کے رواجوں سے بغاوت کون کرتا ہے

کوثر خالد...... جڑانوالہ

اب تو خواہش ہے کہ یہ زخم بھی کھا کر دیکھیں
لمحہ بھر کو ہی سہی اس کو بھلا کر دیکھیں
رونے والوں کے تو ہمدرد بہت ہیں محسن
ہنستے ہنستے کبھی دنیا کو رلا کر دیکھیں

رباب کاظم...... شور کوٹ

ایک دن پوچھتی پھرے گی حیات
اہل دل کس نگر میں رہتے ہیں
منزل زیست کی کوشش مت پوچھ
راستے بھی سفر میں رہتے ہیں

ثناء فرحان...... ملتان

خیال یار کی رنگینیوں میں گم ہو کر
جمال یار کی عظمت نکھار دی ہم نے
اسے نہ جیت سکے گا اب غم زمانہ
جو کائنات ترے در پہ ہار دی ہم نے

نجم انجم اعوان...... کراچی

بے حس ہیں یہاں لوگ بھلا سوچ کر کرنا
اس دور میں لوگوں سے وفا سوچ کر کرنا
اک بار جو روٹھے تو منا تم نہ سکو گے
ہم جیسے وفاداروں کو خفا سوچ کر کرنا

تبسم بشیر حسین...... ٹنگہ

میری زندگی کا یہ طویل سفر گراں
الٰہی میں تیرا بندہ ہوں ناتواں
لکھ دے تقدیر میں میرا طبیب حاذق
تو خوب جانتا ہے میرے درد کا درماں

فائزہ شاہ...... کراچی

مرے تخیل کے شہر سارے سنگ رہے ہیں
مری نظر میں یہ کیسا مقتل سجا ہوا ہے
مرے خدایا مجھے یہ کیسا کمال بخشا
محبتوں میں وجود ایندھن بنا ہوا ہے

کوثر ناز...... حیدر آباد

قریب تھا تو کہا ہم نے سنگ دل بھی اسے
ہوا جو دور تو لگتا ہے جان جاں وہ شخص
اس ایک شخص میں تھیں دلربائیاں کیا کیا
ہزار لوگ ملیں گے مگر کہاں وہ شخص

ثمرہ گلزار...... کوٹلی

لذت درد سے آسودہ کہاں دل والے
ہیں فقط درد کی حسرت میں کراہے جاتے
دی نہ مہلت ہمیں ہستی نے وفا کی ورنہ
اور کچھ دن غم ہستی سے نباہے جاتے

رمشا آصف...... خانگڑہ

جمے گی کیسے بساط یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شب نگاراں کہ دل سر شام بجھ گئے ہیں
وہ تیرگی ہے رہ بتاں میں چراغ رخ ہے نہ شمع وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ بام و در سب بجھ گئے ہیں

ارم آصف...... خانگڑہ

جب بھی خواب کی امید بڑھا کرتی ہے
نیند آنکھوں میں پریشان پھرا کرتی ہے
یاد رکھنا ہی محبت میں نہیں سب کچھ
بھول جانا بھی بڑی بات ہوا کرتی ہے

مسز فرخندہ...... ملتان

اس کے مزاج کا بھی ٹھکانہ نہیں کوئی
گلزار ہے کبھی تو کبھی آگ کی طرح

نعیم انصر ہاشمی...... جھنگ

کیوں کر ہیں یہ اتنے ظالم اس دنیا والے
ہمیں کیوں اک دوسرے کا ہونے نہیں دیتے
غم روزگار ہو یا ہو غم جاناں انصر
دونوں ایسے ہیں کمبخت کہ سونے نہیں دیتے

شانزہ پرویز شانو...... ایبٹ آباد

ان سے مل کر ایسا بدلہ ہے نگاہوں کا مزاج
اب کسی صورت کسی صورت پہ پیار آتا نہیں

سدرہ سحر سحری...... پتوکی

لگا کہ آگ میں آیا تھا نیم شب جس کو
ہوئی جو صبح تو دیکھا مکان میرا تھا

ثانیہ عمر چودھری...... گجرات

پھر جو اس شہر میں آنا ہو تو ملنا مجھ سے
گھر کا آسان پتا ہے گھر ہے ہی نہیں

سمیرا سواتی...... بھیر کنڈ

اے رہبرو تم اسے آئینہ دکھا دو
دیوانہ خود اپنا ہی پتا پوچھ رہا ہے

کچن گارڈن

زہرہ جبین

چکن بریانی

اجزا:۔

چکن	سوا کلو
چاول	ایک کلو
ادرک لہسن پسا ہوا	دو کھانے کے چمچ
نمک	حسب ذائقہ
پیاز (باریک کٹی ہوئی)	تین عدد درمیانی
ٹماٹر (باریک کٹے ہوئے)	چھ عدد درمیانے
دہی (پھینٹا ہوا)	ایک پیالی
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچ
ہلدی پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچ
لال مرچ پسی ہوئی	دو کھانے کے چمچ
دھنیا پسا ہوا	ایک کھانے کا چمچ
گرم مصالحہ پسا ہوا	ایک کھانے کا چمچ
ہری مرچیں (باریک کٹی ہوئی)	چھ سے آٹھ عدد
ہرا دھنیا (باریک کٹا ہوا)	آدھی گٹھی
پودینہ (باریک کٹا ہوا)	آدھی گٹھی
ثابت گرم مصالحہ	دو کھانے کے چمچ
زردے کا رنگ	ایک چٹکی
دودھ	ایک پیالی
کیوڑہ ایسنس	چند قطرے
کوکنگ آئل	ایک پیالی

ترکیب:۔

دیگچی میں کوکنگ آئل کو درمیانی آنچ پر تین سے پانچ منٹ گرم کرکے ثابت گرم مصالحہ ڈال دیں۔ جب کڑکڑانے لگے تو پیاز ڈال کر سنہری فرائی کرلیں۔ ادرک، لہسن، ہلدی اور زیرہ ڈال کر دو سے تین منٹ تک چمچ چلائیں اور پھر ٹماٹر شامل کرکے اتنی دیر پکائیں کہ ٹماٹر گل جائیں۔ جب ٹماٹر اچھی طرح گل جائیں اور ایک پیسٹ کی شکل میں آجائیں تو چکن، نمک، لال مرچ، پسا ہوا دھنیا، پسا ہوا گرم مصالحہ، ہری مرچیں، ہرا دھنیا اور پودینہ ڈال دیں پھر دہی ڈال کر اچھی طرح ملائیں اور درمیانی آنچ پر بارہ سے پندرہ منٹ تک پکائیں۔ چاولوں کو تھوڑے سے ثابت گرم مصالحے کے ساتھ ایک کنی (مکمل ابلنے سے تین چار منٹ پہلے) ابال کر چھلنی سے پانی چھان لیں۔ بڑے سائز کی دیگچی میں چکن کو پھیلا کر رکھیں اور اس کے اوپر چاولوں کی تہہ لگادیں۔ دودھ میں زردے کا رنگ اور کیوڑہ ایسنس ملا کر چاولوں پر چھڑک دیں۔ دیگچی کو ڈھک کر پندرہ سے بیس منٹ کے لیے گرم توے پر رکھ کر ہلکی آنچ پر دم پر پکائیں۔

مریم صادق...... گجرات

شملہ مرچ بریانی

اجزا:۔

مٹن	ایک کلو
چاول باسمتی	ایک کلو
لہسن کے جوئے	چھ عدد
ثابت دھنیا	ایک چائے کا چمچ
سونف	ایک چائے کا چمچ
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچ
کالا زیرہ	ایک چائے کا چمچ
پیاز (کٹی ہوئی)	تین عدد
ٹماٹر (کٹے ہوئے)	چار عدد
شملہ مرچ (لمبائی میں کٹی ہوئی)	آدھا کلو
آلو (لمبائی میں کٹے ہوئے)	آدھا کلو
ہری مرچ (لمبائی میں کٹی ہوئی)	دو عدد
دہی	ایک کھانے کا چمچ

نمک	حسب ذائقہ
سرکہ	ایک کھانے کا چمچ
زردہ کا رنگ	چوتھائی چائے کا چمچ
لہسن ادرک کا پیسٹ	ایک کھانے کا چمچ
تیل	ایک پیالی

ترکیب:۔

گوشت میں ثابت لہسن، ثابت دھنیا، سونف، کالا زیرہ، سفید زیرہ اور نمک ڈال دیں۔ پانچ پیالی پانی ڈال کر گوشت گلنے تک پکائیں۔ گوشت گل جائے گوشت الگ کرلیں اور یخنی چھان لیں۔ ایک دیگچی میں تیل گرم کرکے پیاز کو براؤن کریں۔ لہسن ادرک پیسٹ ڈال دیں۔ شملہ مرچ ڈال کر دو منٹ تک فرائی کریں۔ اس کے بعد آلو اور ٹماٹر ڈال دیں۔ ساتھ ہی دہی، لال مرچ ڈال کر دو منٹ تک بھونیں۔ گوشت ڈال کر بھونیں۔ ساتھ ہی ہری مرچیں بھی ڈال دیں۔ اس کے بعد چاول ڈال دیں۔ یخنی کا پانی ڈال کر تیز آنچ پر پکائیں جب پانی خشک ہوجائے تو زردے کا رنگ تھوڑے سے پانی میں گھول کر ڈال دیں۔ سرکہ ڈال کر پندرہ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ سلاد اور رائتے کے ساتھ پیش کریں۔

ماہ وش عادل......کراچی

کھڑے مصالحے کی ماش کی دال

اجزا:۔

ماش کی دال	دو پیالی
نمک	حسب ذائقہ
پیاز (باریک کٹی ہوئی)	ایک عدد درمیانی
ادرک لہسن پسا ہوا	ایک چائے کا چمچ
لال مرچ پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچ
ہلدی پسی ہوئی	آدھا چائے کا چمچ
دودھ	ایک پیالی
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچ
لہسن باریک کٹا ہوا	چھ سے آٹھ عدد
ثابت لال مرچیں	چار سے چھ عدد
کوکنگ آئل	چار سے چھ کھانے کے چمچ

ترکیب:۔

دال دھو کر دو پیالی نیم گرم پانی میں بیس سے پچیس منٹ کے لیے بھگو دیں پھر دودھ شامل کرکے دیگچی میں ڈال کر ابال لیں۔ پیاز، ادرک، لہسن، لال مرچ اور ہلدی شامل کرکے اتنی دیر پکائیں کہ دال گل جائے۔ فرائنگ پین میں کوکنگ آئل کو درمیانی آنچ پر تین سے چار منٹ گرم کرکے سفید زیرہ، لہسن اور لال مرچیں ڈال کر فرائی کریں اور یہ بگھار دال کے اوپر ڈال دیں پھر نمک ملا کر دال کو ڈھک کر چار سے پانچ منٹ کے لیے ہلکی آنچ پر دم پر پکائیں اور چولہے سے اتار لیں۔

ٹپ: مزیدار بنانے کے لیے دال کو مکھن یا مارجرین کے ساتھ پیش کریں۔

عروج زہرہ......راولپنڈی

اربین رائس

اجزا:۔

چاول	آدھا کلو
شملہ مرچ	دو عدد
چکن پیس	ایک پاؤ
نمک	ایک چائے کا چمچ
چکن پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچ
سفید مرچ	ایک چائے کا چمچ
سرکہ	چار کھانے کے چمچ
پیلا رنگ	ایک چٹکی
کشمش	ایک چوتھائی کپ

ترکیب:۔

چاول ابال لیں۔ اب ایک پین میں چار کھانے کے چمچ آئل لیں اور اس میں شملہ مرچ ابلی ہوئی چکن پیس، نمک اور چکن پاؤڈر، سفید مرچ سرکہ کشمش ڈال کر فرائی کریں اور پھر ابلے ہوئے چاول ڈال کر مکس کریں اور پیلا رنگ ڈال کر پانچ منٹ دم دیں۔

حرا کنول......میر پور خاص

چھوہاروں کا حلوہ

اجزا:۔

چھوہارے	آدھا کلو
شکر	ایک پاؤ (زیادہ میٹھا پسند ہو تو شکر کی مقدار بڑھا لیں اپنی پسند کے مطابق)
دودھ	ایک کلو
اخروٹ (چھوٹے ٹکڑوں میں)	ایک چھٹانک
بادام (درمیان سے دو ٹکڑے کرلیں)	آدھا پاؤ
کشمش (کچھ دیر کے لیے پانی میں بھگو کر صاف کرلیں)	ایک چھٹانک
گھی	ایک پاؤ

ترکیب:۔

چھوہارے کو ایک گھنٹے کے لیے پانی میں بھگو دیں پھر چھوہارے کی گھٹلیاں نکال کر اچھی طرح صاف کرلیں، دودھ میں چھوہارے ڈال کر بوائل کریں (دودھ میں ایک کلو پانی شامل کریں) جب چھوہارے گل جائیں تو چھوہاروں کو پیس لیں۔ اب گھی گرم کریں، اس میں پسے ہوئے چھوہارے اور شکر ڈال کر اچھی طرح بھونیں، حلوے کا پانی اچھی طرح خشک ہوجائے اور گھی نظر آنے لگے تو اخروٹ، کشمش، بادام ڈال کر مکس کرلیں۔ حلوہ تیار ہے۔

آصفہ سلطان...... حیدرآباد

هرے لہسن کا قیمہ

اجزا:۔

باریک قیمہ	ڈیڑھ پیالی
ہرا لہسن	۲۰۰ گرام
انڈے	چار عدد
چیڈر چیز (پنیر)	تین چوتھائی پیالی
کالی مرچ پسی ہوئی	آدھا چائے کا چمچ
اجوائن	آدھا چائے کا چمچ
کوکنگ آئل	چار کھانے کے چمچ

ترکیب:۔

بھنا ہوا قیمہ پکانے کے لیے دو سو گرام قیمے کو صاف دھو کر پین میں ڈالیں اور اس میں ایک چائے کا چمچ پسی ہوئی ادرک، حسب ذائقہ نمک، ایک چائے کا چمچ پسی ہوئی لال مرچ، آدھا چائے کا چمچ ہلدی، آدھی پیالی ٹماٹر کا پیسٹ اور دو کھانے کے چمچ تلی ہوئی پیاز ڈال کر ہلکی آنچ پر پکنے رکھ دیں۔ جب قیمے کا اپنا پانی خشک ہوجائے تو اچھی طرح بھون کر چولہے سے اتار لیں۔ لہسن کو دھو کر اچھی طرح خشک کرلیں اور باریک چوپ کرلیں چیز (پنیر) کو کش کرکے رکھ لیں۔ پھیلے ہوئے لگن یا تسلے میں ایک کھانے کا چمچ کوکنگ آئل لگالیں اور اس میں بھنا ہوا قیمہ پھیلا کر ڈالیں پھر اس پر کٹا ہوا لہسن ڈال کر اوپر سے گرم کیا ہوا آئل ڈال کر ڈھک دیں۔ تین سے چار منٹ کے بعد اس میں انڈے ڈالیں اور کناروں پر کش کیا ہوا چیز ڈال کر اوپر سے اجوائن اور کالی مرچ چھڑک دیں۔ اسے درمیانی آنچ پر تین سے چار منٹ رکھیں تاکہ انڈے مکمل طور پر پک جائیں۔ اس مزیدار ڈش کو گرم گرم باجرے یا چاول کی روٹی کے ساتھ پیش کریں۔

نورین انجم اعوان...... کراچی

ہرا مصالحہ چکن

اجزا:۔

چکن	ڈیڑھ کلو
زیرہ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچ
ہرا دھنیا	آدھی پیالی
ادرک لہسن (پسا ہوا)	ایک کھانے کا چمچ
تلی ہوئی پیاز	ایک کھانے کا چمچ
گرم مصالحہ	آدھا چائے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ

ہری مرچیں	پانچ عدد
پودینے کے پتے	آدھی پیالی
تیل	آدھا کپ

ترکیب:۔
چکن میں نمک اور لیموں کا رس ملا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں اس کے بعد باقی تمام اجزا کو پیس لیں اور اس آمیزے کو چکن پر لگا کر مزید آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں پھر ہلکی آنچ پر پکائیں جب پانی خشک ہوجائے اور چکن پک جائے تو اتار لیں (چاہیں تو اوون میں بھی بیک کرسکتے ہیں) مزے دار ہرا مصالحہ چکن تیار ہے۔
انجم انجم اعوان......کراچی

سندھی بھری مچھلی

اجزاء:۔

مچھلی	ایک کلو
نمک	حسب ضرورت
ہلدی	چائے کا چمچ
لیموں	۲ چائے کا چمچ

استفنگ کے لیے

پیاز	۲ عدد
ہری مرچ	۳/۴ عدد
پسی لال مرچ	چائے کا چمچ
املی کا گودا	۳ کھانے کے چمچ
لہسن	۴/۶ جوئے
تازہ دھنیا	ایک کپ
پسا دھنیا	ایک کھانے کا چمچ
نمک	حسب ضرورت
ادرک	۲ انچ کا ٹکڑا
ہلدی	آدھا چائے کا چمچ
تیل	ایک کھانے کا چمچ

سلاد کے لیے

پیاز	۲ عدد
ٹماٹر	۲ عدد
لیموں	۲ عدد
کھیرا	ایک عدد

ترکیب:۔
مچھلی کو نمک، ہلدی اور لیموں کا رس لگا کر میری نیٹ کریں۔ دھنیا، ہری مرچ لہسن اور ادرک کو پیس لیں ساتھ میں پسی پیاز شامل کرکے خوب مکس کرلیں پھر پسا مصالحہ، املی کا گودا اور ایک کھانے کا چمچہ گھی ڈال کر پکائیں۔ اب مچھلی پر لگائیں اور فوئل پیپر سے لپیٹ دیں۔ اوون میں ۱۸۰ ڈگری سینٹی گریڈ پر ۲۵ سے ۳۵ منٹ تک بیک کریں۔ جب گولڈن ہوجائے تو نکالیں اور سرو کریں۔
شبنم کنول......ملتان

تکہ بوٹی

اشیاء:۔

گوشت بغیر ہڈی کا	ایک کلو
گرم مسالا پسا ہوا	دو چائے کے چمچ
لہسن	ایک پوتھی
دہی	150 گرام
ادرک	2 انچ کا ٹکڑا
گھی	150 گرام
نمک، مرچ	حسب ذائقہ

ترکیب:۔ سب پسے ہوئے مسالوں کو دہی میں ملا کر گوشت کے ٹکڑے اس میں شامل کرلیں اور کچھ گھنٹوں کے لئے رکھ دیں، پھر ان ٹکڑوں کو سیخوں پر چڑھا کر کوئلوں پر سرخ کرلیں، اوپر سے چمچے سے گھی ڈالتی جائیں۔ جب خوب سرخ ہوجائے تو اتار لیں اور سلاد کے ساتھ پیش کریں۔
روبینہ زکریا روبی، چک کھاتاں

alam@naeyufaq.com

موجِ سخن

زینب احمد

محبت

میری محبت
کا موازنہ کرتے ہو
کسی اور سے
گلہ کرتے ہو
میری لاپروائی کا
میری محبت کا
تقابل کسی اور سے
ہاں میں بس
یہ دعا کرتی ہوں کہ
جب تم کہیں جانے لگتے ہو
تم پر معوذتین
پڑھ کر پھونکتی ہوں
تمہیں رب کی
امان میں دیتی ہوں
جب تک تم گھر نہیں لوٹتے
میں بے چین رہتی ہوں

سعدیہ ہما شیخ..... سرگودھا

وقت گزرنے سے

وقت کے گزرنے سے
ساحلوں پہ تنہا چلنے سے
تیرے مکر جانے سے
بات بدل جانے تک
کچھ بھی تو نہیں ہوتا
ہاں مگر اک لمحے میں
سانس ٹھر جاتی ہے
سانس بھی وہ جو زندگی
کہلاتی ہے
اور
کچھ نہیں ہوتا

ثمیرا ستار رانجھانی..... حیدرآباد

حاصل

غم گسار غم نہیں طوفانِ غم میں اب کوئی
زندگی کی ڈوبتی ناؤ کا ساحل موت ہے
آئے دن اٹھتے جنازے دیکھ کر ہم پر کھلا
زندگی اے زندگی بس تیرا حاصل موت ہے

راؤ تہذیب حسین تہذیب..... رحیم یار خان

بیٹے محمد زوحان کے نام

تیرے ملنے کی امید پہ
گزرے میرے شب و روز
اِک اِک پل بیتا تیری یاد میں
تیرے ہر خیال نے دی
مسکان میرے چہرے کو
جاگتی آنکھوں نے دیکھے
خواب تیرے، بہت
پر، ہر خواب کے مقدر میں
کہاں ہے تعبیر ہو جانا
کچھ خوابوں کی قسمت ہے
آنکھوں کے نیر ہو جانا
میں بھول سکوں گی نا تا حیات تجھے
جب تک میری آنکھیں دیکھیں گی
نیا دن میری سانسوں کی
سنسناہٹ تھمے گی نہیں
تب تک تم میرے دل میں
میری دھڑکن کی طرح دھڑکو گے
بن کے آنسو کبھی آنکھوں سے تو کبھی
میرے دل میں بہتے رہو گے
مجھے تم سدا یاد رہو گے

میری باتوں میری خلوت میں
سدا آباد رہو گے

مدیحہ نورین مہک...... گجرات

نیا سورج

نیا سورج ہے اگنے کو
پرانی سب خطاؤں کو
چلو ہم بھول کر
نئے دن کا حسیں آغاز کرتے ہیں
نئے دن کو ہم اپنی زندگی کے نام کرتے ہیں
نئے دن کو ہم اپنے رب کی
بندگی کے نام کرتے ہیں
نیا سورج ہے اگنے کو
چلو پھر سے سفر آغاز کرتے ہیں
صبح آغاز کرتے ہیں

سباس گل...... رحیم یار خان

اک خوش بو

شہر میں دھوم مچی رہنے دے
آگ اک دل میں لگی رہنے دے
مری آنکھوں میں لہو آتا ہے
اِک خوش بو تو رچی رہنے دے
یاد آتے ہیں بچھڑنے والے
یہ بساط آج بچھی رہنے دے
کیا ضروری ہے میرے مالک تو
زیست میں کوئی کمی رہنے دے
یاد پھر آیا ہے کوئی انصر
میری پلکوں پہ نمی رہنے دے

نعیم انصر ہاشمی...... جھنگ

دل کی پیاس

چاہت کا احساس جگا کر چلے گئے
دل میں پیار کے دیپ جلا کر چلے گئے
دھرتی کی جو پیاس بجھانے آئے تھے
وہی دل کی پیاس بڑھا کر چلے گئے
جن کی خاطر نیندیں بھی قربان ہوئیں
آنکھوں میں کچھ پیاس بڑھا کر چلے گئے
دن کٹتا ہے، چین سے نہ ہی رات کٹے
کیسے کیسے روگ لگا کر چلے گئے
میرے آنگن کی یہ خوش بو کہتی ہے
چپکے چپکے سے وہ آ کر چلے گئے

فریدہ جاوید فری...... لاہور

خواب

سہانے خواب
آنکھوں میں سجا کر
اپنی منزل پہ پہنچی جس دم
تو اس نے کہہ دیا
اے نجم انجم
کر چکا ہوں کسی اور سے محبت
یہ سنتے ہی بکھر گیا وجود
اور......
جتنے خواب سجائے تھے آنکھوں میں
وہ سب موتیوں کی مانند
نینوں سے بہہ کر
رخسار کو چھو کر
مری آغوش میں رکھے
حنا آلود ہاتھوں میں جذب ہو گئے

نجم انجم اعوان...... کراچی

میرے چارہ گر

میرے چارہ گر مجھے کیا خبر
تو بس رہا ہے کس دیس میں
کس بھیس میں
تجھے ڈھونڈتی پھرتی ہوں میں، قریہ قریہ نگر نگر
میں سمجھ رہی تھی جسے رہبر
وہ تو میرا وہم، میرا خیال تھا
کسی راہ زن کا وہ جال تھا
میرے پاس، اور بھی پاس آ

تجھے دیکھ لوں بھر کے نظر
میرے چارہ گر
میری آنکھ میں تو ہی نور ہے
تو تھا لاپتا، مجھے تو بتا
کس کی نظر کا قصور ہے؟
میری آس تو، میرے پاس تو
میں تو عام ہی ہوں اور خاص تو
نہ تو نے لی خبر او بے خبر
مان جا اب، ضد نہ کر
میرے چارہ گر

رضوانہ وقاص...... ہری پور کرلاں

دل لگا لوں

تمہارا ہجر منا لوں اگر اجازت ہو
میں کسی سے دل لگا لوں اگر اجازت ہو
تمہارے بعد بھلا کیا ہیں وعدہ و پیماں
بس اپنا وقت گنوا لوں اگر اجازت ہو
جنوں وہی ہے، وہی میں، مگر ہے شہر نیا
یہاں بھی شور مچا لوں اگر اجازت ہو
کسے ہے خواہش مرہم گری مگر پھر بھی
میں اپنے غم دکھا لوں اگر اجازت ہو
تمہاری یاد میں جینے کی آرزو ہے ابھی
کچھ اپنا حال سنبھالوں اگر اجازت ہو

مسز فرخندہ...... ملتان

خواب

میں نے بارش کے پانی سے
خیالوں ہی خیالوں میں
بنائی اک سنہری جھیل
اس میں تھے ہم اور تم
ہنستے مسکراتے کھلکھلاتے
اچانک پھر کیا ہوا تم کو
ہاتھ چھڑا لیا تم نے
کنارے تک نہ پھر تم نے
پیچھے مڑ کے دیکھا
اس جھیل کا سپنا ٹوٹ گیا
اور اس کا سارا پانی
میری آنکھوں میں امڈ آیا

سید عبادت راج...... ڈیرہ اسماعیل خان

چاندنی راتوں میں

ڈوبتے سورج کو دیکھ کر
یہ سوچ کروٹ لیتی ہے اکثر
بے ثبات باتوں میں
چاندنی راتوں میں
عکس تمہارا ہوتا
جیون کی راہوں میں
جلتی بجھتی شاموں میں
تو ہم سفر ہمارا ہوتا
کاش تو اک چاند
میں اک تارا ہوتا
دنیا سے دور آشیاں ہمارا ہوتا
ہم تو منتظر ہی رہے ڈوبنے سے پہلے
کاش اک بار ہی سہی
تو نے ہمیں پکارا ہوتا

ماریہ طفیل پارس...... چکوال

تیرے ہجر میں

آگہی کے جب در وا ہوئے
با وفا جو تھے وہ بے وفا ہوئے
زخم تھے جو سلے ہوئے
نئے سرے سے ہرے ہوئے
اپنے جو تھے وہ اب عدو ہوئے
آگہی کے جب در وا ہوئے
صعوبتیں جو اٹھائی تھی تیرے ہجر میں
اس ہجر بے کراں سے پھر آشنا ہوئے
وہ اک لمس گریزاں آگہی بے سوز
ایسی راکھ چراغ تلے راکھ ہوئے

نورالشال شہزادی.....کھڈیاں قصور

اپنے آنسو

زندگی گلشن کے گلوں میں سے اِک گلاب لگے
زندگی ان گلوں کے سنگ کتنی شاداب لگے
مسکرا اٹھے بے ساختہ گر کوئی میرے لیے
پھر آپ اپنے آنسو ہی مجھے خواب لگے
بوجھ اٹھاتے ننھے ہاتھوں کو کوئی تھام لے
زندگی پھر اپنی ہی اسے نایاب لگے
کام سب کے آ، صورت نہ دیکھ کر رک
نیت دیکھ تو اپنی پھر صورت بھی مہتاب لگے
عمل رکھے جو سارے ہی اچھے اس دنیا میں نور
آخرت کیا اس دنیا میں ہی لحد اس کی گلاب لگے

ماہم نورانصاری.....حیدرآباد

آنکھیں

جھلمل جھلمل راتیں ہیں
بالکل تیری آنکھوں سی
کچھ میٹھی میٹھی باتیں ہیں
بالکل تیری آنکھوں سی
من میں ہلچل مچتی ہے
دل میں دردسا اٹھتا ہے
خوب عشق کی سوغاتیں ہیں
بالکل تیری آنکھوں سے
جیسے ندی کا ٹھہرا پانی ہو
اور دکھ کا کنکر آن گرے
یوں ہلکورے لیتی یادیں ہیں
بالکل تیری آنکھوں سی
دل ہلکا ہلکا جلتا ہے
جیسے گیلی لکڑی سلگتی ہے
کچھ ادھوری سی مرادیں ہیں
بالکل تیری آنکھوں سی

مدیحہ کنول سرور.....چشتیاں

ایک معصوم کی التجا

ماں
میں واپس نہ آؤں
تو رونا نہیں
تڑپنا نہیں
یہ اشک بچار کھنا
جب بلائے گی منزل میری
تب اپنی آنکھیں بچھا دینا
مسکرا دینا
بھیگی پلکوں سے
اے ماں
تیرے لال کی
ضرورت ہے اس مٹی کو
آزمائش آن کھڑی ہوئی ہے
ایک بار پھر ماں
دشمن میری آبرو کے ساتھ
کھیل، کھیل رہا ہے
مجھے دعا دو
تیرے لب پر رہے گا
ایک ہی ذکر
شہادت ہو تیرا نصیب
سر کٹا دوں، دشمن سے لڑتے لڑتے
اے ماں میں واپس نہ آؤں تو
تو رونا نہیں تڑپنا نہیں

ملالہ اسلم.....خانیوال

shukhi@naeyufaq.com

شوخیٔ تحریر

ہما ذوالفقار

حمد نوٗالجلال

مری ہستی کو سجا دے تو خدایا میرے
مرے جذبوں کو جلا دے تو خدایا میرے
کر عنایت وہی سجدہ جو تجھے آئے پسند
مری سانسوں میں مینا دے تو خدایا میرے
ہر گھڑی تجھ کو پکاروں تجھی سے چاہوں مدد
شمع بزم ہدیٰ دے تو خدایا میرے
اپنے محبوب کی الفت کا سہارا دے کر
دل کو گل باد صبا دے تو خدایا میرے
ترے اذکار میں گم ہو کے بھلادوں خود کو
یوں گناہوں سے پناہ دے تو خدایا میرے
روتا دیکھوں نہ کسی کو کبھی میں رنج و بلد سے
ہر کسی کو ہی شفا دے تو خدایا میرے
دنیا داری کی چکا چوند سے پرے رکھنا مجھے
مری آنکھوں کو حیا دے تو خدایا میرے
ہم ہیں کمزور تو طاقت کا بنا منبع ہمیں
دین کے دشمن کو مٹا دے تو خدایا میرے
تری سودا نے نیابت کا علم تھام لیا ہے
سوئے مسلم بھی جگا دے تو خدایا میرے

کوثر خالد سودا...... جڑانوالہ

پیارے آقا کا پسینہ مبارک

سرکار دو عالم ﷺ کے رخ انور پر پسینے کے قطرات موتیوں کی طرح دمکتے تھے اور اس میں مشک و عنبر سے بڑھ کر خوشبو رہتی تھی۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا ایک چمڑے کا بستر حضور ﷺ کے لیے بچھا دیتی تھیں اور آپ ﷺ اس پر دوپہر کو قیلولہ فرمایا کرتے تھے تو آپ کے جسم اطہر کے پسینے کو وہ ایک شیشی میں جمع فرمایا کرتی تھیں اور اس کو اپنی خوش بو میں ملا لیا کرتی تھیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی وصیت تھی کہ میری وفات کے بعد میرے کفن اور بدن میں وہی خوش بو لگائی جائے جسے رسول ﷺ کے جسم اطہر کا پسینہ ملا ہوا ہے۔

سز فرخندہ...... ملتان

حضرت محمد ﷺ کے چند معجزات

❖ آپ ﷺ کا سایہ کبھی زمین پر نہیں پڑتا تھا۔
❖ آپ ﷺ پر کبھی مکھی نہیں بیٹھی۔
❖ آپ ﷺ جیسے آگے دیکھتے تھے ویسے ہی پیچھے دیکھتے تھے۔
❖ جس جانور پر سوار ہوئے وہ کبھی نہیں بھاگا۔
❖ آپ ﷺ کے پسینے میں خوش بو تھی۔
❖ جس پانی میں اپنا لعاب دہن ڈالتے وہ میٹھا ہو جاتا۔
❖ آپ ﷺ کو پتھروں اور درختوں سے سلام کی آواز آتی تھیں۔

شہرین اسلم...... بہاولپور

اچھی باتیں

○ کوئی تمہارا دل دکھائے تو ناراض مت ہونا کیونکہ قدرت کا قانون ہے، جس درخت پر پھل زیادہ میٹھا ہو تو لوگ اسی کو پتھر بھی مارتے ہیں۔
○ جو اپنوں کے ساتھ سینگ لڑانے میں لگے رہتے ہیں وہ خود دشمن کا شکار بن جاتے ہیں۔ اپنوں کے ساتھ الجھ کر دشمن کو موقع مت دیں۔

بیہ وڑائچ...... گجرات

مسکراہٹ

بیوی اپنے شوہر سے۔ ”تم مجھے ایسی دو باتیں بولو کہ ایک سے میں خوش ہو جاؤں اور دوسری سے غصہ آ جائے۔“
شوہر: ”تم میری زندگی ہو، اور لعنت ہے ایسی زندگی پر۔“

جویریہ...... ہیڈ بکائنی

جب زندگی شروع ہوگی

لرزتے ہوئے یہ دل مجرموں کے دل تھے یہ غافلوں، متکبروں، ظالموں، قاتلوں اور سرکشوں کے دل تھے یہ زمیں کے فرعونوں اور جباروں کے دل تھے یہ اپنے دور کے اور زمانے کے ناخداؤں کے دل تھے یہ دل ان لوگوں کے تھے جو گزری ہوئی دنیا میں ایسے جیے جیسے انہیں مرنا نہ تھا مگر جب مرے تو ایسے ہوگئے گویا کبھی دھرتی پر بسے ہی نہ تھے یہ خدا کی بادشاہی میں خدا کو نظر انداز کرنے والوں کے دل تھے یہ مخلوق خدا پر اپنی خدائی قائم کرنے والوں کے دل تھے۔ یہ انسانوں کے درد اور خدا کی یاد سے خالی دل تھے۔

انتخاب: ظہیر ملک...... ہارون آباد

انمول موتی

+ برائی کا موقع ہو اور برائی نہ کرو تو یہ ایک بہت بڑی نیکی ہے۔

+ بے بس انسان کا سجدہ ہی بے بسی کا علاج ہے۔

+ انسان زندہ ہونے کے باوجود زندگی کو نہیں سمجھ سکتا وہ مرے بغیر موت کو کیسے جان سکتا ہے۔

+ بانٹنے سے خوشی اس طرح بڑھتی ہے جس طرح زمین میں بویا ہوا بیج فصل بنتا ہے۔

+ ایمان دار آدمی کا ہر کام اس کے لیے اچھا ہے اسے جب خوشی حاصل ہوتی ہے تو وہ شکر ادا کرتا ہے۔

+ اچھا ہمسایہ خدا کی نعمت ہے۔

+ کتنی بری بات ہے کہ تم شیطان کو کوستے ہو لیکن در پردہ اس کے دوست ہو۔

پروین افضل شاہین...... بہاولنگر

ایک خواب

جب یہ پوچھا رونقیں کیسی ہیں میرے کشمیر میں
جشن ہے وہاں آزادی کشمیر کا
کان میں کہہ دے کوئی تہذیب تو میں جی اٹھوں
مژدہ لائی ہے صبا آزادی کشمیر کا

راؤ تہذیب حسین تہذیب...... رحیم یار خان

عزت

کبھی بھی کسی کو اتنی عزت مت دو کہ آپ کی بے عزتی کرنا وہ اپنا حق سمجھ لے۔

صائمہ منظور...... کہروڑ پکا

مسکراہٹ

پتا ہے ہماری اور تمہاری مسکراہٹ میں فرق کیا ہے۔
تم خوش ہو کر مسکراتے ہو اور ہم تمہیں خوش دیکھ کر مسکراتے ہیں۔

دیا صفدر...... مظفر گڑھ

سنہرے حروف

❁ زبان کو سوچنے سے پہلے دوڑنے نہ دو۔

❁ انکساری یہ ہے کہ انسان کو غصہ ہی نہ آئے۔

❁ محض لباس سے مردم شناسی نہیں ہوسکتی کیونکہ لباس بنانے والا درزی اور انسان بنانے والا خود اللہ ہے۔

❁ غرور عقل کے لیے آفت ہے۔

بینش انصر ہاشمی...... جھنگ صدر

لطیفہ

ایک خاتون ٹرین میں بیٹھی تھی کہ اچانک بجلی چلی گئی۔ اس عورت نے اٹھ کر زنجیر کھینچی تو اس کے منہ پر زوردار تھپڑ لگا۔ اس نے دوبارہ زنجیر کھینچی تو پھر زوردار طمانچہ اس کے منہ پر لگا۔ جب بجلی آ گئی تو اس خاتون نے پوچھا جب میں زنجیر کھینچ رہی تھی تو میرے منہ پر تھپڑ کس نے مارا۔
پاس بیٹھی خاتون آہستگی سے بولی۔
آپ زنجیر نہیں میری چٹیا کھینچ رہی تھیں۔

رمشا آصف...... خانگڑھ

موت ایک اٹل حقیقت ہے

❤ موت کو اگر حکومت کے ذریعے ٹالا جاسکتا ہے تو فرعون کو کبھی موت نہ آتی۔

❤ موت کو اگر وزارت کے ذریعے ٹالا جاسکتا تو ہامون کو کبھی موت نہ آتی۔

❤ موت کو اگر مال و دولت کے ذریعے ٹالا جاسکتا تو قارون کو کبھی موت نہ آتی۔

♥ اگر موت کو قوت و بازو کے ذریعے ٹالا جاسکتا تو رستم و سہراب کو کبھی موت نہ آتی۔

♥ اگر موت کو دواؤں کے ذریعے ٹالا جاسکتا تو افلاطون و جالینوس کبھی نہ مرتا۔

♥ اگر موت کو وفاؤں کے ذریعے ٹالا جاسکتا تو نیک بیوی اپنی آنکھوں کے سامنے جوان خاوند کو مرنے نہ دیتی۔

♥ اگر موت کو محبت کے ذریعے ٹالا جاسکتا تو کوئی بھی ماں اپنی گود میں معصوم بیٹے کو نہ مرنے دیتی۔ سچ تو یہ ہے کہ موت ایک اٹل حقیقت ہے ہر ذی روح نے اس موت کا مزہ چکھنا ہے۔

بشریٰ رضوان...... چوک شاہدرہ، بہاولپور

دکھ

جب دکھ انتہا پر پہنچ کر بھی کم نہ ہو رہا ہو تو ضرور سوچنا کہ تم کبھی کسی کے مجرم تو نہیں رہے اگر یاد آ جائے تو معافی مانگنے میں تاخیر نہ کرو کیونکہ دنیا کے دکھ تو آخرت کی سختی کے سامنے کچھ بھی نہیں ہیں۔

وشی ملک...... خانگڑھ

لفظ گل

یہ زندگی بڑی ہی عجیب ہے ہر پل نیا موڑ نیا رخ دکھاتی ہے اور پل پل کر کے قطرہ قطرہ حقیقت کا رخ دکھاتی ہے ہر موڑ پر نئی طرز سے آزماتی ہے اور پھر ہر کسی کا مشکل وقت میں اصل روپ و چہرہ دکھاتی ہے ایک بار توڑ کے امیدیں، یقین، ضبط پھر سے مضبوط بناتی ہے۔ ہمیں تھکا کر نئے سرے سے چلنا سکھاتی ہے یہ زندگی بڑی بے رحم الجھی ڈور ہے جو بڑی محنت سے سلجھائی جاتی ہے۔

گلشن چوہدری گل...... گجرات چک محمود

سنہری باتیں

☆ اگر کوئی تم سے جلتا ہے تو بجائے غصہ ہونے کے ان کی جلن کی قدر کرو کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو تمہیں خود سے بھی بہتر سمجھتے ہیں۔ کوئی تم سے روٹھ جائے پھر وہ خود ہی تم سے ملنے کو ترسے تو اسے کبھی مت کھونا کیونکہ وہ تم سے بہت پیار کرتا ہے۔

☆ زندگی دو دن کی ہے اس لیے دو ہی اصولوں سے گزارو، رہو تو پھولوں کی طرح بکھرو تو خوشبوؤں کی طرح۔

مہرین ملک...... خانیوال

میرا تجربہ

محبت اور جنون میں کچھ اس طرح کا فرق ہے کہ محبت ایک احساس کی طرح ہوتی ہے جو ہمیشہ محسوس ہوتی ہے ہر طرف جو مدتوں قائم بھی رہتی ہے لیکن جنون ہے جو وہ محبت سے تھوڑا کم ہوتا ہے جنون ہر چیز کو جلدی حاصل کر لیتا ہے اور جلدی میں ہی ختم ہو جاتا ہے جنون کا کوئی وجود نہیں ہوتا یہ کب ختم ہو جائے پتا ہی نہیں چلتا کوشش کریں زندگی میں محبت حاصل کریں جنون نہیں۔

ثمرہ گلزار...... کوٹلی گجرات

فکر

۞ جو شخص ہمیشہ تمہاری خوشی چاہے اس کا اداس ہونا تمہارے لیے فکر کی بات ہونی چاہیے۔

۞ محبت دور کے لوگوں کو قریب اور عداوت قریب کے لوگوں کو دور کر دیتی ہے۔

۞ ایسے شخص کو کبھی مت گنوانا جس کے دل تمہارے لیے محبت، فکر، عزت اور چاہت ہو۔

خدیجہ ثقلین...... جلالپور جٹاں

محبت کی تجدید

یوں تو محبت ایک نادیدہ چیز ہے اسے شاید محسوس کیا جاسکتا ہے اپنے عمل سے، سوچ سے، باتوں سے، ذکر سے مگر سامنے والے کو ہمیشہ یہ نا قابل فہم لگتی ہے کیونکہ وہ یہ نہیں سوچتا جو ہم سوچ رہے ہوتے ہیں ہم محبت میں دبے ہوتے ہیں اور وہ اسے نا سمجھی خیال کرتے ہیں لیکن حقیقتاً محبت صرف انسان کو اپنے تابع کر لیتی ہے اور دل و دماغ حتیٰ کہ زباں تک پر قابض ہو جاتی ہے پھر آنکھیں بھی محبت کے سوا کسی چیز کو دیکھنے کی روادار نہیں ہوتیں۔

یوں خیال محبت کا چھایا رہے گا
تجھے تکتے تکتے ہم کھونے لگے

یہ پراسرار یہ پنہاں سے راز تھے جو
دھیرے دھیرے ہم پہ واہونے لگے
عائشہ شکیل......گوجرہ

سچھ لو

- نہ اتنا میٹھا بنوں کہ لوگ تمہیں نگل لیں، نہ اتنا کڑوا بنوں کہ لوگ تمہیں تھوک دیں۔
- اللہ تعالیٰ کی اتنی عبادت کرو جتنا تم اس کے محتاج ہو۔
- آخرت کی اتنی ہی تیاری کرنا جتنا تم نے وہاں جا کر رہنا ہے۔
- گناہوں پر اتنی جرأت کرنا جتنا جہنم کی آگ میں جلنے کا حوصلہ ہو۔
- جب کوئی گناہ کرنے کا ارادہ کرو تو پھر ایسی جگہ تلاش کرنا جہاں پر اللہ تعالیٰ نہ دیکھ سکے۔

رافیہ کنول......دائرہ دین پناہ

بھلا یہ کیسی محبت ہے؟

محبت ایک انتہائی حسین جذبہ ہے اس کی مہک کو جتنا چھپایا جائے نہیں چھپتی۔ عاشق اور محبوب کا رشتہ بھی بڑا عجیب ہوتا ہے عاشق عشق میں پاگل ہورہا ہوتا ہے اور محبوب بے پروا۔ محبت میں رسوائی ملتی ہے، محبوب کی محبت مل جائے تو یوں لگتا ہے کہ دنیا کی ساری مسرتیں خود قدموں میں آ گئی ہوں۔ محبوب کی محبت سے محروم ہوجائے تو دنیا کے سارے غم یوں لگتا ہے کہ اسی کے پاس آ گئے ہوں۔ اس دنیا میں جو کوئی بھی محبت کرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ اپنے محبوب کی نظروں میں بھی محبوب ہوجائے ہے نا یہی بات؟ میں آپ کو ایسی محبت سے آشنا کرنے والی ہوں۔

ذرا سوچیں میں اور آپ اس بات کے دعویدار ہیں کہ ہم مسلمان ہیں، ہم اکثر یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ کے عاشق ہیں لیکن حیرت ہے کہ میں اور آپ کیسے عاشق ہیں جنہیں اپنے محبوب کی فکر نہیں اپنی دنیا میں مست ہیں حالانکہ ہمارا محبوب یعنی اللہ تعالیٰ جو ہم سے ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو راتوں کو جاگ جاگ کر ہمارے لیے دعائیں مانگا کرتے تھے، ہماری خیر خواہی کے لیے اپنے اللہ کے حضور رویا کرتے تھے لیکن سمجھ نہیں آتا کہ اس معاملے میں ہم محبت کے مفہوم پر پورے کیوں نہیں اترتے، ہم نے محبت جو دنیا کا وسیع العرض موضوع ہے اس کو بدل ڈالا ہے نہ ہمیں اپنے محبوب کی فکر ہے اور نہ اس محبت کی جس کو حاصل کرنے کی عاشق تگ ودو کرتا ہے۔ بتائیں کہ یہ کیسا عاشق و محبوب کا رشتہ ہے؟ جہاں ہر محبوب فکر مند ہے مگر عاشق کو پروا نہیں آئیں ہم سب مل کر اپنے محبوب کو راضی کریں۔ وہ جس کام پر خوش ہے اسے اختیار کریں اور اس کی نظروں میں ہم بھی محبوب بن جائیں، اس کے بتائے ہوئے طریقوں کو اپنائیں اور اس کی محبت سے فیض یاب ہوں۔ یہ ایسی محبت ہے جس میں رسوائی نہیں پذیرائی ہے، جس شخص کو اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہوجائے قرب حاصل ہوجائے تو دنیا کی ساری راحتیں، مسرتیں نیز ہر دنیا آخرت کی خوشی اس کا مقدر بن جاتی ہے اور جو شخص اس محبت سے محروم رہ گیا وہ رسوا ہوگیا۔ پریشانیاں اس کا مقدر بن گئیں، چلیں میں اور آپ یعنی ہم سب مل کر اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں اور صحیح معنوں میں دین کے پیروکار بن جائیں۔ میں اور آپ ایسے کام کرنے کی کوشش کریں کہ اللہ کی نظر میں ہم اس کے محبوب بن جائیں، اللہ کی راہ پر چلتے ہوئے اپنے آپ کو فنا کردیں یعنی موت آئے بھی اس حال میں کہ ہم اسی کی راہ پر چلتے ہوں اور اس کی عبادت کرتے ہوں، اللہ ہمیں ایک اچھا مسلمان اور مومن بنادے آمین۔

اے لوگو! آؤ میں تم کو ایسی محبت سے آشنا کردوں
خدا کی راہ پر چلتے رہو اور خود کو فنا کردو

شگفتہ عنایت حیا......کھلابٹ ٹاؤن شپ

husan@naeyufaq.com

حسن خیال

جوہی احمد

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ شروع اللہ کے بابرکت نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ کرونا وبا کی تیسری لہر پاکستان میں کیا آئی کہ ایک بار پھر شہروں کو بند کرنے کی بات ہونے لگی۔ پنجاب کے سات بڑے شہر اس وقت لاک ڈاؤن میں ہیں اللہ رب العزت اس وبا کا جڑ سے خاتمہ فرمائے آمین، بڑھتے ہیں آپ سب کے تبصروں کی جانب۔

غزل اداس بھٹی...... گجیانہ نو۔ السلام علیکم! پیاری جوہی جی آپ کیسی ہیں؟ تمام حجاب فرینڈ آپ کیسے ہیں؟ حیران ناہوں میں پریوں کی ملکہ ”غزل اداس“ ہوں۔ ٹھہریے آپ نہیں جانتے کہ میں کون ہوں؟ میں بتاتی ہوں میں حجاب کی ننھی منی کیوٹ سی قاری ہوں۔ جس نے حجاب اور آنچل جون 2017ء سے پڑھنا شروع کیا تھا۔ مجھے آنچل و حجاب کی ہر تحریر بہت متاثر کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آنچل وحجاب کو دن دگنی رات چگنی ترقی عطا فرمائے، آمین۔ اب بڑھتے ہیں حجاب شمارہ مارچ کی طرف تو جی مسکان مجھے گھور ہی تھی جوابا میں نے بھی گھورنے کی حد کردی (ہاہاہاہا) بہرحال ماڈل کے بال، آنکھیں، ہونٹ اور کپڑے بہت پسند آئے۔ تھوڑا سا آگے کھسکی اور ”بات چیت“ سنی اچھے بچوں کی طرح۔ ”حمد“ اور ”نعت“ جی بہت پسند آئی۔ ”آنگن کی چڑیا“ ارم آصف جی بہت اچھا لگا آپ کو جان کر۔ ”محبت ماہ تمام“ صائمہ جی بہت متاثر کن تحریر تھی۔ اتنی اچھی تحریر لکھنے اور حجاب کو دینے کا شکریہ جی، آگے بھی کچھ اچھا ہی کیجیے گا۔ ”ڈگری“ بس تھوڑی سی اچھی لگی۔ ”مرگ تمنا“ پڑھی نہیں ابھی۔ ”اقرار کا سندیسہ“ فرح نے مجھے تھوڑا متاثر کیا۔ ”چاند منزل کی کومل“ اس میں مجھے کافی حد تک اپنی جھلک نظر آئی۔ فیروز بخت کو مارنا نہیں تھا۔ دکھی ہوگئی میں۔ بہت متاثر کن لگی۔ یہ تحریر بہت کچھ یاد دلا گئی آج۔ ”عشق نگر کے مسافر“ فاریہ کا کیا ہوگا اب؟ شبنم مجھے لگتا ہے ارسل کو ملے گی (تکا)۔ ”تمہاری ادا کا جواب نہیں“ کچھ خاص نہیں لگا جی (معذرت)۔ ”دل کو کس کا ملال تھا“ ڈھیروں مبارکاں جی اینڈ گڈ بلکہ ویری گڈ ہوا۔ باقی افسانے پڑھے نہیں۔ ”میرے سکندر“ کہانی کا اینڈ بہت اچھا ہوا۔ نائس اینڈ تھینکس۔ ماہا بشیر حسین اور وقاص عمر کے شعر دل پر ٹھاہ کرکے لگے، (سچی)۔ ”کچن کارنر“ پسند نہیں آیا (سوری)۔ موج سخن میں وقاص عمر، مدیحہ نورین اور مریم منور کے انتخابات پسند آئے۔ شہرین اسلم آپ کی بات ایک دفعہ پھر ٹھاہ کر کے لگی (سچی)۔ ”حسن خیال“ یہی واحد میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ آپ نئے قاریوں کے تبصرے کیوں نہیں لگاتی آپی جوہی؟ کیا بس دو چار ہی قاری مخصوص کرر کھے ہیں تبصرے کے لیے؟ بھئی نئے قاریوں کے بھی دل ہوتے ہیں خدارا لگا دیا کریں۔ بہرحال ”انشرح ایمان“ آپ کا تبصرہ پسند آیا (سچی میں جھوٹ نہیں بولتی) تبصرے سب کے ہی لاجواب ہوتے ہیں۔ فہمیدہ آنٹی جی میں سب سے پہلے آپ کا تبصرہ پڑھتی ہوں اور جوہی آپی حجاب میں تبصرے بہت کم ہوتے ہیں کیوں، آخر کیوں؟ (زیادتی) میرا تبصرہ شاید بہت تنقیدی ہوگیا ہے (سوری) اور آخر میں انشراح ایمان آپ حافظ آباد سے ہیں تو یہ بھی بتادیں حافظ آباد میں کس جگہ ہیں (ڈونٹ مائنڈ جی) آخر میں تمام حجاب اسٹاف وقاریوں کو ”غزل اداس“ کا پیار ابھرا اسلام۔ اللہ حافظ۔

☆ پیاری غزل! پہلی بار آمد پر خوش آمدید۔ یہ افواہ کسی دشمن نے اڑائی ہے کہ ہم نئی قاری کو جگہ نہیں دیتے۔ ڈاک اگر ہمیں وقت پر مل جائے تو ہم ضرور شامل کرلیتے ہیں اور موج سخن میں انتخاب نہیں ذاتی شاعری شائع کی جاتی ہے۔

گلشن چودھری گل...... گجرات۔ السلام علیکم! کیا حال ہے؟ سب کو رمضان مبارک ہو بہت بہت مگر اللہ اس وبا سے بھی نجات دے، آمین۔ حجاب ملا تو مارچ کو ٹائٹل بس ٹھیک ہی تھا اتنا خاص نہیں تھا۔ ”بات چیت“ پڑھتے انٹرویو پر گئے ارم آصف کا جان کر اچھا لگا۔ قرۃ العین کو ”میرا سکندر“ کمپلیٹ ہونے پر بہت بہت مبارک ہو۔ ”مرگ تمنا“ ماوراطلحہ کا اچھا جا رہا ہے۔ مکمل ناول میں دونوں ناول ہی اچھے تھے۔ افسانے اس بار بہت ملے پڑھنے کو اور تھے بھی سب اچھے ”ڈگری“ حنادیہ احمد نے کافی اچھا لکھا کہ ڈگری سے نہیں پتا چلتا کہ انسان کس طرح کا ہے۔ ”اقرار کا سندیسہ“ بھی

اچھا لگا کہ کئی بار جو دل نہ بھی چاہے وہی قسمت میں لکھا ہوتا ہے اور ہمیں وہی ماننا پڑتا ہے تو اچھا ہے کہ اسے ہی دل کی رضا بنالو۔ ''تمہاری ادا کا جواب نہیں'' اچھی اسٹوری تھی کہ اپنی خوشیاں کسی کو اتنی مت دکھاؤ کہ اپنی خوشیاں ڈھونڈنی پڑ جائیں اور ''آفتاب'' کہانی حقیقت پر مبنی ہے کہ جو شخص آپ کو ساری دنیا کے سامنے نہیں اپنا سکتا وہ آپ کو عزت اور تحفظ کہاں سے دے گا۔ ''الٹا چکر'' جیسا کرو گے ویسا بھرو گے وہی ہما کے ساتھ ہوا۔ ''دہری زندگی'' میں آج کل اپر سوسائٹی کے حقائق واضح کیے گئے۔ ''انتخاب'' میں رشتے مل کر بنے تو ہی بات ہے یوں رشتوں میں بٹوارہ کرنے سے تو رشتے بکھرتے ہیں۔ مستقل سلسلوں میں ''بزم سخن'' میں سب کے شعر بہت پسند آئے۔ سب کے ہی لاجواب تھے۔ ''موج سخن'' میں اپنی غزل دیکھ کر پہلے تو یقین ہی نہیں آیا پھر بہت خوشی ہوئی۔ عائشہ شکیل کی غزل دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ''شوخیٔ تحریر'' میں بھی سب نے بڑھ کر حصہ لیا۔ ''حسن خیال'' میں تبصرے کم تھے مگر اچھے تھے۔ اللہ رکھا بھائی۔ ظہیر ملک بھائی، رمشا، ارم کا بھرپور تبصرہ پسند آیا۔ ارم آصف، رمشا آصف، ظہیر ملک بھائی اور فہمیدہ آپی میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ پھر اگلے ماہ تک کے لیے اللہ حافظ۔

عائشہ شکیل...... گوجرہ۔ السلام علیکم! کیسے ہیں سب رائٹرز، ریڈرز امید واثق ہے کہ سب بخیر و عافیت ہوں گے۔ آنچل مل جائے تو حجاب کا انتظار اور حجاب مل جائے تو آنچل کا انتظار (بھائی شاپ پر گیا کہتے ہیں آپ کی آپی اتنی جلدی پڑھ لیتی ہے ہاہاہاہا) بھئی ہم تو ٹھہرے ان کے شیدائی چاہے کچھ اور کریں نہ کریں۔ ان کے بنا رہنے کا تصور بھی ناممکن سا لگتا ہے۔ بورنگ سی لائف میں جب کوئی یاد کرتا ہے تو ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آجاتی ہے میری دعا ہے اللہ تعالیٰ سب کو خوش رکھے، آمین۔ اب بڑھتے ہیں اپنے پیارے، دلارے، آنکھوں کے تارے حجاب کی جانب۔ ٹائٹل اچھا تھا۔ بھئی اللہ تعالیٰ کی بنائی گئی شاہکار تھی اچھی کیسے نہ ہو۔ ''بات چیت'' میں سعیدہ آپی موسم بہار اور خواتین کے عالمی دن کے بارے میں گفت وشنید فرما رہی تھیں۔ ''حمد و نعت'' سے دل کو مسرور کیا اور آگے بڑھے۔ ارم آصف کا انٹرویو پڑھ کر بہت خوشی ہوئی اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ مسکراتا رکھے اور آپ کے خوابوں کی تکمیل فرمائے، آمین ثم آمین۔ سب سے پہلے پڑھا ''دل کو کس کا ملال تھا'' ہائے شکر ہے اذان اور عائشہ مل گئے اور شرجیل کو اپنے کیے کی سزا مل گئی۔ سارے کرداروں کے ساتھ برابر کا انصاف ہوا لیکن سامعیہ بے چاری تنہا رہ گئی پھر بھی اچھا اینڈ ہو گیا آپی نادیہ مبارک باد قبول کیجیے اللہ آپ کو مزید ترقیاں دے، آمین۔ ''محبت ماہ تمام'' صائمہ قریشی آپی کی ہر تحریر ہی لاجواب اور زبردست ہوتی ہے یہ بھی اچھی جا رہی ہے۔ ریان کو جلدی سے مکمل صحت یاب کر دیں اور سوما کے لیٹرز کی تو کیا ہی بات ہوتی ہے۔ ای میل میں نوک جھونک ویلڈن آپی۔ ''میرے سکندر'' آپی قرۃ العین نے بھی اچھا اینڈ کر دیا چلو شکر ہے ہر کسی کو اس کی مطلوبہ منزل مل گئی اور شاہنواز اور رب نواز بھی حالات اور وقت کے ساتھ ساتھ بدل گئے۔ ''مرگ تمنا'' ابھی نہیں پڑھی۔ سوری ماورا آپی اور پھر پہنچے افسانوں کی دنیا میں۔ افسانے سارے کے سارے ہی سبق آموز تھے۔ ''ڈگری'' واقعی کئی لوگ پڑھ لکھ کر بھی جاہل ہی رہتے ہیں اور احساس نام کی شے تک ان میں نہیں پائی جاتی خود کو پتا نہیں کیا سمجھتے ہیں ویسے بھی ان کے لیے تربیت کی ضرور ہوتی ہے تعلیم کی نہیں۔ ڈگری تو محض آج ایک اچھی جاب کے لیے لی جاتی ہے۔ ''اقرار کا سندیسہ'' زینت راجپوت کی کھٹی میٹھی کہانی بہت پسند آئی اور فرح کے انداز و اطوار پر بہت ہنسی بھی آئی۔ ''تمہاری ادا کا جواب نہیں'' ویسے آج کل ایسا ہی ہے جب تک اپنی ساری باتیں دوسروں کو بتا نہ لیں چین نہیں آتا اندر سے اگلا بے شک جڑیں ہی کاٹ دے جل کر۔ (ہاہاہاہا) ویسے بھی دوسرے کی دل آزاری بھی ہو سکتی ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ ''خاموشی بہترین عبادت ہے'' آفتاب نے ہائے یہ کہانی پڑھ کر جی بہت رونا آیا اور دل کیا کہ آفتاب سامنے ہو تو پھر اس کا خاتمہ کر دوں۔ کائنات بے چاری کی کائنات ہی اجڑ گئی۔ واقعی یہ امیر لوگ پتا نہیں کیوں ایسے ہوتے ہیں سمجھتے ہیں کہ شاید ہم پیسے کے بل بوتے پر کچھ بھی کر سکتے ہیں لیکن افسوس کہ اعمال نامہ میں اپنے گناہوں کی تعداد اس مال و دولت سے نہیں گھٹا سکتے۔ ''دہری زندگی'' بالکل آج کل ایسے ہی ہے۔ ہر کوئی اسی مصنوعی پن کا شکار ہے لوگوں نے وطیرہ بنا کے رکھ لیا ہے فیشن کو۔ ''الٹا چکر'' واقعی آج کل بھی یہی ہو رہا ہے اور یہ دنیا تو پھر مکافات عمل ہے کہ جو بویا وہ کاٹنا ہے۔ ''انتخاب'' واؤ بہت سپر کہانی تھی

شیریں نے جو درد سہا اور ملک تیمور کو بھی معلوم ہو گیا کہ کیسے اپنی انا کی خاطر رشتے قربان ہوتے ہیں جب بات عزیز جان پر آتی ہے تب انا کا جوش وخروش خود ہی مانند پڑ جاتا ہے۔ ''بزم سخن'' میں رخ کومل، تبسم بشیر، سباس گل، نادیہ یاسین، امبر بخاری، فیاض اسحاق، ثناء اجالا، نوشین جاوید، سدرہ محسن، مہ وش فاطمہ، پروین افضل، نور سحر، فریحہ شبیر، کوثر خالد اور ماریہ نذیر کے اشعار لاجواب تھے۔ ''کچن کارنر'' میں حلوہ پوری کی ترکیب اچھی لگی باقی ہم ایسا اول جلول کھا نہیں سکتے تو پھر بنانے کی زحمت بھی کیوں کریں (ہاہاہا) ''موج سخن'' میں سید عبادت راج، راشد ترین، مدیحہ نورین مہک، مریم منور، گلشن چودھری اور سباس گل کی شاعری زبردست تھی۔ ''شوخی تحریر'' میں سب کے الفاظ اچھے تھے اور معنی پنہاں رکھتے تھے سوائے لطیفوں کے (ہاہاہا) ''حسن خیال'' میں رمشا آصف شکریہ ڈیئر۔ ارم آصف میں کہیں غائب نہیں ہوں۔ بس طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ بھائی ظہیر ملک شکریہ میرا تبصرہ پسند کرنے کے لیے باقی سب کے تبصرے اچھے اور شاندار تھے اللہ پاک سب کو خوش رکھے میری طرف سے سب کو رمضان المبارک بہت بہت مبارک باد دعاؤں میں یاد رکھیے گا فی امان اللہ۔

اس حسرت سے اب آپ کے در پر آئے ہیں
کشکول میں تو کچھ محبت رکھیں گے آپ

مسز فرخندہ...... ملتان ۔ آنچل وحجاب کو پڑھنے والی بہنوں کو میرا اسلام۔ مارچ 2021ء کا سرورق معذرت، بالکل بھی پسند نہیں آیا۔ پتا نہیں کس نے ایسا عجیب وغریب سرورق بنایا۔ مارچ میں بہار کی مناسبت سے لگتا مگر ماڈل نے دو جرسیاں پہن رکھی تھیں اور ایسا برا بالوں کا انداز بھئی آئندہ ایسا سرورق نہ لگانا۔ عید پر دلہن کا جاذب سا سرورق دینا جو ہی۔ ''بات چیت'' میں سعیدہ نے اس بار بھی کوئی حجاب میں نئی تبدیلی اور نئے کسی سلسلے کا ذکر نہ کیا بس مارچ کی باتیں کیں۔ بھئی مجھے تو سچ کہوں تو حجاب میں سلسلوں میں دلچسپی کا فقدان نظر آتا ہے کوئی انفرادیت یا خاصیت نہیں۔ کہانیاں حجاب کی ٹھیک ہیں مگر آپ کو لازمی کچھ سلسلے شروع کرنا چاہیے کہ اشعار، غزلیں، خطوط اور کھانے پکانے یہ سلسلے ہر خواتین کے رسالے میں ہوتے ہیں اور ہونے بھی چاہیے کوئی نئی بات نہیں۔ حجاب میں چاروں ہیں مگر ان کے علاوہ بھی چند سلسلے لازمی شروع کیے جائیں کہ حجاب میں کچھ دیسی آئے اور انفرادیت میں تو تنقید برائے اصلاح ہی کرتی ہوں تو کہانیوں سے چاہے وہ ناولٹ ہوں یا سلسلے وار یا افسانے مجھے کوئی شکایت نہیں کہ کہانیاں ٹھیک چل رہی ہیں حجاب میں معیاری اور اصلاحی دلچسپ مگر مستقل سلسلوں کا معیار حجاب میں خراب ہے تو لازمی کوئی سلسلے جلدی سے شروع کریں اولاً تو بھئی ہر رسالے میں کوئی نہ کوئی مذہبی سلسلہ ہوتا ہے۔ اب آنچل میں دانش کدہ اسی طرح حجاب میں بھی لازمی مستقل ہو مذہبی سلسلہ ارے مشتاق بھائی کی کوئی کتاب کو ہی لے آئیں حجاب میں۔ آنچل کی طرح (جو آنچل میں نہ لگی ہو تو) کو حجاب میں لگائیں یہ ضروری ہے مذہبی سلسلہ۔ صائمہ قریشی کا ناول قسط وار ہے اور ذاتی طور پر مجھے قسط وار ہی کہانائیں پسند ہیں کہ انتظار میں زیادہ لطف ہے اور مجھے تو قسط وار کہانی دیکھ کر ہی زیادہ اچھا لگتا ہے خیر سوما کا کردار اچھا ہے اور سلیمہ بیگم بھی کیا کریں جوان بیٹا و بہو اور ان کی اولاد کو کھویا ہے تو کچھ وقت لگے گا ٹھیک ہونے میں۔ منتہا اور بلال کا کردار بھی اچھا لگا۔ صائمہ یہ ناول بھی ''عشق دی ماری'' اور ''ذلت غم عشق'' کی طرح اچھا اور پسند آرہا ہے مجھے تو گڈ ایسے ہی لکھتی رہو اور جو سوچا ہے وہی لکھنا محض قارئین کی وجہ سے اختتام نہ کرنا جو بنتا ہو وہی اینڈ کرنا۔ ہاں آپ لوگ حجاب کو ایسے بھی ترتیب دیا کریں کہ نہ صرف نوعمر لڑکیاں بلکہ خواتین ہر عمر کی دلچسپی سے پڑھ سکیں جیسا کہ خواتین وشعاع کہ ہر عمر کی خواتین پڑھیں اور دلچسپی سے پڑھیں جبکہ ''چاند منزل کی کومل'' تو بھئی اس ماہ کی میری پسندیدہ تحریر رہی کہ عائشہ نے طویل ناول لکھا اور منظر وکردار کشی بھرپوری اور پورے ناول میں دلچسپی برقرار رہی بس مجھے فیروز بخت کی موت کا افسوس ہوا مگر کومل حسن کا ملن اچھا رہا اگرچہ حسن نے موبل کو درمیان میں تنگ کیا مگر شروع میں اس کی شخصیت میں نکھار بھی حسن ہی لایا۔ عائشہ ناز کو مبارک بات اب اگلی بار بھی ایسے ہی آنا عائشہ ''میرے سکندر'' میں سکندر و میرب کی شادی اور امل کا سکندر کی بہن کو چھوڑنا ہی بہتر تھا۔ رائٹر نے قسط وار کے باوجود دلچسپی برقرار رکھی۔ نادیہ احمد نے بھی اینڈ کیا اور نادیہ میں نے یہ ناول شروع سے پڑھا مگر آخر میں لکھنا تبصرہ شروع کیا تو مجھے تو ناول پسند آیا کہ تم نے حقیقت ہی دکھائی۔ عائشہ اور اذان اگرچہ ایک ہو گئے

مگر یہ ناول بھی میرے لیے پسندیدہ ہیں اور تمہارا ''ریگ جو دشت فراق'' ابھی تک یاد ہے اور لفظ محبت کا بھی اب جلدی آنا کہ تم بھی میری پسندیدہ مصنفہ میں سے ایک ہو اور یہ کہ صرف حجاب و آنچل میں نہیں بلکہ تمہیں اور رسائل میں بہت پڑھا ہے۔ ندا حسنین کی یہ قسط جس کے ساتھ ختم ہوئی اور کاش فاریہ وحماد ایک ہوں اور فاریہ کے باپ کو عقل آ جائے ندا لکھتی رہو ایسے ہی اور جب متوقع ہو اینڈ کرنا ارے بھئی قارئین بات یہ ہے کہ کرداروں کو انجام تک پہنچانا ہوتا ہے تو طوالت سے گھبرانا نہیں چاہیے اور یہ ہی بات ''مرگ تمنا'' کے لیے قارئین بہنوں ماورا طلحہ نے شکر ہے لامیہ اور اس کے کزن کو بچالیا ورنہ میں تو ڈر گئی تھی کہ کہیں کوئی بڑا حادثہ نہ ہو جائے۔ عزت کے لیے حازم زیادہ اچھا لگتا ہے مجھے مگر ماورا نے یقیناً کچھ اچھا ہی سوچا ہو گا شروع میں مجھے بھی مزہ نہ آ رہا تھا مگر شروع میں کہانی تعارفی مرحلے میں ہوتی ہے تو کردار تو ظاہر ہے الجھے ہی ہوتے ہیں پھر آہستہ آہستہ ہی کھلتے ہیں پھر حالات بتائے جاتے ہیں اور پھر ردعمل، ماورا فکر نہ کریں ہم رائے دیتے رہیں گے۔ ارم آصف سے ملاقات کر کے خوشی ہوئی یہ دونوں بہنیں ہی سافٹ نیچر کی ہیں اور جوابات بھی ارم نے خاص کر آم توڑنا اور ماں کے ساتھ باورچی خانے میں ہاتھ بٹانا پڑھ کر مزہ آیا۔ افسانے کی طرف چلتی ہوں تو ''ڈگری'' خوشیوں کی ہی ضمانت نہیں شکر ہے ماں کو جلدی عقل آ گئی اچھا سبق دیا حنا دیہ نے، ''آفتاب'' بالکل پسند نہیں آیا اینڈ میں ہیروئن کے لیے کنواں ہی رہ گیا کوئی اصلاحی پہلو نہ تھا۔ ہوتا تو یہ کہ ہیروئن کا کردار مضبوط ہوتا اور وہ وڈیرے کو شے نہ دیتی اور ماں باپ کی عزت کا خیال رکھتی۔ ''انتخاب'' سارہ عمر کی تحریر اور ''الٹا چکر'' عائشہ بٹ کی دونوں ہی جاندار اور اصلاحی تھیں۔ بہت زیادہ پسند آئیں مکافات عمل پر شاباش دونوں کو ہی جبکہ ''اقرار کا سندیسہ'' بھی ٹھیک رہی شروع میں لڑکی کا بچے کو پڑھانے والا سین لطف اندوز تھا۔ آخر میں دونوں بہنوں کی شادی اچھی ہوگئی۔ حمیرا افضا کی ہیروئن نے بھی زیادہ شوشا مارنے والی عورتوں کو سبق دیا اور آخر میں خوشی ہوئی کہ ہیروئن کا شوہر تو اس سے محبت کرتا ہے ''دہری زندگی'' میں اسلام کی تعلیمات و انداز کو اچھا بیان کیا رائٹر نے یہ بھی اصلاحی تحریر تھی نوعمر لڑکیوں کے لیے۔ ''موج سخن'' میں شگفتہ خان، مدیحہ نورین، مریم نور اور گلشن چودھری کی نظمیں بہت زیادہ پسند آئیں کہ مجھے غزلوں کی نسبت بس نظمیں پسند ہیں جبکہ ''بزم سخن'' میں میں رخ کومل، اقدس ضیاء، ماریہ نذیر اور فاطمہ سہیل زیادہ اچھا لگا اور ''شوخیٔ تحریر'' میں فاطمہ مصطفیٰ، عاصمہ عاشق، ریما نور، عثمان عبداللہ اور نجم انجم کی مذہبی تحریریں زیادہ پسند آئیں۔ ''کچن کارنرز'' میں لہسن چٹنی اور حلیم لکھنوی منفرد تھے۔ یہ حجاب کے اور شعبے خطوط کے علاوہ والے ہر بار مجھے جگہ کیوں نہیں دیتے کیا زیادہ غیر معیاری پن ہے مواد میں ثمرہ گلزار کی آمد اچھی لگی مگر مختصر نہیں ثمرہ بٹی طویل تبصرے کے ساتھ آنا اگلی بار جبکہ رمشا اور ارم حسب معمول جاندار تبصرے کے ساتھ آئیں خطوط میں اور خط پڑھ کر اپنائیت کا احساس ہوا۔ ہاں جویی اللہ رکھا کو درست کہا کہ مختصر تبصرہ کر کے کہ رسالہ خواتین کا ہے تو مرد عورتوں سے زیادہ طویل ترین تبصرہ کریں یہ اچھا نہیں لگتا کریں تبصرہ مگر مختصر اور جامعہ انداز میں کیونکہ شمارہ خواتین کا ہے۔ اگرچہ ظہیر اور رکھا اچھا تبصرہ کرتے ہیں۔ مجھے بھی جگہ دی تو دیکھ لو جویی میں اس ماہ بھی حاضر ہوں۔

اس دعا کے ساتھ اجازت کہ اللہ رب العزت رمضان کریم میں اپنی رحمت کا سایہ ہم سب پر بنائے رکھے اور ہمیں اپنا نیک بندہ بنائے اور ہماری عبادت کو قبول فرمائے، آمین۔